نام کتاب : تفہیم المسائل (جلد چہارم)

مصنف: پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

صفحات:

تعداد:

قیمت:

☆......ناشر......☆

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

۱۴/انفال پلازہ اردو بازار، کراچی

ملنے کا پتا:

دارالعلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون:021-6314508/6324236

مکتبۂ اہلسنت جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

فون:042-7634478

☆انتساب☆

میں اپنی اس ناچیز علمی کاوش کو اپنے ایک جدِّ اعلیٰ حضرت قبلہ قاضی عبدالرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ وقدس اللہ سرہ العزیز کے نام سے منسوب کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں، جو اپنے عہد کے ایک عالمِ اجل، جامع العلوم، صاحب ورع وتقویٰ اور ولی کامل تھے۔

15، ستمبر 2007ء

العبد الضعیف

منیب الرحمن

مضمون | صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علٰی رحمۃ للعلمین، سیدنا ومولانا محمدٍوّعلٰی اٰلہ الطیبین الطاھرین وعلٰی صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلٰی اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقھاء المجتھدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

آغازِ تکلّم

تفہیم المسائل کی جلد چہارم پیشِ خدمت ہے۔ بنیادی طور پر یہ سوال و جواب روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوتے رہے ہیں، کچھ ایسے سوال وجواب ہیں، جو اخبار میں شاملِ اشاعت نہ ہوسکے، وہ بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ بعض اوقات ایک جیسے سوال مختلف سائلین کی جانب سے آتے ہیں، اس لئے نفسِ مسئلہ اور جواب میں درج مواد کا تکرار ہوجاتا ہے۔ اس مرتبہ میں نے کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اشاعت سے پہلے نظرِ ثانی کے لئے اپنے دارالعلوم کے استاذِ حدیث وصدر مدّرس علامہ احمد علی سعیدی صاحب زید مجدہم کو دیا، انہوں نے کافی محنت سے پڑھا، جہاں ضروری عربی عبارات شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، وہ شامل کرائیں اور مکرّرات کو حذف کرایا۔ حتمی مراحل میں تصحیح کے لئے فاضل مصنّف وصاحبِ طرز ادیب علامہ محمد اعظم سعیدی نے سرسری مطالعہ کیا اور جو فروگزاشت رہ گئی تھیں، ان کی نشاندہی فرمائی۔ اس کتاب میں شامل مسائل کے حل میں میرے معاون مفتی عبدالرزاق نقشبندی

زیدمجدہٗ کا علمی تعاون شامل حال رہا ہے۔ کمپوزنگ اور بار بار تصحیح میں عزیزم یاسر رحمٰن نے مسلسل محنت کی، میں ان تمام حضرات کا تہ دل سے ممنون و متشکر ہوں۔ ہم تمام درپیش مسائل میں اپنے دارالعلوم کے شیخ الحدیث، امام المفسرین والمحدثین فی العصر علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم سے مشاورت بھی کرتے رہتے ہیں اور تمام متعلقہ مقامات پر ''تبیان القرآن'' اور ''شرح صحیح مسلم'' سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ علامہ صاحب کی ''نعمۃ الباری'' شرح صحیح بخاری کی چوتھی جلد پر کام ہو رہا ہے اور ''کتاب الصّیام'' کے نصف تک مکمل ہوچکی ہے۔ پہلی جلد جو ''کتاب التیمم'' پر مکمل ہوئی ہے، ان شاء اللہ العزیز عیدالاضحیٰ کے موقع پر طبع ہو کر مارکیٹ میں آجائے گی اور اہلِ علم ''شرح صحیح مسلم'' کے انداز سے ہٹ کر ایک منفرد طرز میں اسے پائیں گے۔ اللہ عزّوجلّ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ تمام تر علمی، فکری اور جسمانی قُویٰ کی سلامتی کے ساتھ انہیں اس عظیم کام کی تکمیل کی توفیق وسعادت نصیب فرمائے، ممکنہ طور پر یہ شرح بارہ مُجلّدات میں مکمل ہوگی۔ ہم نے اپنی بشری استطاعت کی حد تک اس کتاب کی لفظی و معنوی صحت کی سعی کی ہے، لیکن ہماری سعی میں خطا اور لغزش کا امکان موجود ہے، بلکہ ہم جیسے کم علم اور خطاکار انسانوں سے ایسی خطاؤں کا وقوع بھی ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے۔ اہلِ علم سے گذارش ہے کہ ہماری کسی خطا پر آگاہ ہوں تو ضرور مُطّلع فرمائیں، ہم ان کے شکر گزار رہوں گے۔ دعا ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اس عاجزانہ سعی کو قبول فرمائے، اور اسے

سابقہ مجلدات کی طرح قبول عام عطا فرمائے، آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ افضلُ الصَّلٰوۃِ والتَّسلیمات۔

العبد الضعیف

منیب الرحمٰن



کلمۂ کفر

سوال: 1

زیداور بکر میں کسی فقہی مسئلے کی وجہ سے بحث ہوئی اور جبکہ زید طالب علم ہے، اور زید نے کہا کہ فلاں مسئلے کے بارے میں فلاں فلاں علماءِ کرام وفقہاءِ عظام نے یہ یہ فرمایا ہے کہ جبکہ تمہاری بات ان کے خلاف جاتی ہے،تو اس پر بکر سے کچھ جواب نہ بنا اور بکر نے یہ کہا کہ ''میں اپنے مرشد کے فرمان کے آگے (معاذاللہ) تمام عالموں اور مفتیوں کے فتووں کو جوتے کی نوک پر اڑاتا ہوں''۔ آیا بکر کا یہ جو جملہ ہے کہ ''میں ان کے فتووں کو جوتے کی نوک پر اڑاتا ہوں''۔بکر کا یہ قول کہنا کیسا ہے، جواب عنایت فرمائیں،(محمد راحیل قادری،ملیرسٹی،کراچی)۔

جواب :

اللہ اور رسول کے علاوہ دوسرے کسی بھی شخص کا قول وعمل مطلقاً واجب العمل اور حجت نہیں ہے، کسی شخص کا اپنے پیر ومرشد یا استاد کا یا کسی دوسرے معظم شخص کے بارے میں یہ نظریہ رکھنا کہ ان کا فرمان میرے لئے مطلقاً واجب العمل ہے،غلو یعنی مبالغہ آرائی اور گمراہی ہے،متبع سنت عالم دین پیر ومرشد سے عقیدت رکھنا اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنا فعل مستحسن ہے،لیکن اس کے نتیجے میں علماء دین اور ان کے شرعی فتووں کی حقارت کرنا یہ کفر ہے۔استفتاء میں مذکور خط کشیدہ الفاظ میں مذکور فی السوال شخص نے علم اور علماء کی بالقصد والارادہ توہین کی ہے اور فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے شرعی فتاویٰ اور بغیر کسی دنیاوی عداوت کے علماء کی تذلیل وتحقیر کفر ہے،لہٰذا مذکورہ

فی السوال شخص اپنے ان کفریہ الفاظ کی وجہ سے کافر ہوا ،اس پر توبہ کر کے تجدیدایمان اگرشادی شدہ ہے،توتجدیدنکاح فرض ہے،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

رجل عرض علیه خصمه فتوی الائمة فردها وقال چه بارنام فتوی آوردهٔ قیل یکفر وکذا لولم یقل شیئاً ولکن القی الفتویٰ علی الارض وقال این چه شرع است۔

ترجمہ:''ایک شخص پراس کے فریقِ مخالف نے ائمہ فقہاءِ کرام کافتویٰ پیش کیا،اس نے جواباً کہاکتنی بارفتویٰ کانام لوگے،ایک قول کے مطابق وہ کافرہوجائے گا،اسی طرح اگراس نے زبان سےتو کچھ نہ کہا،لیکن فتویٰ زمین پر پھینک دیااورکہاکہ یہ کہاں کی شریعت ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد2،ص:272،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

توہینِ نبی

سوال :2

کیافرماتے ہیں علمائے کرام اورمفتیانِ شرع اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص یہ کہتاہے کہ''میرے باپ کی بات کادرجہ میرے نزدیک نبی کی بات سے کم نہیں'،اس شخص کے بارے میں کیاحکم ہےاوراس کامذکورہ جملہ کیامعنی رکھتاہے؟،(محمد قاسم،بہاول نگر)۔

جواب:

جس شخص نے یہ جملہ کہاالعیاذباللہ وہ کافرہوگیااوراس پرلازم ہے کہ وہ اس بات سے رجوع کرےاوردوبارہ کلمہ پڑھےاوراگرشادی شدہ ہےتو دوبارہ نکاح کرے،کیونکہ اس کلام سے یہ ظاہرہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو نبی ﷺ کے برابر قراردیتاہےاوراس میں نبی ﷺ کااستخفاف ظاہرہےاوراس سے یہ مفہوم بھی نکلتا

ہے کہ جب وہ اپنے باپ کی بات کو نبی ﷺ کی بات کے برابر سمجھتا ہے تو وہ اپنے باپ کو معاذ اللہ نبی ﷺ کے برابر سمجھتا ہے۔

نبی ﷺ کی بات کے متعلق اللہ تعالی یہ ارشاد فرماتا ہے:

وما ینطق عن الھویٰ o ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

ترجمہ: ''اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے، نہیں ہوتا ان کا فرمانا، مگر وحی جو (ان کی طرف) کی جاتی ہے، (النجم:3,4)''۔

آیت مبارک میں اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کے قول کو اپنا قول فرمایا ہے۔اور مذکورہ شخص کا یہ جملہ کفریہ ہے، لہٰذا وہ اپنی بات سے رجوع کرے اور کلمہ پڑھے، شادی شدہ ہے تو دوبارہ نکاح کرے، علامہ امجد علی اعظمی ایک سوال کے جواب میں درمختار کے حوالے سے لکھتے ہیں: ما یکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح و اولادہ اولاد زنا وما فیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ وتجدید النکاح ۔

ترجمہ: ''جس نے کفر پر اتفاق کیا اس کا عمل اور نکاح باطل ہو گیا اور اس کو توبہ و استغفار اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے بعد جو اولاد پیدا ہو گی وہ ولد الزناء ہو گی، (فتاویٰ امجدیہ جلد چہارم ص:399 مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کے بارے میں

سوال:3

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ معاذ اللہ! رسول اللہ کے والدین کریمین جہنمی ہیں اور وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں پیش کرتے ہیں:

(1): ''حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ مُلیکہ کے دو بیٹے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ہماری ماں شوہر کا احترام کرتی تھی، اولاد پر مہربان

تھی، اور مہمان (کے ساتھ حسن سلوک کا بھی) ذکر کیا، سوائے اس کے کہ اس نے زمانہ جاہلیت میں بچی کو زندہ درگور کر دیا تھا، (تو نبی کریم ﷺ نے) فرمایا: تم دونوں کی ماں جہنم میں ہے، وہ پلٹ کر جانے لگے اور ناگواری ان کے چہرے پر واضح نظر آ رہی تھی، پھر (نبی کریم ﷺ) نے ان دونوں کو واپس بُلوایا، وہ دونوں لوٹ کر آئے اور ان دونوں کے چہروں سے اس امید پر مسرت جھلکنے لگی کہ (شاید کوئی امید افزا) صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری ماں بھی تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے'' (آگے حدیث طویل ہے) ،مسند احمد، رقم الحدیث: 3787)''۔

(2): ''حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے (وفات یافتہ) باپ کہاں ہیں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: جہنم میں، جب وہ لوٹ کر (جانے لگا) تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا: ''بیشک میرا اور تمہارا باپ (دونوں) جہنم میں ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 490)''۔ ان احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان کی بابت شرعی موقف واضح کیجیے، (علی حسن نقوی)۔

جواب:

یہ احادیث ان دونوں کتب احادیث میں موجود ہیں۔ مسند احمد کے حاشیے پر اس حدیث کی متعدد توجیہات بیان کی گئی ہیں، جو یہ ہیں: (1) سند کے لحاظ سے یہ حدیث ضعیف ہے، اور حدیث ضعیف پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کے ایک راوی عثمان بن عمیر کو، جس کی کنیت ابوالیقظان ہے، امام دارقطنی کے حوالے سے ذھبی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

امام ہیثمی نے "المجمع" میں اسے روایت کر کے تبصرہ کیا ہے کہ اسے امام احمد، امام بزار اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور ان سب کی اسناد میں عثمان بن عمیر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ایک توجیہہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ "امی مع امکما"، "یعنی میری ماں تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے" اس سے مراد یہ کہ دونوں عالم برزخ میں ہیں، یہ کلمات آپ نے "توریہ" کے طور پر فرمائے تا کہ سائل کو کم از کم وقتی طور پر ذہنی اذیت سے نجات مل جائے۔ "توریہ" سے مراد ایسا ذومعنی کلمہ استعمال کرنا جو دو معانی کا حامل ہو، ایک معنی قریب جو متبادر الی الفہم ہو (یعنی فوراً سامع کے ذہن میں آجائے) اور دوسرا دور کا معنی ہو، قائل کی اصل مراد دور کا معنی ہو لیکن مخاطب قریب کا معنی مراد لے اور ایسا دین کی کسی حکمت کے تحت کرنا جائز ہے۔ یا اس کی ایک توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کے ابوین کی اس وقت تک بذریعہ وحی خبر نہیں دی گئی تھی، اور یہ مفہوم حدیث کے آخری کلمات سے مستفاد ہوتا ہے کہ "میں نے ان کی بابت اپنے رب سے دریافت نہیں کیا" یعنی اس وقت تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رب کے درمیان اس مسئلے میں مراجعت نہیں ہوئی، بعد میں ہوگئی اور آپ کو اپنے ابوین کریمین کا جنتی ہونا بذریعہ وحی بتادیا گیا۔

چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن انس بن مالك قال فخطب رسول الله ﷺ فقال: "انا محمد بن عبدالله بن عبدالمُطَّلب بن هاشم بن عبدمناف بن قُصَي بن كلاب بن مُرّة بن كعب بن لُؤي بن غالب بن فهر بن مالك بن نضر بن كنانة بن خُزَيمة بن مُدرِكة بن الياس بن مُضَر بن نزار" ۔ وَمَا افترق النّاس فرقتين الا جَعَلني الله في خيرهما فاُخرِجتُ من بين اَبَوين، فلم يُصِبني شَئي من عَهدالجاهلِيّة۔

وَخَرَجتُ من نكاحٍ، ولم اُخرَج من سَفاحٍ، من لَّدُن آدمَ حَتّٰی اِنتَهیتُ الیٰ ابی واُمّی فانا خیرکم نَفَسا، وخیرکم اباً۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطّلب بن ہاشم بن عبدمُناف ابن قُصَی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب، بن لُؤی بن غالب بن فِہر بن مالک بن نَضر بن کنانہ بن خُزیمہ بن مُدرِکہ بن الیاس بن مُضَر بن نِزار ہوں۔ جب بھی لوگوں کے دو گروہ ہوئے، مجھے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے سب سے بہتر گروہ میں رکھا۔ پس میرا اپنے ماں باپ سے ظہور ہوا تو مجھے زمانہ جاہلیت کی بدکاریوں میں سے کسی چیز نے نہیں چھوا تھا اور میں نکاح کے ذریعہ پیدا ہوا اور میں بدکاری کے ذریعہ پیدا نہیں ہوا، حتیٰ کہ حضرت آدم سے لے کر میں اپنے ماں باپ تک پہنچا، پس میں بھی تم سے خیر اور بہتر ہوں اور میرے باپ بھی تم سب سے خیر اور افضل ہیں، (دلائل النبوت للبیہقی، جلد: 1، ص: 174,175، مطبوعہ: دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

عن علی ابن ابی طالب اَنَّ النبی ﷺ قال خَرَجتُ مِن نکاح ولم اُخرَج مِن سَفاح مِن لَّدُن آدمُ اِلیٰ اَن وَلَدَنِی اَبِی وَاُمّیِ، لَم یُصِبنِی مِن سَفاحِ الجاھِلِیَّۃ شَئِی۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں، میری ولادت ناجائز طریقے سے نہیں ہوئی، آدم علیہ السلام سے لیکر اس وقت تک جب کہ میرے والد اور والدہ نے مجھے جنا، مجھے زمانہ جاہلیت کی کسی غلط چیز نے نہیں چھوا، (دلائل النبوت لابی نعیم، جلد: 1، ص: 11، بیروت)''۔

علامہ ابن جوزی متوفی 579ھ لکھتے ہیں:

عن ابن عباس قال قلتُ :یارسول اللہ ﷺ اَیْنَ کُنتَ وآدمُ فی الجنۃ؟ قال: کُنتُ فی صُلبِہٖ واُھْبِطَ الی الارض واَنَا فی صُلبِہٖ، ورکبتُ السفینۃ وفی صلب ابی نوح وقُذِفتُ فی النّار فی صُلب ابی ابراھیم لم یَلتق لی اَبَوان قطُّ علی سَفَاحٍ لم یَزَل یَنْقُلُنی من الاَصلاب الطَّاھِرَۃِ الی الاَرحامِ النَقِیَّۃ مُھَذَّباً۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! تب آپ کہاں تھے؟، جب آدم علیہ السلام جنت میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں ان کی صُلب (پشت) میں تھا اور جس وقت انہیں زمین پر اتارا گیا اس وقت بھی میں ان کی صُلب میں تھا، اور مجھے اپنے باپ نوح کے صُلب میں کشتی میں سوار کیا گیا، اور مجھے اپنے باپ ابراہیم کی پشت میں آگ میں ڈالا گیا، اور میرے والدین کبھی بھی برائی پر نہیں ملے میں پاک اور طاہر پشتوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتا رہا ہوں، (الوفا باحوال المصطفیٰ، جلد: 1، ص: 28، مطبوعہ: دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے آبوین کریمین یعنی حضرت عبداللہ و آمنہ رضی اللہ عنہما سے لے کر حضرت آدم و حوا علیہما السلام تک آپ کے تمام آباء و اجداد اور اُمّہات وجدات کے بارے میں امت کا اجماعِ اکثری اور علماء حق کا موقف یہ ہے:

1۔ ان میں سے بعض انبیاءِ کرام و رُسُلِ عظام علیہم الصلاۃ والسلام تھے۔

2۔ دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور غیر تحریف شدہ شکل میں پایا، وہ اس عہد کے مومنین کاملین تھے۔

3۔ دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور

غیر تحریف شدہ شکل میں نہیں پایا، بلکہ ایک نبی کے وصال فرمانے کے بعد جب طویل عرصہ گزر گیا، تو ان کی تعلیمات فراموش کردی گئیں یا ان میں تحریف کردی گئی اور مسخ کردیا گیا۔اس دور کو زمانۂ فَترۃ وحی اور زمانۂ انقطاعِ وحی (Gap Period of Revealation) کہا جاتا ہے، ایسے دور میں لوگ تفصیلی شرعی احکام کے مُکلَّف نہیں ہوتے بلکہ دینِ فطرت اور توحید کے مکلّف (Accountable) ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ہستی (Existence of God) اور اَحدیّتِ باری تعالیٰ (ONENESSO of God) کے پابند ہوتے ہیں۔امت کا اجماعِ اکثری اور علماءِ حق کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وہ آباء واجداد، جو زمانۂ ''فَترۃ وحی'' میں گزرے، ان میں سے کوئی بھی مشرک، کافر اور ملحد نہیں تھا، سب کے سب دینِ فطرت اور دینِ توحید پر قائم رہے۔آپ ﷺ کے اجداد عالی نسب، حضرت کعب بن لُؤیّ، حضرت قُصَیّ، حضرت عبد المُطّلب، وغیرھم کے جو خطبات اور ارشادات تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں، وہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔

4۔رسول اللہ ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی مشرک اس لئے بھی نہیں ہوسکتا کہ آپ کا فرمان ہے:لم ازل انقل من اصلاب الطاھرین الی الارحام الطاھرات والمشرکون نَجَسٌ۔

ترجمہ:''میرا (نورِ نبوت اور جوہرِ وجود ہر دور میں میرے آباء واجداد کی) پاک پشتوں سے (میری اُمّہات وجدّات کے) پاک رحموں میں منتقل ہوتا رہا اور مشرک تو ہوتے ہی ناپاک ہیں''۔اور سورۂ توبہ آیت نمبر:28 میں اللہ تعالیٰ کا بھی یہی ارشاد ہے کہ: ''اِنّما المشرکون نَجَسٌ''، کہ مشرک تو ناپاک ہی ہوتے ہیں''۔لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جو اپنے ان تمام آباء واجداد اور اُمّہات وجدّات کو طاہرین وطاہرات قرار

دیا ہے اس سے دونوں طرح کی طہارت مراد ہے،ایک سفاحت سے پاکیزگی کہ سب کا تعلق با قاعدہ نکاح سے قائم ہوا،غیر اخلاقی اور غیر شرعی طریقے سے نہیں،اور دوسرا شرک اور عقائدِ باطلہ سے پاکیزگی۔

5۔پس جن آیات واحادیث میں آپ ﷺ کے باپ کے مشرک ہونے یا جہنم کے عذاب میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے،ان مقامات پر آپ کے حقیقی والد مراد نہیں بلکہ مجازی باپ یعنی چچا مراد ہے،جیسے واذقال ابراھیم لابیہ ازر اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِھَۃً۔ ترجمہ:''اور (اے رسول!اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ کے (جدِّ اعلیٰ) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے (مجازی) باپ آزر سے کہا کہ آپ (اپنے خود ساختہ) بتوں کو خدا مان رہے ہیں،(الانعام:75)''۔سوال میں جس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے،بر سبیل تسلیم اس کی بھی یہی تاویل کی جائے گی۔اور عربی زبان میں چچا پر باپ (اَب) کا اطلاق کیا جاتا ہے،ہمارے ہاں اردو میں بھی ''تایا ابو'' وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ اور حدیث مبارک میں بھی ہے:فَاِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ ابیہ۔ترجمہ:''بیشک ایک شخص کا چچا اس کے باپ ہی کے مرتبے میں ہوتا ہے،(ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ،باب مناقب اہل البیت)''۔

المنجد میں صِنْوٌ اور صَنْوٌ کے معنی ہیں:سگا بھائی،چچا یا ایک اصل سے پھوٹنے والی دو شاخیں۔ماضی قریب کے ایک عالم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی تصنیف قصص القرآن میں آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی باپ قرار دیتے ہوئے استدلال کیا ہے کہ جب حقیقی معنی مراد لیا جاسکتا ہو تو مجازی معنی کی طرف عدول کرنے کی کیا ضرورت ہے اور کونسا قرینہ ہے؟۔ہم کہتے ہیں کہ جب ہم نے عقلی ونقلی دلائل کی روشنی میں ایک اصول طے کر لیا ہے کہ حضور کے آباءِ کرام میں کوئی بھی کافر ومشرک نہیں گزرا تو یہی مجاز

کی طرف عدول کا قرینہ بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام والدین کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں، تو عرض کرتے ہیں: رَبَّنَا اغْفِرْلِي وَلِوَالِدَيَّ۔ ترجمہ: "اے ہمارے پروردگار! تو مجھے اور میرے والدین کو بخش دے"، (ابراہیم:41)"۔ "اَب" کا اطلاق مجازاً چچا پر ہوسکتا ہے، لیکن "والد" کا اطلاق صرف حقیقی باپ پر ہی ہوسکتا ہے، جس کے نسب سے وہ پیدا ہوا ہے، چنانچہ علامہ قاضی ثناءاللہ مظہری لکھتے ہیں: فهذه الاية تَدُلُّ عَلىٰ اَنَّ وَالِدَيْه عليه السلامُ كانا مسلمَين وانَّما كَانَ آزَرُ عَمًّا لهٗ و كان اسمُ اَبِ ابراهيم تَارِخ ولاَجلِ دَفْعِ تَوَهُّم آزرَ قال والِدَيَّ يعني مَنْ وَلَدانى حقيقةً ولم يَقُل اَبَوِيَّ لِاَنَّ الاَبَ يُطْلَق على العَمِّ مَجازا۔

ترجمہ: "یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کے والدین مسلمان تھے اور آزر آپ کا چچا تھا اور آپ کے والد کا نام تارِخ تھا۔ اور اس وہم کو دور کرنے کے لئے کہ باپ سے مراد چچا ہے آپ نے دعا میں "وَالِدَيَّ" کا لفظ استعمال کیا، یعنی جنہوں نے مجھے حقیقت میں جنا ہے اور "اَبَوَی" کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ اب کا لفظ بطور مجاز چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا رہتا ہے، (تفسیر مظہری)"۔ واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام چچا مومن نہیں تھے، ایک چچا عبدالعزیٰ ابولھب تو رئیس المشرکین تھا، بلکہ یہ واحد مشرک تھا جس کی مذمت میں قرآن مجید کی ایک مکمل سورت "اَللَّھَب" نازل ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے "اَبَوَین کریمین" کو اللہ تعالیٰ کے دیئے اختیار سے زندہ کیا، ان پر ایمان (توحید و رسالت) کی دعوت پیش کی، انہوں نے اسلام قبول فرمالیا اور پھر ان کا ایمان پر وصال ہوا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: لیکن متاخرین میں علماء نے حضور ﷺ کے والدین کریمین، بلکہ

حضرت آدم علیہ السلام تک آپ کے تمام آباء واُمّہات کا ایمان ثابت کیا ہے، اس اثبات کے لئے انہوں نے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ایک یہ کہ یہ سب حضرات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے۔ دوسرا یہ کہ ان حضرات کو دعوتِ اسلام نہ پہنچی، بلکہ یہ حضرات زمانہ فترۃ میں ہی انتقال کر چکے تھے، ان کو حضورﷺ کی نبوت کا زمانہ نہ ملا۔تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے والدین کریمین کو خدا تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا سے آپ کے دستِ اقدس پر دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ آپ پر ایمان لائے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کے زندہ کرنے کی حدیث اگرچہ اپنی حد ذات میں ضعیف ہے، لیکن متعدد طریق سے اس کی تصحیح اور تحسین کر دی گئی ہے اور یہ بات گویا متقدمین سے پوشیدہ رہی۔اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت متاخرین علماء پر کھول دی۔ "واللہ یختص برحمتہ من یشاء"اس بارے میں رسائل تصنیف کئے اور دلائل سے اس مسئلے کا اثبات فرمایا، مخالفین کے شبہات کے جوابات دیے۔ان دلائل اور جوابات کو اگر یہاں نقل کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ان کے رسائل میں دیکھ لیا جائے، واللہ اعلم، (اشعۃ اللمعات، جلد:1،ص:718، مطبوعہ مطبع: تیج کمار، لکھنؤ)"۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے "تبیان القرآن" جلد سوم میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے، اہلِ ذوق اس کا مطالعہ فرمائیں۔

اہانتِ معاویہ

سوال:4

میں اسلامیات کی کتاب کا ایک صفحہ منسلک کر رہا ہوں جو saint josiphاسکول کےO-Level میں پڑھائی جا رہی ہے۔اس میں حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں کئی گستاخیاں کی گئی ہیں۔آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں فتویٰ جاری کریں تا کہ مصنف،اسکول اور پبلشر کے خلاف مقدمہ قائم کیا جا سکے۔

نوٹ:انگلش عبارت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

21 رمضان کو حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؓ کو چالیس ہزار افراد کی رضامندی سے خلیفہ بنایا گیا۔لیکن حضرت امیر معاویہؓ حضرت امام حسنؓ کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے انہوں نے جاسوس کوفہ بھیجے تا کہ وہاں کے حالات کا پتہ چل سکے۔حضرت امام حسنؓ کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کو خط لکھا اور اپنی خلافت کا حق بتایا۔مگر حضرت امیر معاویہؓ نے مزید جاسوس بھیجے اور اس شخص کیلئے جو حضرت امام حسنؓ کو قتل کرے دو ہزار درہم اور اپنی بیٹی نکاح میں دینے کا انعام مقرر کیا۔

آخر میں ایک صلح نامہ ہوا جس کے بعد حضرت امام حسنؓ مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ خون خرابے سے بچنے کیلئے وہ خلافت چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ کو اس بات سے تسلی نہ ہوئی اور وہ امام حسنؓ کو مارنا چاہتے تھے انہوں نے امام حسنؓ کی زوجہ سے کہا کہ اگر وہ حضرت امام حسنؓ کو زہر دے تو وہ اسکو دو ہزار درہم،دس جوڑے کپڑے سونے کی کشیدہ کاری کیے ہوئے اور کوفہ کی زیتون کے تیل کی تمام پیداوار انعام میں دیں گے اور اس کا نکاح اپنے بیٹے سے کریں گے۔(محمد سلیم خمیسہ، شہید ملت روڈ،کراچی)۔

جواب:

استفتاء میں جس نصابی عبارت کی نشاندہی کی گئی ہے،یہ حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ عنہ کی اہانت پر مشتمل ہے اور ان کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، کاتب وحی ہیں ایسی عبارات کو نصابی کتب میں شامل کرنا قوم کی بچوں کے عقائد کو مسخ کرنے اور انہیں گمراہ کرنے کی سازش ہے، اس کے ذمہ داروں کو قومی اور دینی مجرم قرار دے کر ان کے خلاف مقدمات قائم کرنا چاہئیں۔

وفاقی وصوبائی وزارت تعلیم کیلئے ضروری ہے کہ ایسی نصابی کتاب کو فوراً منسوخ کرے، بازار میں موجود اسکے تمام نسخے ضبط کئے جائیں اور مصنف، تابع اور ناشر کے خلاف کاروائی کی جائے۔ صحابہ کرام ہماری تمام وراثت دینی کے امین ہیں، قرآن وسنت کی حقانیت وحجیت کا مدار صحابہ کرام کی صداقت، عدالت اور امانت کو تسلیم کیئے جانے پر ہے، ورنہ ہمارے پاس تمام دینی سرمایہ جس میں کتاب وسنت، عقائد وایمانیات، ارکان اسلام اور جملہ ضروریات وتفصیلات دین شامل ہیں، غیر مستند، غیر معتبر اور ناقابل اعتبار قرار پائے گا۔ صحابہؓ کرام کو سبّ وشتم کرنا، ان کا استخفاف وتوہین کرنا حرام ہے، جمہور فقہائے امت کے نزدیک موجب کفر ہے اور ایسے شخص کی ضلالت، فسق وفجور اور مبتدع ہونے پر سب کا اتفاق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نومسلم کے ایمان کی غیر یقینی کیفیت

سوال:5

(۱): اگر غیر مسلم کلمہ پڑھ کر پھر بھی غیر مسلم کے طور طریقوں کو نہ چھوڑے، اور دین کو نہ سیکھے۔ فرائض وواجبات کی ادائیگی کا پاس نہ رکھے۔ غرض اپنا چال چلن اور طور طریقے نہ بدلے تو شرع میں کیا حکم ہے؟

سوال:6

کوئی غیر مسلم یوں کہتا ہے کہ میں کلمہ تو پڑھ لوں یا جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں (یعنی کلمہ پڑھا دیں یا نہ پڑھائیں)، یعنی غیر مسلم تذبذب کے ملے جلے جذبات رکھتا ہے؟ دلائل وبراہین قرآن وسنت کی روشنی میں اس عقدہ کو حل فرمادیں، (حافظ غلام فرید، کراچی)۔

جواب:

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی سچائی سے ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے، اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نومسلم کو احکامِ شرع کی تعلیم دیں فرائض وواجبات کی ادائیگی کی تعلیم وتلقین کریں پھر بھی اگر وہ اپنی غیر مسلمانہ روش ترک نہ کرے تو محض اس کا دعوئ مسلمانی قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اعمال صالحہ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کا تارک اور محرمات کا مرتکب فاسق اور گنہگار ہے مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جائیگا۔ اسی طرح جھوٹ بولنے والا شخص اور شراب پینے والا اور دوسری برائیوں کا مرتکب شخص گنہگار کہلائے گا۔ بدعمل مسلمان کو یا اپنی بدعملی کی وجہ سے خود کو کافر کہنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اصلاح کی طرف راغب کرنا چاہیے، اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہٰذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے، وہ کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

من كفر باللّٰه من ؕ بعد ایمانه الّا من اُكرِهَ وقلبه مطمئنٌ ؕ بالایمان ولكن مّن شرح بالكفر صدرا فعلیهم غضب مّن اللّٰه ج ولهم عذاب عظیم O

ترجمہ: ''جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا، اس کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے، (النحل: 106)''۔

لا تعتذروا قد كفرتم بعد ایمانكم۔

ترجمہ: ''اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو، (التوبہ: 66)''۔ وفی المحیط من قال فانا كافرا وفا كفر قال ابوا لقاسم هو كافر من ساعته۔

ترجمہ: ''اور محیط میں ہے کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں کفر کروں گا، ابوالقاسم نے کہا: وہ اسی وقت کافر ہو گیا، (شرح فقہ اکبر ص ۱۸۳)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن یرضیٰ بكفر نفسه فقد كفر

ترجمہ: ''اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، (فتاوی عالمگیری، جلد: دوم، ص: ۲۵۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (ویكفر فیهما) لرضاه بالكفر۔

ترجمہ: ''کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 393 دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرارِ کفر، بھی کفر ہے، تمام تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ دل کی سچائی سے تمام ضروریاتِ

دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔ اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے اور بے یقینی کی سی کیفیت کے ساتھ یا کسی کی خوشی کی خاطر کلمہ پڑھ لینا ایمان نہیں، واللہ اعلم۔

غیر مسلموں سے معاملات اور ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے طریقے سے عبادت کرنا

سوال: 7

ایک مسلمان شخص اپنے کسی عیسائی دوست کی ترغیب پر ان کے معبد (گرجا) میں جاتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر انہی جیسی عبادت کرتا ہے اور اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم تھا محض ان کی دلجوئی کے لئے اُس نے ایسا کیا۔ آپ براہِ کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے اس طرح کرنا جائز ہے؟ اور اس کا یہ عمل اس کے ایمان پر اثر انداز ہوگا کہ نہیں؟، (حافظ غلام مرتضٰی سیالوی، ضلع اٹک)۔

جواب:

یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، اس لئے ہم صورتِ مسئلہ سے ہٹ کر اسلام کا اصولی نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دینی امور میں غیر مسلموں، مبتدعین اور بے دین لوگوں سے تعلق کی دو صورتیں ہیں، ایک مداہنت ہے اور دوسری مدارات۔ مداہنت شرعاً ممنوع اور حرام ہے اور مدارات جائز بلکہ اس سے اگر دینی فائدہ ہو سکتا ہے تو شرعاً مطلوب ہے۔ پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے

ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

(1)وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ O ترجمہ: ''انہوں نے یہ چاہا کہ اگر آپ (دین کے معاملے میں) ان سے (بے جا) نرمی کریں تو وہ بھی نرم ہو جائیں گے، (القلم:9)''۔

(2)وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔

ترجمہ: ''اور تم ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو، جنہوں نے ظلم کیا ہے، ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں ہوں گے، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی، (ھود:113)''

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّىْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ اس حق کا کفر کرتے ہیں، جو ان کے پاس آچکا ہے، (الممتحنہ:1)''۔

مداہنت کی تعریف:

مداہنت یہ ہے کہ کوئی مومن خلافِ شرع کوئی برائی دیکھے اور قدرت کے باوجود اس سے منع نہ کرے، روک ٹوک نہ کرے، اس رویے کے محرکات کئی ہو سکتے ہیں، مثلاً (الف) دینی بے غیرتی اور بے ہمتی (ب) اس بات سے شرمائے کہ دوسرے اسے دقیانوسی اور قدامت پسند کہیں گے (ج) دنیوی مفاد اور طمع کے سبب کسی بااثر یا بااختیار شخص کی خلافِ شرع حمایت کی بنا پر ایسا کرے۔

مدارات کی تعریف:

مدارات یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے، بے جا سختی نہ برتے، کسی دینی حکمت یا مصلحت کے تحت نرمی سے پیش آئے۔اور کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ظالم وجابر کے ناروا ظلم سے بچنے کے لئے اس سے الجھنے کے بجائے پہلو تہی اختیار کرے۔ظاہر ہے یہ رخصت ان لوگوں کے لئے ہے جو اہلِ عزیمت واستقامت نہیں ہوتے، طبعاً کم ہمت ہوتے ہیں، اگر چہ دل سے برائی اور برے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرقات ج:9،ص: 331پر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اَشِعَّۃِ اللّمعات ج:4،ص:174پر اپنے اپنے انداز میں یہ تعریفات بیان کی ہیں،ہم نے ان سے استفادہ کر کے آسان الفاظ میں بیان کردیا ہے۔

ایک چیز کافروں سے موالات یعنی دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کرنا ہے،اس کی بھی قرآن مین ممانعت آئی ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَاءَ مِن دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

ترجمہ:''مومن (اپنے) مومن (اہلِ دین) کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں،(آل عمران: 28)''۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُوْنِكُمْ ۔

ترجمہ:''اے ایمان والو! تم ایمان والوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ،(آل عمران:118)''۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ؔ بعضهم اولياء بعض ط ومن يتولهم منكم فانه منهم۔

ترجمہ ''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ (مسلمانوں کے خلاف) ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اور تم میں سے جو کوئی (مسلمانوں کو چھوڑ کر) انہیں دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہوگا، (المائدہ: 51)''۔

وَلَا تَرْكَنُوٓاْ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ۔

ترجمہ: ''اور ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ جلائے گی، (ھود: 113)''۔

غیر مسلموں کے ساتھ روزمرّہ کے معاملات

ایک صورت کفار کے ساتھ روزمرّہ معاملات کی ہے، جس میں ان کے ساتھ لین دین، تجارتی معاہدات، معاملات کرنا، اگر ایک دفتر یا ادارے میں کام کر رہے ہیں یا محلے میں رہ رہے ہیں، تو کسی، چاپلوسی اور خوشامد کے بغیر محض انسانی بنیادوں پر حسن اخلاق سے پیش آنا، وہ کسی مصیبت یا مشکل میں گرفتار ہوں تو ان کی مدد کرنا، بشرطیکہ وہ کوئی حرام یا شرعاً ممنوع کام نہیں ہے۔ اتفاقاً کوئی صورت پیش آ گئی تو ایک ٹیبل یا ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھالینا، بشرطیکہ اس دسترخوان پر کوئی حرام چیز نہ ہو، بعض اوقات بین المذاہب مکالمہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے مجلس کا انعقاد ناگزیر ہے۔ یہ رویّہ اسلام کے مفاد میں نہیں ہے کہ غیر مسلم یہ سمجھیں کہ مسلمان ان سے بلاوجہ نفرت کرتے ہیں یا یہ لوگ مردم آزار اور انسانیت دشمن ہیں۔ اسی طرح اگر غیر مسلموں سے شرعی حدود کے اندر معاہدات، معاملات یا کاروبار کیا ہے تو مسلمان کو امانت و دیانت کے اعلیٰ معیار پر فائز ہونا چاہئے، ان کی کسی بھی خیانت، کِذب، بدعہدی، ملاوٹ اور بد معاملگی کی وجہ سے لوگ اسلام پر طعن کریں گے۔ علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''اور مُعامَلتِ مجرّ دہ سوائے مرتدّین کے ہر کافر سے جائز ہے جبکہ اس میں کوئی اعانت کفر یا معصیت نہ ہو نہ ہی اِضرارِ اسلام وشریعت (یعنی جس میں شریعت یا اسلام کا نقصان ہو)، ورنہ ایسی معاملت مسلم سے بھی حرام ہے چہ جائیکہ کافر سے، قال تعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ ترجمہ: ''گناہ وظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''، (تبیان القرآن، جلد:11، ص:844)''۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''موالات ومجرد معاملت میں زمین وآسمان کا فرق ہے، دنیوی معاملت جس سے دین پر ضرر نہ ہو سوا مرتدین کے کسی سے ممنوع نہیں، ذمّی (اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری) تو معاملت میں مثل مسلم ہے: لھم مالنا وعلیھم ماعلینا۔ ان کے لئے وہی (حقوق) ہیں جو ہمارے لئے ہیں اور جو (فرائض) ان پر ہیں وہی ہم پر ہیں، (یعنی دنیاوی منافع میں ہماری طرح ان کو بھی حصہ دیا جائے گا اور دنیوی مواخذہ ان پر بھی وہی ہوگا جو ایک مسلمان پر کیا جائے گا)۔ اور غیر ذمی سے بھی خرید وفروخت، اجارہ واستیجار، ہبہ واستیہاب (یعنی ہبہ کا لین دین) بشروطہا (اپنی شرعی شرائط کے مطابق) جائز اور خریدنا مطلقاً ہر مال کا، کہ مسلمان کے حق میں متقوِّم ہو اور بیچنا ہر جائز چیز کا جس میں اعانتِ حرب (یعنی مسلمانوں کے خلاف جنگی مدد کرنا) اور اہانتِ اسلام نہ ہو، اسے نوکر رکھنا جس میں کوئی کام خلافِ شرع نہ ہو، اس کی جائز نوکری کرنا جس میں مسلم پر اس کا استعلا (یعنی اسے دینی امور میں بالا دستی دے دی جائے) نہ ہو، ایسے ہی امور میں اجرت پر اس سے کام لینا یا اس کا کام کرنا بمصلحت شرعی اسے ہدیہ دینا جس میں کسی رسم کفر کا اعزاز نہ ہو، اس کا ہدیہ قبول کرنا جس سے دین پر اعتراض نہ ہو، حتیٰ کہ کتابیہ سے نکاح کرنا بھی فی نفسہٖ حلال ہے، وہ

صلح کی طرف جھکیں تو مصالحت کرنا مگر وہ صلح (منع ہے) جو حلال کو حرام کرے یا حرام کو حلال، یونہی ایک حد تک معاہدہ اور موادعت کرنا بھی اور جو جائز عہد کرلیا اس کی وفا فرض ہے اور غدر (دھوکہ دینا) حرام الی غیر ذالك من الاحکام، (فتاویٰ رضویہ، ج:14، ص:420، 421 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

مسلمانوں کا غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں جا کر ان کے طریقے پر عبادت کرنا حرام ہے اور اگر وہ طریقہ اپنی وضع کے اعتبار سے کفر ہے جیسے بتوں کے سامنے سجدہ کرنا یا آگ کی پرستش کرنا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسمے کے آگے سجدہ کرنا تو یہ کفر ہے ۔اور اس میں یہ عذر مقبول نہیں ہوگا کہ دل میں ایمان ہے اور محض غیر مسلم کی دل داری کے لئے ایسا کیا ہے، شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر حال پر ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے ہندوؤں کے ساتھ مندر میں عبادت کئے جانے کی بابت سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا:

الاشباہ والنظائر میں ہے: عبادۃ الصنم کفر ولا اعتبار بما فی قلبه و کذا لو تزنر بزنار الیھود والنصاریٰ دخل کنیستھم اولم یدخل۔

ترجمہ: "بت کی پوجا کرنا کفر ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اسی طرح اگر کسی نے یہودیوں اور عیسائیوں کا زنار گلے میں باندھا (اس نے بھی کفر کیا)، خواہ وہ ان کے گرجوں (چرچ) میں داخل ہو یا نہ ہو، (۲) سائل یہ پوچھتا ہے کہ وہ حرکاتِ ملعونہ جائز ہیں یا نہیں، یہ پوچھے کہ کفر ہے یا نہیں، ان کی عورتیں نکاح سے نکلیں یا نہیں ان حرکات سے، جامع الفصولین منح الروض الازہر میں ہے: من خرج الی السدۃ (قال القاری ای مجمع اھل الکفر) کفر لان فیه اعلان

الکفر و کانہ اعان علیہ۔

ترجمہ: ”جوکوئی (دارالاسلام کوچھوڑکر) کفارومشرکین کے مجمع میں جائے (السیدۃ ،محدث وفقیہ ملاعلی قاری نے فرمایا: اس کا معنی مجمع اہل کفر ہے)تو وہ کافر ہوگیا، کیونکہ اس میں کفر کااعلان ہے، گویاوہ کفرپران کی امدادکررہاہے،وہ مزید لکھتے ہیں: کفرکے اہتمام میں شریک ہونااوراس پرراضی ہونا کفرہے، الرضا بالکفر کفر (کفرپرراضی ہونا کفرہے)وہ لوگ اسلام سے نکل گئے اورانکی عورتیں ان کے نکاح سے ، (فتاویٰ رضویہ،جلد 21،ص: 296،رضافاؤنڈیشن،لاہور)“۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:فی ”التاتر خانیۃ“:یکرہ للمسلم الدخول فی الْبِیْعَۃِ وَالْکَنِیْسَۃِ وَاِنَّمَا یکرہ من حیث انہ مَجْمَعُ الشیاطین لا من حیث انہ لیس لہ حق الدخول قال فی ”البحر“والظاھر انھا تحریمیۃ لانھا المرادۃ عنداطلاقھم،وقد افتیت بتعزیر مسلم لازم الکنیسۃمع الیھود۔ فاذا حرمت دخول فالصلوٰۃ اولیٰ ۔

ترجمہ”تاتارخانیہ میں ہے:یہودیوں کی عبادت گاہ اورعیسائیوں کے گرجے (چرچ) میں کسی مسلمان کاداخل ہونامکروہ ہےاس لئے کہ وہ شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہے اس لئے نہیں کہ وہاں داخل ہونے کاحق نہیں ہے”بحرالرائق“میں فرمایاظاہریہ ہے کہ کراہت سے مرادکراہتِ تحریمی ہے کیونکہ جب مطلقاً مکروہ بولا جائے ،تو اس سے ”کراہتِ تحریمی“مرادہوتی ہے،(فقہاءکرام نے)ایسے مسلمان کوسزادینے کافتویٰ دیا ہے جویہودیوں کے ساتھ ان کے معبد(گرجا) میں مستقل آتا جاتا رہتاہو،پس جب وہاں داخل ہوناحرام قرارپایا،تو نمازپڑھنابدرجۂ اولیٰ حرام ہے،(ردالمحتارعلی الدرالمختارجلد 2،ص: 40،داراحیاءالتراث العربی،بیروت)“۔البتہ یہودونصاریٰ

کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مکالمے کے لئے مسلمانوں کے رہنما ان کی عبادت گاہوں میں جائیں، مشترکہ عبادت مقصود نہ ہو بلکہ ان کے طریقِ عبادت کا مشاہدہ مقصود ہو، تو یہ مباح ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بعض اوقات مسلمانوں رہنماؤں کو غیر مسلم مذہبی رہنماؤں کے ساتھ امن اور عدل کے مشترکہ مقاصد کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے، اس کی رخصت ہے۔ اسی طرح اگر اہلِ مذاہبِ ساوی دنیا میں ریاستی و گروہی ظلم اور جبر و تشدد کے خلاف بلا امتیاز مذہب انسانیت کے مفاد میں مشترکہ آواز بلند کریں، تو اس کی رخصت ہے۔

آثارِ قیامت میں "تقارُبِ زمانی" کا مفہوم

سوال:8

رسول اللہ ﷺ نے جو مختلف آثارِ قیامت بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "زمانے میں قربت ہو جائے گی" اس سے کیا مراد ہے؟، (محمد انس محبوب، ایبٹ آباد)

جواب:

یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علاماتِ قیامت متعدد بیان فرمائی ہیں، جنہیں اصطلاح محدثین میں "**اشراط الساعة**" کے عنوان کے تحت کتب احادیث میں جمع فرمایا ہے، انہی روایات میں ہے: عن انس بن مالك قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تقوم الساعة حتیّ یتقارب الزمان فتکون السنة کالشھر والشھر کالجمعه وتکون الجمعة کالیوم ویکون الیوم کالساعة وتکون الساعة کالضرمة۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیا

مت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمانہ باہم قریب ہو جائے گا، پھر سال مہینے کی طرح ہو جائے گا اور مہینہ ہفتے کی طرح، اور ہفتہ دن کی مانند اور دن ایک گھڑی کی مانند اور ایک گھڑی چنگاری کی مانند ہو جائے گی۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2332 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)"۔

"تقاربِ زمانی" کے حقیقی اور قطعی معنی کیا ہیں؟، یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ ہی کو معلوم ہے، لیکن ہماری فہمِ ناقص میں جو معنی ومفہوم بظاہر مراد ہو سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(1) یہ کہ زمانے سے برکت اٹھ جائے گی، اور مقاصدِ خیر کے لئے اس کی افادیت کم ہو جائے گی۔

(2) لوگ اپنے مشاغلِ دنیا اور لہو ولعب میں اس قدر مشغول ہو جائیں گے کہ اعمالِ خیر اور فکرِ آخرت کے لئے ان کے پاس فرصت ہی نہیں ہوگی، ترغیباتِ دنیا میں مشغولیت، فراوانی تعیّشات، فواحش ومنکرات کا عام ہونا اور خواہشاتِ نفس کے پیروکاروں کے لئے ان کا حصول آسان ہونا اور ان میں ہمہ وقتی انہماک، کثرتِ مال کی خواہش اور حصول، ان لذات میں انسان اتنا کھو جائے گا کہ اسے سال مہینوں میں، مہینے ہفتوں اور ہفتے دنوں میں اور دن لمحوں میں اور لمحے آگ کے شراروں تک گزرتے ہوئے محسوس ہوں گے، لیکن لذّتِ کام ودھن، ہوائے نفس اور جنسی شہوات کی پیاس بجھ نہیں پائے گی۔

(3) جس طرح رنج والم، درد وکرب اور آفت وبلا کے زمانے میں ایک ایک پَل کا گزرنا دشوار ہو جاتا ہے، لگتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے، ایک ایک گھڑی قیامت بن کر گزر رہی ہے، حالانکہ کمیت کے اعتبار سے شب وروز اور مہ وسال کے پیمانے وہی

ہوتے ہیں، گردشِ لیل ونہار کا دورانیہ وہی رہتا ہے، لیکن مصیبت کا ایک ایک پل بھاری ہوجاتا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے وقت یا مکان کی مقدار اور ظرفیت تو وہی رہتی ہے، لیکن برکت سے کیفیتِ اجرا اور مقدارِ اجر میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے۔

ذیل میں احادیث ملاحظہ کیجئے:

(1)عن ابی هريرة رضی الله عنه قال :قال رسول اللهﷺ فی الجماعة تضعف علىٰ صلوته فی بيته وفی سوقه خمسا وعشرين ضعفا۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: کسی شخص کے گھر پر یا بازار میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا زیادہ ہے، (صحیح بخاری ومسلم)''۔

(2)عن عبد اللہ بن عمر قال : قال رسول اللهﷺ : صلوٰة الجماعة تفضل صلوة الفذ بسبع وعشرين درجة ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: باجماعت نماز کا ثواب انفرادی نماز سے ستائیس درجے زیادہ ہے، (صحیح بخاری ومسلم)''۔

(3)عن انس بن مالك قال : قال رسول اللهﷺ : صلوة الرجل فی بيته بصلوة وصلوته فی مسجد القبائل بخمس وعشرين صلوٰة وصلوته فی مسجد الذی يجمع فيه بخمس مائة صلوٰة وصلوته فی المسجد الاقصىٰ بخمسين الف صلوة وصلوٰته فی مسجدی بخمسين الف صلوة وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوٰة ۔

ترجمہ: ''انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: کسی

شخص کے گھر پر (فرض) نماز پڑھنے کا ثواب ایک نماز کے برابر ہے، اور اس کا اپنے (محلے یا) قبیلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب 25 نمازوں کے برابر ہے، اور اس جامع مسجد میں پڑھنے کا ثواب 500 نمازوں کے برابر ہے، اور اس کا مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور اس کا مسجد الحر ام میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، (ابن ماجہ)"۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عبادت ایک ہی ہے لیکن مقامات کے اعتبار سے اجر وثو اب کے پیمانے بڑے ہو جاتے ہیں، اسے ہم برکت سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے: شب قدر کی فضیلت ایک ہزار مہینوں کے برابر ہے (سورۃ القدر:3)۔

تقارب زمانی کا ایک معنی یہ ہوسکتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی درمیانی انگلی اور شہا دت کی انگلی کو کشادہ کر کے فرمایا: بعثت انا و الساعۃ کھاتین و جمع بین اصبعیہ۔ ترجمہ: "میرے اور قیامت کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے، جیسے میری ان دو انگلیوں کے درمیان"، (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث 4040 دار الفکر، بیروت)"۔

قرآن نے بھی فرمایا: اقتربت الساعۃ و انشق القمر۔ ترجمہ: "قیامت قریب آ گئی اور چاند شق ہو کر (دو ٹکڑے) ہو گیا، (سورۃ القمر:1)"۔ دراصل انگشت ہائے مبارک کا درمیانی فاصلہ اگرچہ کم ہے، لیکن آپ نے پورے کرۂ زمین کا نقشہ بنا ہوا دیکھا ہوگا جو چند فٹ کے کاغذ پر سما جاتا ہے، مگر اس میں نیچے اسکیل لکھا ہوتا ہے، کہ اس نقشے میں ایک انچ کی لکیر کئی ہزار میٹر کو تعبیر کر رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہی کیفیت حضور ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیانی فاصلے کی ہو۔ (4) چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم غیب سے معلوم تھا کہ ابتدائے تخلیق کائنات سے آپ کے عہد مبارک تک کتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے کروڑ سال گزر چکے ہیں، ماہرین

ارضیات اپنے علم طبیعات وارضیات کے مطابق بعض چیزوں کی عمر کروڑوں سال بتاتے رہتے ہیں، تو علم نبوت میں ان کروڑوں سال کے مقابلے میں قیامِ قیامت تک اتنی ہی مدت باقی ہو جسے آپ نے تقابل کرتے ہوئے دو انگلیوں کے درمیانی فاصلے سے تعبیر کیا، اور جوں جوں قیامت قریب ہوتی چلی جائے گی، کائنات کی عمر اپنی کل مدت تخلیق کے اعتبار سے اسی طرح سمٹی ہوئی نظر آئے گی۔

زمانے کو برا کہنے کی ممانعت

سوال :9

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ غلطی کرتے ہیں، گناہ کرتے ہیں، انہیں اس پر ٹوکا جائے تو یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ کیا کریں زمانہ ہی برا ہے، پہلے کہتے تھے "چودہویں صدی ہے" اب کہتے ہیں: "پندرہویں صدی ہے" یہ سب کچھ تو ہونا ہے، کیا یہ رویہ یا طرز عمل درست ہے؟، شریعت مطہرہ اور کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیجیے، (نعیم الرحمٰن، کوہاٹ)۔

جواب :

یہ سوچ، یہ انداز فکر بالکل غلط اور باطل ہے، یہ وہی فریب نفس ہے اور اغواء نفس ہے جس سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں تعلیم امت کے لئے ارشاد فرمایا کرتے تھے: "نعوذ باللہ من شرور انفسنا " یعنی اے اللہ! ہم اپنے نفس کی شرارتوں اور فکری کجروی سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔ "زمانہ" کیا ہے، گردش لیل ونہار کا نام ہے، مرور ایام کا نام ہے، دنوں، ہفتوں اور ماہ وسال کے گزرنے کا نام ہے، سورج وہی ہے، چاند وہی ہے، زمین وہی ہے، نظام قدرت بھی وہی ہے، لہذا زمانے کا کیا قصور؟ قصور ہر شخص کا اپنا ہے، کوتاہی عمل ہر ایک کی اپنی ہے

،اور ہرایک اپنے عمل کے لئے اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں جوابدہ ہے،اللہ تعالٰی کاارشاد ہے: کل نفس ؐ بما کسبت رھین ۔
ترجمہ:''ہر شخص اپنے اعمال کے عوض رہن ہے''،(الطّور: 21)۔
اورارشادباری تعالٰی ہے:"کل نفس بما کسبت رھینا "،ترجمہ''ہرشخص اپنے عمل کے بدلے رہن ہے''،(المدثر:38)۔
اوراللہ تعالٰی کاارشاد ہے:''ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئك کان عنه مسئولا "، ترجمہ:''بلاشبہ(قیامت کے دن اللہ تعالٰی کی عطا کی ہوئی) سماعت بصارت اورفہم وادراک (کی ساری صلاحیتوں) کے بارے میں بازپرس ہوگی''،(بنی اسرائیل: 36)۔لہٰذا کسی شخص کا اپنی کوتاہی فکروعمل کے لئے زمانے کوبرا کہنا یا اسے جواز بنانا ہرگز درست نہیں ہے،حدیث پاک میں ہے:عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالٰی عنه قال: قال النبی ﷺ: "قال اللہ :یؤذینی ابن آدم،یسبّ الدھر وانا الدھر،بیدی الامر،اقلب اللیل والنھار۔
ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے: بنی آدم مجھے اذیت دیتا ہے،(وہ اس طرح کہ)وہ دہر (زمانے)کوگالی دیتا ہے،حالانکہ''دہر''تو میں ہوں،زمانے پر قبضہ واختیار میرا ہی ہے،گردش ولیل ونہار میں کرتا ہوں،(صحیح بخاری ومسلم رقم الحدیث 6181-7491)''۔اس حدیث کی شرح میں علامہ یحیی بن شرف الدین نووی لکھتے ہیں:اس حدیث میں اللہ تعالٰی کا یہ ارشاد: انا الدّھر (یعنی میں زمانہ ہوں)اور یہ اطلاق مجازی ہے،اس کا معنی یہ ہے کہ میں زمانے اورزمانے کے اندر پیدا ہونے والے حوادث وواقعات کا خالق ہوں،اس کا سبب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں

لوگوں کی عادت تھی کہ جب کوئی اندوہناک حادثہ ہوتا تو زمانے کو برا کہتے تھے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانے کو برا مت کہو، کیونکہ جن مصائب وحوادث کی بنا پر تم زمانے کو برا کہہ رہے ہو، وہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ کے پیدا کیۓ ہوۓ ہیں، کیونکہ وہی ہر چیز کا خالق ہے، (شرح صحیح مسلم للنووی ج 2 ص 237 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی)۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ امام حافظ بن احمد بن علی بن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ایک روایت میں یہ بھی ہے: ولا تقولوا خیبة الدھر، یعنی یوں نہ کہو کہ ہاۓ زمانے کی محرومی، ناکامی، آگے چل کر وہ فرماتے ہیں: زمانے کو برا کہنے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا رد ہے جو زمانے کو حوادث وآفات کا فاعل حقیقی یا موثر حقیقی مانتے ہیں، یہ نظریہ باطل ہے، کیونکہ فاعل حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، جب مصائب نازل کرنے والے کو برا کہو گے، تو یہ "برا کہنا" اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا، لہٰذا اس حدیث کے ظاہری کلمات کی تین تاویلیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی زمانے میں ہونے والے جملہ امور کی تدبیر فرمانے والا ہے، دوسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی زمانے کا مالک ومختار ہے، تیسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی گردش لیل ونہار فرمانے والا ہے، اسی لیۓ ان کلمات کے بعد فرمایا: "بیدی اللیل والنھار "، شب وروز کا نظام میرے دست قدرت میں ہے، (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، ج 10 ص 564-565)"۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یقلب اللّٰہ اللیل والنھار ان فی ذالك لعبرة لاولی الابصار۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ گردش لیل ونہار کا (نظام) فرماتا ہے، بلاشبہ اس میں اہل عقل وخرد کے لیۓ (بڑی) نصیحت ہے، (النور: 44)"۔

﴾کتاب الطہارۃ﴿

غسل کے بعد وضو

سوال: 10

پاک ہونے کے لئے غسل کا طریقہ کیا ہے؟ کیا غسل کرنے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟، (عبدالجبار پردیسی، لانڈھی)۔

جواب:

آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غسلِ واجب کا طریقہ دریافت کررہے ہیں، ناپاکی یا جنابت کی حالت میں غسل کا طریقہ یہ ہے: پہلے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوئیں، بدن پر جہاں کہیں نجاست لگی ہو، اس کو دور کریں، پھر وضو کریں، پھر تین مرتبہ داہنے کندھے پر اور تین مرتبہ بائیں کندھے پر پانی بہائیں، پھر سر پر اور تمام بدن پر تین مرتبہ پانی بہائیں۔اور اگر ایک ساتھ سارے بدن پر تین مرتبہ پانی بہادیا، جیسے آج کل شاور کے نیچے غسل کرتے ہیں تو بھی درست ہے اور کسی نہر یا بڑے تالاب میں بھی غسل کرسکتے ہیں۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کانت رسول اللہ ﷺ اذااغتسل من الجنابۃ دعابشئی نحو الحلاب فاخذ بکفہ بدأبشق رأسہ الایمن،ثم الایسر، ثم اخذ بکفیہ فقال بہما علیٰ رأسہ۔

ترجمہ: ’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کا ارادہ کرتے تو (دودھ دان کی قسم کا) ایک برتن منگواتے، پھر اس سے پانی لے کر پہلے سر کی دائیں جانب دھوتے، پھر بائیں جانب، پھر دونوں ہاتھوں سے پانی لے کر سر پر بہاتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 710)‘‘۔غسلِ جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے، غسلِ طہارت اور غسلِ مسنون میں فرض نہیں

،سنت ہے۔ غسل کرنے کے بعد نماز پڑھنے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں رہتی ،اگر غسل میں پورے بدن پر پانی ڈالنے سے پہلے صحیح طریقے سے کلی کرلی ہے اور ناک میں پانی ڈال لیا ہے تو اب غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے، غسل کے لئے نیت کرنا سنت ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد زچہ اور بچہ کا غسل

سوال: 11

کئی ایک گھرانوں میں جب بچے کی پیدائش ہوتی ہے،تو پیدائش کے وقت بچے کو غسل دینے کے بعد چالیس روز تک نہ ماں غسل کرتی ہے،اور نہ ہی بچے کو غسل دیا جاتا ہے، کیا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟،(برکت علی، گلشن اقبال، کراچی(معرفت دین و دانش، روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب:

بچے کی پیدائش کے بعد ضرورت کے وقت اس بچے کو غسل دینے کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور یہ نظریہ غلط ہے کہ ایک مرتبہ غسل دینے کے بعد اسے دوبارہ غسل نہیں دے سکتے ،سوائے اس کے کہ ڈاکٹر طبی طور پر غسل دینے کو اس کے لئے نقصان دہ قرار دے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ماں (زچہ) کے رحم سے جو خون جاری ہوتا ہے، اس کو نفاس کہتے ہیں،شرعی اعتبار سے نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے، اگر چالیس دن تک اس کا خون جاری رہتا ہے تو اس عرصے میں وہ شرعی طور پر ناپاک رہے گی، اور ان ایام میں وہ نماز نہیں پڑھے گی اور نہ ہی بعد میں اس پر ان نمازوں کی قضا ہے، اسی طرح اس کے لئے قرآن کو چھونا اور زبانی قرآن کی تلاوت کرنا بھی منع ہے، البتہ کلمات قرآن بطورِ ذکر، تسبیح و دعا پڑھ سکتی ہے۔اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہتا ہے تو اب یہ ''نفاس'' نہیں ہے، بلکہ وہ غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازوں کا سلسلہ شروع کر دے، ہاں اگر خون اتنی دیر بھی نہ رکتا ہو کہ ایک وقت کی

نماز پڑھ لے تو ہر نماز کے لئے تازہ وضو کر کے نماز پڑھ لیا کریں (وضو سے پہلے خون آلود مقام دھولیں)، اور اس وقت کے اندر مزید جتنی قضا نمازیں، نوافل وغیرہ پڑھ سکتی ہوں، پڑھ لیں اور تلاوت بھی کر سکتی ہیں۔ شرعاً نفاس کی کم از کم کوئی مقرر مدت نہیں ہے، بس جس دن خون رک جائے، وہ غسل کر کے پاک ہو لے اور نماز کا سلسلہ شروع کر دے، اگر نہیں کرے گی تو گنہگار ہو گی اور وہ نمازیں اس کے ذمے قضا ہوں گی۔ تاہم جب تک نفاس کا سلسلہ جاری ہے، وہ شرعی پاکی کے لئے تو غسل نہیں کرے گی، البتہ جسمانی میل پسینہ دور کرنے کے لئے، طبیعت کے تکدر اور انقباض کو دور کرنا چاہے تو غسل کر سکتی ہے۔

﴿کتاب الصلوٰۃ﴾

طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ عید

سوال: 12

طلوعِ آفتاب ہونے پر کتنی دیر تک نماز پڑھنا مکروہ ہے؟ایک دیوبندی امام نے نمازِ عید الاضحیٰ کی جماعت صبح سات بج کر پچیس منٹ پر کھڑی کردی جبکہ اس روز طلوعِ آفتاب سات بج کر سترہ منٹ پر تھا۔کیاان کی نمازِ عید ہوگئی یا نہیں؟نیز کورنگی میں واقع دارالعلوم کراچی کے نماز سے متعلق نظام الاوقات کے نقشے کے مطابق طلوعِ آفتاب کے بعد صرف دس منٹ تک نماز پڑھنا مکروہ ہے جبکہ ہم اہلسنت وجماعت کے یہاں طلوعِ آفتاب سے لے کر بیس منٹ تک مکروہ وقت ہے ،جیسا کہ بہارِ شریعت وغیرہ کتب میں مذکور ہونے کے ساتھ ساتھ عمل بھی اسی پر ہے۔آپ سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیلی اور مدلل روشنی ڈالیں ،(عبداللہ قادری،کراچی)۔

جواب:

اوقاتِ مکروہہ(طلوع ،غروب اور نصف النہار شرعی)ان تینوں وقتوں میں کوئی نماز نہ فرض نہ واجب نہ نفل نہ ادا نہ قضا یونہی سجدۂ تلاوت بھی جائز نہیں ہاں اگر اس دن کی نمازِ عصر ادا نہ کی ہوتو اگر چہ سورج غروب ہورہا ہوتو بھی پڑھ لے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ثلاث ساعات لاتجوز فیھا المکتوبۃ ولاصلاۃ الجنازۃ ولاسجدۃ التلاوۃ اذا طلعت الشمس حتی ترتفع وعند الانتصاف الی أن تزول وعند احمرارھا الی أن تغیب الاعصر یومہ ذالک فانہ

یجوز اداؤہ عند الغروب ھکذا فی فتاویٰ قاضی خان۔

ترجمہ: ''تین ساعتیں جن میں کسی قسم کی نماز، نمازِ جنازہ، سجدۂ تلاوت جائز نہیں، جب سورج طلوع ہونا شروع ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور نصف النہار شرعی سے نصف النہار حقیقی یعنی آفتاب ڈھلنے تک ہے، آفتاب کے زرد ہونے سے غروب تک مگر یہ کہ اس دن کی نمازِ عصر غروب کے وقت بھی پڑھ لے، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 54 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''جب سے آفتاب کی کرن چمکے اس وقت سے بیس منٹ گزرنے تک نماز ناجائز اور وقتِ کراہت ہوا، اور ادھر جب غروب کو بیس منٹ رہیں، وقت کراہت آجائے گا، اور آج کی عصر کے سواء ہر نماز منع ہوجائے گی، (فتاویٰ رضویہ جلد: 5، ص: 138، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ سائل کے مطابق مذکورہ دیوبندی امام نے سات بج کر پچیس منٹ پر عید کی نماز کھڑی کردی، یہ نماز مکروہ ہوئی، کیونکہ طلوعِ آفتاب اور نماز میں آٹھ منٹ کا وقفہ ہوا اور امام احمد رضا قادری کے نزدیک طلوعِ آفتاب کے کم از کم بیس منٹ بعد نماز پڑھنی چاہئے، اس سے پہلے پڑھی تو مکروہ ہوگی۔ دار العلوم کراچی کے نظام الاوقات کو بھی اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کی رو سے بھی طلوعِ آفتاب کے دس منٹ بعد تک نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور استفتاء میں درج صورتِ مسئلہ کے مطابق مذکورہ امام نے طلوعِ آفتاب کے آٹھ منٹ بعد نمازِ عید کی جماعت کھڑی کی، لہٰذا سب کی نماز مکروہ ہوئی اور اس کی ذمہ داری امام پر عائد ہوتی ہے۔ نمازِ عید سے متعلق علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ووقت صلاۃ العیدین من حین تبیض الشمس الی ان تزول کذافی السراجیۃ و کذا فی

التبيين۔ والافضل أن يعجل الاضحى ويؤخر الفطر كذا في الخلاصه۔
ترجمہ:"اور نمازِ عیدین کی ادائیگی جب سورج روشن ہو جائے، سے اس کے زوال (نصف النہار شرعی) تک ہے،"سراجیہ" اور "تبیین" میں اسی طرح ہے عید الاضحیٰ میں جلدی اور عید الفطر میں تاخیر کرنا افضل ہے،"خلاصہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:150 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔
طلوع سے مراد آفتاب کا کنارہ ظاہر ہونے سے اس وقت تک ہے کہ اس پر نگاہیں خیرہ ہونے لگیں جس کی مقدار کنارہ چمکنے سے بیس منٹ تک ہے۔

تارکِ صلوٰۃ کا شرعی حکم

سوال: 13

بے نمازی کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ترک نماز کرنے والا کافر ہو جاتا ہے؟، (محمد عمیر، بلدیہ ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

نماز اسلام کا بنیادی رکن ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کو بیان کرتے ہوئے توحید و رسالت کی شہادت کے بعد نماز کا ذکر فرمایا۔ قرآن میں ترکِ نماز پر بڑی وعید آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ط
(1) ترجمہ: "پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے، جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی، تو عنقریب وہ (جہنم کے گڑھے) غی میں جاگریں گے، (مریم: 59)"۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ o إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ o فِيْ جَنَّاتٍ يَتَسَاءلُونَ

o عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ o مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ o قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ

o وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ o

(2) ترجمہ: ''ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے، سوائے دائیں طرف والوں کے، وہ جنتوں میں (ہوں گے اور) مجرموں کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے، (پھر وہ مجرموں سے کہیں گے) کون سا جرم تمہارے دوزخ میں داخل ہونے کا سبب بنا؟، وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، (المدثر: 44-38)''۔

وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o

(3) ترجمہ: ''سو ان نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں، (الماعون: 5-4)''۔

إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ط

(4) ترجمہ: ''بے شک منافق اپنے (زعم میں) اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں، درآں حالیکہ اللہ ان کو دھوکے کی سزا دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی (اور بے دلی) سے اور وہ اللہ کا ذکر (تو) بہت ہی کم کرتے ہیں، (النساء: 142)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (هی فرض عین علی مکلف۔۔۔۔۔ و یکفر جاحدها) لثبوتها بدلیل قطعی (و تارکها عمدا مجانة) أی تکاسلا فاسق (یحبس حتی یصلی) لانه یحبس لحق العبد فحق الحق احق۔ الخ

ترجمہ: '' ہر مکلّف یعنی عاقل وبالغ پر نماز فرض عین ہے، اس کی فرضیت کا منکر کافر کیونکہ نماز کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے اور جو قصداً چھوڑے، (اگرچہ ایک ہی وقت کی)، وہ فاسق ہے، (جو نماز نہ پڑھتا ہو) اسے قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ (وہ توبہ کرے) اور نماز پڑھنے لگے، کیونکہ جب بندے کے حق کی وجہ سے قید کیا جاتا ہے تو اللہ کا حق اس کا زیادہ حقدار ہے کہ (اس کی نافرمانی پر) اسے قید کیا جائے۔

نمازی کے حکم کے بارے میں ائمہ کے اقوال نقل کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قوله وعندالشافعی یقتل) وکذا عند مالك واحمد وفی روایة عن احمد وهی المختارة عندجمهور اصحابه انه یقتل کفراوبسط ذالك فی الحلیة۔

ترجمہ: '' صاحبِ درمختار کا قول کہ وعندالشافعی یقتل یعنی امام شافعی کے نزدیک بے نمازی کو قتل کیا جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبل کا بھی ہے اور امام احمد بن حنبل سے ایک قول جو کہ ان کے اصحاب کے نزدیک قول مختار بھی ہے یہ منقول ہے کہ (بے نمازی کو) ان کے کافر ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور حلیہ میں میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا گیا گیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2 ص: 7 , 6 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی ترکِ نماز پر وعید آئی ہے:

(1) عن جابر قال: قال رسول اللہ ﷺ: بین العبد وبین الکفر ترك الصلوة۔

ترجمہ: '' بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کا ترک ہے، (مشکوٰۃ: بحوالہ صحیح مسلم)''۔

(2) عن عبداللہ بن شقیق قال: کان اصحاب رسول اللہ ﷺ لا یرون

شیئامن الاعمال ترکه کفراغیر الصلوۃ ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نماز کے علاوہ کسی بھی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے (یعنی اس کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے)، (مشکوٰۃ: بحوالہ ترمذی)''۔

(3) عن ابی الدرداء قال: اوصانی خلیلی ان لا تشرك باللّٰہ شیئا و ان قطعت وحرقت ولا تترك صلوٰۃ مکتوبۃ متعمدا فمن ترکھا متعمدا فقد برأت منہ الذمۃ ولا تشرب الخمر فانھا مفتاح کل شر۔

ترجمہ:''ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ: مجھے میرے (محبوب) دوست (رسول اللہ ﷺ) نے وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا خواہ تجھے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے اور جلا دیا جائے (یہ حکم عزیمت پر مبنی ہے، کم ہمت لوگوں کے لئے حالتِ اکراہ میں قرآن نے رخصت رکھی ہے) اور کسی فرض نماز کو جان بوجھ کر (ہرگز) نہ چھوڑنا، پس جس نے (فرض نماز کو) قصداً چھوڑا اس سے (اللہ اور رسول کا) ذمہ (یعنی عہد اور امان) اٹھ گیا اور شراب نہ پینا کیونکہ یہ ہر برائی کی کنجی ہے، (مشکوٰۃ: بحوالہ ابن ماجہ)''۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ:''اس امر پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ نماز ہر بالغ، عاقل، طاہر مسلمان پر فرض ہے، سوائے اس خاتون کے جو حالتِ حیض یا نفاس میں ہو یا جو شخص مجنون ہو یا بیہوشی کی حالت میں ہو۔ یہ خالص بدنی عبادت ہے، اس میں نیابت قطعاً قبول نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے نماز پڑھنا صحیح نہیں جیسے کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے روزہ رکھنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس بات پر مسلمانوں

کا اجماع ہے کہ جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے، وہ کافر و مرتد ہے۔ کیونکہ نماز کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اور جو شخص سستی اور کاہلی کی بنا پر نماز ترک کرے وہ فاسق اور گنہگار ہے۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: نماز کا ترک دنیوی اور اخروی عذاب کا باعث ہے، (اور اس مقام پر وہ ان قرآنی آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہیں، جو ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں)۔۔۔ آگے چل کر ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: سستی کی بنا پر یا حقیر جانتے ہوئے نماز کو ترک کرنے کے احکام فقہاء کے نزدیک یہ ہیں:

حنفیہ کے نزدیک تارک الصلوٰۃ فاسق ہے، اسے قید کیا جائے گا اور تعزیری سزا دی جائے گی، یہاں تک وہ توبہ کرے اور نماز پڑھنا شروع کر دے یا قید خانے ہی میں اس کی موت واقع ہو جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب تارک صلوٰۃ کے بارے میں بہت سخت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: تارک صلوٰۃ کو بربناء کفر قتل کر دیا جائے گا، شوکانی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور کہتے ہیں: حق یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے اسے قتل کیا جائے گا اور بعض انواع کفر مغفرت اور استحقاق شفاعت سے مانع نہیں ہیں۔ بعض ائمہ کے نزدیک بلا عذر تارکِ صلوٰۃ سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، اگر وہ توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور مالکی اور شافعیہ کے نزدیک یہ قتل بطور حد ہوگا بربناء کفر نہیں ہوگا یعنی اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے، ایسے شخص کی وفات کے بعد اسے غسل دیا جائے گا، اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ص: 502 تا 505، دار الفکر، دمشق)"۔

تارکِ صلوٰۃ کے بارے میں سب سے نرم اور صائب موقف امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ

تعالیٰ کا ہے اور وہ یہ کہ بلا عذرِ شرعی تارکِ صلوٰۃ فاسق و فاجر ہے، قابلِ تعزیر ہے، اسے قید کیا جاسکتا ہے تاوقتیکہ وہ توبہ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے، لیکن اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اس عنوان سے متعلق قرآن مجید کی آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو امام اعظم کا موقف ہی صائب اور درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان اللّٰہ لایغفر ان یشرك به و یغفر مادون ذالك لمن یشاء۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس (جرم) کو تو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا جائے اور اس سے کم تر جو بھی گناہ ہوں، جس کے لئے چاہے، اسے معاف فرما دیتا ہے، (النساء:48)''۔ اس آیہ مبارکہ میں شرک کے سوا ہر گناہ کی مغفرت کی گنجائش موجود ہے، خواہ وہ کسی درجے کا ہو اور یہ مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: من قال لا اله الا اللّٰه دخل الجنة۔ ''یعنی جس شخص نے صدق دل سے کلمۂ طیبہ پڑھا وہ (آخر کار کسی نہ کسی مرحلے پر) جنت میں داخل ہوگا''۔ وہ احادیث جن میں ترکِ نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے، انہیں نماز کی فرضیت کے انکار پر محمول کیا جائے گا، یعنی جو نماز کی فرضیت کا منکر ہوتے ہوئے نماز کا تارک ہو تو وہ بالاجماع کافر ہے، ایسا شخص ملتِ اسلام سے خارج ہے، البتہ جو شخص فرضیتِ نماز کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن کوتاہی کی بنا پر نماز کا تارک ہے تو وہ ائمۂ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمھم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک فاسق ہے۔ حدیث میں جو ترکِ نماز کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں اس سے مراد اعتقاداً ترک کرنا ہوگا، یعنی انکارِ فرضیت یا تارکِ صلوٰۃ کے ظاہر حال کو بیان کیا گیا ہے کہ عملاً اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ظہر کی پہلے کی چار سنتیں چھوٹ جائیں تو کب پڑھے؟

سوال: 14

ظہر کی چار سنتیں جو پہلے پڑھی جاتی ہیں، اگر وہ فرض ادا کرنے سے پہلے نہ پڑھ سکیں تو ان کی معافی ہے؟یا پڑھا جائے گا۔اگر پڑھنی ہے تو کس طرح؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں، (عبداللہ، کراچی)۔

جواب:

سنتیں بعض مؤکدہ ہیں جن کی ادا کرنے کے لئے شریعت میں تاکید فرمائی اور شارع علیہ السلام نے اس پر ہمیشگی اختیار فرمائی اور اس کے بے پناہ اجر وثواب کو بیان فرمایا:عن أم حبيبة قالت : قال رسول الله ﷺ : "من صلیّ قبل الظهر أربعاً وبعدها أربعاً حرمه الله على النار"۔

ترجمہ: "ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنھا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ظہر سے پہلے چار اور بعد میں چار رکعتیں (ہمیشہ) پڑھے اللہ تعالی اس کو آگ پر حرام فرمادے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 427)"۔

عن عنبسة بن ابی سفیان قال: سمعت اختی أم حبيبة زوج النبی ﷺ تقول : سمعت رسول الله ﷺ يقول : "من حافظ على أربع ركعات قبل الظهر و أربع بعدها حرمه الله على النار"۔

ترجمہ: عنبسہ بن ابوسفیان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ہمشیرہ، زوجِ نبی ﷺ (امّ حبیبہ) کو فرماتے ہوئے سنا کہ وہ بیان کرتی ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ظہر سے پہلے چار رکعات اور ظہر کے بعد کی چار رکعات کی حفاظت کرے، اللہ تعالی اس کو آگ پر حرام فرمادے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 428)"۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں: ''حدیث میں ظہر کے بعد جن سنتوں کا ذکر ہے ان میں سے دو سنت ہیں اور دو مستحب، لہٰذا افضل یہ ہے کہ یہ الگ الگ دوگانے کی شکل میں پڑھی جائیں، ظہر سے پہلے کی چار سنتوں کے برعکس کہ وہ ایک سلام کے ساتھ پڑھی جائیں گی، جہاں تک یہ سنتیں پڑھنے پر غیر معمولی اجر، (یعنی یہ کہ وہ شخص جہنم کی آگ پر حرام کی نوید کا مسئلہ) ہے، اس سے یا تو مراد یہ ہے کہ وہ دائمی طور پر جہنم میں نہیں رہے گا یا یہ کہ جو شخص سنتوں اور مستحبات کا اتنا اہتمام کرتا ہے، وہ فرائض و واجبات کا اس سے بھی زیادہ پابند ہوگا اور محرمات سے بھی اجتناب کرنے والا ہوگا تو یقیناً جہنم سے محفوظ رہے گا، (مرقات المفاتیح ، ج:3، ص:113 مکتبہ امدادیہ، ملتان)''۔

عن عائشة: ان النبی ﷺ کان اذالم یصل اربعاقبل الظہر صلاھن بعدہٗ۔

ترجمہ: ''(امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں نہ پڑھی ہوتیں، تو انہیں بعد میں پڑھ لیتے، (سنن ترمذی رقم الحدیث:426 ج:1، ص:319 دار الکتب العلمیہ، بیروت)''۔

سنتِ موکدہ کو سنن الھدیٰ بھی کہتے ہیں، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والسنة نوعان : سنة الھدیٰ ، و ترکھا یوجب اساءة و کراھیة کالجماعة والأذان والاقامة ونحوھا۔

ترجمہ: ''سنت کی دو قسم ہیں: (جس میں سے ایک) سنن الھدیٰ (سنتِ موکدہ) بھی ہے، اور ان کا ترک کرنا، موجبِ گناہ اور باعثِ کراہیت ہے جیسے کہ جماعت، اذان واقامت اور (ان جیسے دیگر) امور کا ترک کرنا، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 1 ص:

196 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)'' ۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وأما الاربع قبل الظهر اذا فاتته وحدها بان شرع فی صلاۃ الامام ولم یشتغل بالاربع فعامتهم علی أنه یقضیها بعد الفراغ من الظهر مادام الوقت باقیا وهو الصحیح هکذا فی المحیط۔ وفی الحقائق یقدّم الرکعتین عندهما وقال محمد رحمه الله تعالیٰ یقدّم الاربع وعلیه الفتویٰ کذا فی السراج الوهاج۔

ترجمہ:''(جب ظہر کی جماعت کھڑی ہوجائے)اور (مقتدی کے)امام کے ساتھ (جماعت میں)شامل ہونے کی وجہ سے ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں،تو عام فقہائے کرام کی رائے یہ ہے کہ جب تک وقت باقی ہے،(ظہر کے فرائض سے) فارغ ہونے کے بعد پڑھ لے،یہی صحیح ہے،''محیط'' میں اسی طرح ہے،اور''حقائق ''میں ہے کہ شیخین (امام اعظم اورامام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ) کے نزدیک (بعدوالی) دورکعتیں پہلے پڑھے،(اور پھر ظہر کی پہلی چار سنتیں جو چھوٹ گئی ہیں،پڑھے)امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے والی چار(سنتیں)پہلے پڑھے(اور پھر بعد والی دو پڑھے)اوراسی پرفتویٰ ہے،''السراج الوھاج''میں اسی طرح ہے،(عالمگیری،ج:1،ص:112،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ظہر یا جمعے کے پہلے کی سنت فوت ہوگئی اور فرض پڑھ لئے تو اگروقت باقی ہے،بعد فرض کے پڑھے،اورافضل یہ ہے کہ پچھلی سنتیں پڑھ کران کو پڑھے،(فتح القدیر)،(بہارِ شریعت ج:4،ص:101،ضیاء القرآن پبلیکشنز،کراچی)''۔

ظہر سے پہلے کی چھوٹی ہوئی چار سنتوں کوپچھلی دوسنتوں کے بعد پڑھنا زیادہ قرین

قیاس ہے کیونکہ پہلے والی چار تو اپنی جگہ سے ہٹ چکی ہیں،تو بعد والی دو تو اپنی جگہ پہ قائم رہنی چاہئیں، یہی شیخین کا مذہب ہے اور صاحبِ فتح القدیر کا مختار ہے۔

جہاں زمین کے نیچے سیوریج لائن گزر رہی ہے،اس جگہ پر نماز پڑھنا

سوال: 15

ہمارے گھر میں فرش کے نیچے گٹر کا پائپ گزرا ہوا ہے۔کیا اُس فرش پر نماز ہو جاتی ہے؟،(بخت ولی ،راولپنڈی)۔

جواب:

نمازی کے بدن ،اس کے کپڑے اور جائے نماز (جس جگہ نماز پڑھ رہا ہے) کا نجاستِ حقیقیہ قدرِ مانع سے پاک ہونا،نماز کی شرائط میں سے ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولو کان رقیقاً وبسطه علی موضع نجس ، ان صلح ساتراً للعورۃ تجوز الصلاۃ کما فی "البحر "عن "الخلاصۃ"۔وفی "القنیۃ": لو صلیّ علی زجاج یصف ماتحته قالوا جمیعا یجوز ۔

ترجمہ:''اگرنجس جگہ پر باریک کپڑا بچھا کرنماز پڑھی جو ستر کے کام میں آسکتا ہے(یعنی اس کے نیچے کی چیز نہ جھلکتی ہو) نماز ہوگئی،''بحرالرائق''میں''خلاصہ''سے اسی طرح منقول ہے۔''قنیہ''میں ہے: اگر شیشہ پر نماز پڑھی اور اس کے نیچے نجاست ہے اگر چہ نمایاں ہو،نماز ہوگئی ،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 2،ص:68،مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

مذکورہ صورت میں چونکہ پائپ فرش کے نیچے سے گزر رہا ہے اور نجاست پائپ کے

اندر ہے اور خود پائپ بھی زمین میں دفن ہے اور نمازی نہ تو نجاست پر کھڑا ہے اور نہ ہی اس کے نجاست سے آلودہ ہونے کا کوئی خطرہ ہے بالہٰذا اس مقام پر نماز تو جائز ہے، لیکن اگر اس مقام پر پڑھنے سے طبیعت میں کراہت محسوس ہوتی ہے تو دوسری جگہ پڑھ لیں۔

مسجد میں اپنے لئے اور دوسرے کے لئے جگہ مختص کرنا یا کپڑا رکھ کر محفوظ کرنا

سوال: 16

ایک نمازی مسجد میں اپنا رومال ،تولیہ یا کوئی کپڑا اس لئے رکھے کہ دوسرے کو وہ جگہ ملے اور وہ آدمی ابھی مسجد میں نہیں ہے کہ جس کے لئے جگہ روک رہے ہیں یا اپنے لئے کسی جگہ کو مقرر کر لے کہ وہاں کسی کو نہ بیٹھنے دے، کیا ایسا کرنا درست ہے ؟، (وقاص احمد، کراچی)۔

جواب:

نماز میں اپنے یا کسی دوسرے شخص کے لئے جگہ مخصوص کرنا مکروہ ہے،

حدیث مبارکہ میں ہے:عن جعفر بن عبداللہ: أن تمیم بن محمود اخبرہ، أن عبدالرحمن بن شبل اخبرہ، أن رسول اللہ ﷺ نھیٰ عن ثلاث: عن نقرۃ الغراب، وأفتراش السبع، و أن یوطن الرجل المقام للصلاۃ کمایوطن البعیر۔

ترجمہ: ’’عبدالرحمن بن شبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نماز میں) تین باتوں سے منع فرمایا، کوے کی طرح ٹھونگ مارنا ،(یعنی جلدی جلدی سجدہ کرنا کہ پیشانی زمین سے ٹکرائے اور مقدارِ سنت تین تسبیحات پڑھنے سے پہلے

اُٹھ جائے) درندے کی طرح پاؤں بچھا کر بیٹھنا اور مسجد میں کوئی شخص جگہ مقرر کر لے جیسے اونٹ جگہ مقرر کر لیتا ہے، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 1111)"۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ویکرہ للانسان ان یخص بنفسہ مکانا فی المسجد یصلی فیہ کذا فی التتار خانیہ۔

ترجمہ "کسی شخص کا مسجد میں اپنے لئے کوئی جگہ خاص کر لینا کہ وہیں نماز پڑھے، مکروہ ہے، (فتاوی عالمگیری، جلد: اول، ص: 108، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

لہٰذا مسجد میں نہ کسی کا اپنے لئے پہلے سے جگہ مختص کرنا درست ہے اور نہ دوسرے کے لئے، اس سے اپنے لئے یا دوسرے کے لئے تعلّی (یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے) کا تاثر پیدا ہوتا ہے اور نماز کے من جملہ مقاصد شرعیہ میں سے بندے میں، عجز وانکسار پیدا کرنا ہے اور اپنے نفس کے عُجب (غرور وتکبر) سے بچنا ہے، پھر مسجد ہی تو وہ مقام ہے جہاں انسانوں کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے، جیسے علامہ اقبال نے کہا:

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہاں اگر کوئی شخص پہلے سے مسجد میں صف میں بیٹھا ہوا ہے، اور کوئی صاحبِ علم، صاحب ورع وتقویٰ آجاتا ہے، اور وہ شخص اس کی دین داری، تقویٰ اور علم کی وجہ سے اس کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، بشرطیکہ اس صاحبِ علم وتقویٰ کے دل میں ایسی خواہش نہ ہو کہ علم کی بنا پر اس کی تکریم کی جائے یا کوئی معذور و بیمار ہے اور اسے کنارے میں ٹیک لگا کر بیٹھنا ہے تو اس بنا پر کوئی اس کی رعایت کر کے جگہ چھوڑ دے تو یہ جائز اور مستحسن امر ہے اور محاسنِ اَخلاق میں سے ہے، ہاں کسی کی دنیوی وجاہت ومنصب یا دولت کی

وجہ سے اسے تکریم دی جائے تو یہ شرعاً ناپسندیدہ امر ہے۔

نماز میں اقامت کہنے والے کا امام بننا یا امام کا خود ہی اقامت کہہ دینا

سوال: 17

اگر مؤذن صاحب نے اقامت کہی اور امام صاحب کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے خود مصلّے پر نماز پڑھانے آ گئے تو کیا اس صورت میں مؤذن کی کہی گئی اقامت کافی ہوگی یا دوبارہ اقامت کہی جائے گی؟،(اراکین انتظامیہ جامع مسجد نورانی ،لانڈھی 4 کراچی)۔

جواب:

اقامت درست اور کافی ہوگی، دوبارہ نہیں کہی جائے گی۔حدیث مبارک میں ہے:عن زیاد بن الحارث الصدائی ، قال: کنت مع رسول اللہ ﷺ فی سفر۔فأمرنی فأذّنت ۔ فأراد بلال ان یقیم ۔ فقال رسول اللہ ﷺ : "انّ أخا صداءٍ قد أذّن ۔ومن أذّن فھو یقیم"۔

ترجمہ:''زیاد بن حارث صدائی سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے آپ ﷺ نے مجھے اذان کا حکم دیا۔پھر (اذان کے بعد)بلال نے ارادہ کیا کہ وہ اقامت کہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:تمہارے بھائی صدائی نے اذان کہی پس جو اذان کہے وہی اقامت کہے،(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:717)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

والاحسن أن یکون اماما فی الصلاۃ کذا فی معراج الدرایۃ ۔والافضل أن یکون المؤذن ھوالمقیم کذا فی الکافی۔ وان أذن رجل واقام آخر ان

غاب الاول جاز من غير كراهة وان كان حاضرا و يلحقه الوحشة باقامة غيره يكره وان رضى به لا يكره عندنا كذا في المحيط ۔

ترجمہ: ''اورامام ہی اذان دےتو یہ بہت زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ''معراج الدرایہ'' میں ہے،اور افضل یہ ہے کہ مؤذن ہی اقامت کہے'' کافی ''میں اسی طرح سے ہے۔اور اگر ایک شخص نے اذان کہی اور دوسرے نے اقامت کہی تو اگر پہلا شخص (جس نے اذان کہی) غائب ہے تو بلا کراہت اقامت جائز ہے اور اگر وہ موجود ہے اور اس کی اجازت کے بغیر دوسرے شخص نے اقامت کہی اور مؤذن کو (دوسرے کا اقامت کہنا) ناگوار ہوتو پھر یہ مکروہ ہے،اور اگر وہ راضی ہے تو ہمارے نزدیک کوئی کراہت نہیں،''محیط'' میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد: 1،ص: 54،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

اس مسئلے سے معلوم ہوا کہ جو شخص امامت کرائے وہ اقامت بھی کہہ سکتا ہے،عموماً لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر امام مصلّٰی پر نہ ہوتو اقامت نہیں کہی جائے گی یہ خیال باطل ہے،اقامت کے وقت امام کا مُصلّٰی پر ہونا نہ واجب ہے،نہ سنت نہ مستحب،امام مصلّٰی پر ہو یا نہ ہو،دونوں صورتیں برابر ہیں ،بلکہ عہد رسالت میں یہی طریقہ رائج تھا کہ حضور اقدس ﷺ حجرے میں ہوتے ،حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کی طرف نظریں جمائے رہتے ، جب آپ حجرۂ انور سے نکلتے تو وہ اقامت شروع کر دیتے،صحابہ بھی فوراً اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہوجاتے،آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو اس عجلت کے طریقہ سے منع فرمایا،چنانچہ اس کے بعد جب آپ حجرۂ انور سے نکلتے ،اقامت شروع ہوجاتی ،آپ مصلّٰی پر تشریف لاتے اور جیسے جیسے آپ ﷺ صحابۂ کرام کی صفوں سے گزرتے،وہ کھڑے ہوتے جاتے۔حدیث پاک میں ہے:

عن ابی قتادۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ : اذااُقیمت الصلوۃ فلاتقوموا حتی ترونی ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو جب تک تم (خود) مجھے دیکھ نہ لو، (عجلت میں) کھڑے نہ ہوا کرو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:604)''۔

جو مسئلہ دریافت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آیا جس شخص نے جماعت کے لئے اقامت کہی ہو، وہ آگے بڑھ کر امامت بھی کرسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں اقامت کہنے والا امامت کرسکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اقامت کہہ دی جاتی ہے مگر اقامت کہنے والے کے سوا کوئی امامت کا اہل نہیں ہے تو وہ آگے بڑھ کر امامت کرسکتا ہے یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ امام تو موجود ہوتا ہے مگر کوئی اقامت کہنے والا نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں امام اقامت کہہ سکتا ہے۔

نوٹ: جماعت کے قیام کے لئے جماعت سے پہلے اقامت کہی جاتی ہے، اسے حدیث وفقہ میں ''اقامت'' کہا جاتا ہے، اور یہ عنوان اس کلمے سے ماخوذ ہے: قد قامت الصلوٰۃ، (نماز یعنی جماعت کھڑی ہوگئی ہے)۔

اقامت کے لفظی معنی ہیں: ''کھڑا کرنا'' اور یہاں مراد ہے ''جماعت کا قائم کرنا''۔ ہمارے ہاں عرف عام میں لوگ اسے ''تکبیر'' کہتے ہیں، ''تکبیر'' کے معنی ہیں ''اللہ اکبر'' کہنا یا اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرنا۔ چونکہ اس کا پہلا کلمہ ''اللہ اکبر'' ہے، اسی لئے اسے تکبیر بھی کہہ دیتے ہیں۔

امام یا مؤذن کا غیر شادی شدہ ہونا

سوال: 18

امامت یا مؤذن کے فرائض کی ادائیگی کے لئے کیا یہ شرط ضروری ہے کہ وہ شادی شدہ ہو۔کیا امام کی غیر موجودگی میں مؤذن (جو کہ غیر شادی شدہ ہے) امامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے ؟، (حافظ معشوق علی سکندری ،مؤذن جامع مسجد صدیقیہ D-5 نیو کراچی)۔

جواب :

شرائطِ امامت میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ امام شادی شدہ ہو،شرائطِ امامت چھ ہیں،اسلام، عاقل، بالغ، مرد ہونا،قراءت پر قادر ہونا،معذور نہ ہونا ۔
امامِ معیّن ہی امامت کا زیادہ حق دار ہےاگر چہ حاضرین میں کوئی اس سے زیادہ علم اور زیادہ تجوید والا ہو،اوراگر امامِ معیّن کسی بناء پر موجود نہ ہو یا آنے میں تاخیر ہو جائےتو اس کی جگہ مؤذن نماز پڑھانے کا زیادہ اہل ہے کہ یہ اس کے فرائض میں شامل ہے ،ہاں اگر کسی مسجد میں امامِ معیّن کے ساتھ نائب امام بھی علیحدہ سے مقرر ہوتو نماز پڑھانے کا اختیار اسے حاصل ہوگا لیکن اگر مؤذن ہی نائب امام ہےتو پھر نماز وہی پڑھائے۔جس وقت امام یا مؤذن کا تقرر کیا جاتا ہےتو مسجد کمیٹی امام یا مؤذن سے متعلق معلومات جمع کرتی ہیں،تو اس وقت شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونا سب معلوم ہو جاتا ہے بعد میں اس بات کو عذر بنانا محض فتنہ انگیزی ہے،لیکن بہر حال غیر شادی شدہ ہونا امام یا مؤذن کو ان کے فرائض سے علیحدہ کرنے کے لئے عذر نہیں ہے۔

تراویح کی امامت کا استحقاق

سوال : 19

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ ایک مسجد کے امام صاحب حافظِ قرآن، قاری و عالمِ دین ہیں، مذکورہ امام کے ہوتے ہوئے انتظامیہ کے بعض افراد نے نمازِ تراویح کے لئے دوسرے حافظ کا انتظام کیا ہے جو صرف حافظ ہے، عالم وقاری نہیں، انتظامیہ کے ان افراد نے مذکورہ امام صاحب کو کہا کہ آپ کو اجازت ہے کہ کسی اور مسجد میں تراویح پڑھالیں۔ واضح ہو کہ مقررہ امام صاحب پر انتظامیہ یا کسی اور مقتدی کو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ امام صاحب اور مقتدی صاحبان کی شدید خواہش ہے کہ وہ خود تراویح پڑھائیں۔

جس حافظ کو تراویح کے لئے مقرر کیا جارہا ہے وہ انتظامیہ کے کسی ممبر کا رشتے دار ہے ۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ انتظامیہ کا یہ عمل شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا انتظامیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ تراویح پڑھانے کا جو حق مقررہ امام کو حاصل ہے، بغیر کسی شرعی وجہ کے کسی اور کو تفویض کردے؟ اس حافظ کے پیچھے جو عالم نہیں ہے رمضان میں نمازِ عشاء ،وتر وتراویح پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں ،(فخر عالم، مہاجرین مسجد بزرٹہ لائن کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئولہ میں امام معین (جو کہ عالم دین ہونے کے ساتھ قاری وحافظ بھی ہے) ہی نمازِ تراویح کی امامت کا زیادہ حقدار ہے، بلکہ افضل یہ ہے کہ وہی نمازِ تراویح پڑھائے، دوسرے کی اقتداء نہ کرے۔

علامہ نظام الدین تراویح کی بحث میں لکھتے ہیں:

ولو كان الفقيه قارئا فالافضل والاحسن ان يصلي بقرأة نفسه ولا يقتدي بغيره كذافي فتاوى قاضيخان ۔

ترجمہ:اوراگر(تراویح پڑھانے والا) عالم ہوتو افضل ہے بلکہ احسن یہی ہے کہ وہ خود پڑھائے دوسرے کی اقتداء نہ کرے فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 116 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔جب امام خود حافظ قرآن ہے اور تراویح پڑھانے کا خواہش مند بھی ہے تو اسے کسی دوسری جگہ جا کر پڑھانے کی کیا ضرورت ہے اس بات کا وہ زیادہ حق دار ہے کہ خود اپنی مسجد میں تراویح پڑھائے ہاں !اگر وہ بخوشی اجازت دے تو دوسرے شخص کو مقرر کیا جاسکتا ہے، انتظامیہ کے افراد کا ازخود فیصلہ کرنا جانبداری اور ناانصافی پر مبنی ہے انہیں چاہئے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کریں، شرعی معاملات میں مداخلت انتظامیہ کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے اوراگر وہ انتظامی امور کے اہل نہ ہوں شرعی معاملات میں ضد اور ہٹ دھرمی اختیار کرتے ہوں تو ایسے لوگوں کو معزول کردینا چاہئے اوران کی جگہ نیک اوردین دار لوگوں کا انتخاب کرنا چاہئے۔

جسمانی نقص سے امامت میں فرق

سوال: 20

ہماری مسجد میں نئے پیش امام صاحب مقرر کئے گئے ہیں، جو کہ بہترین قاری عالم ومقرر ہیں، لیکن ان کے ایک پیر میں نقص ہے، یعنی تھوڑا لنگڑا کر چلتے ہیں، جوایک واضح نقص ہے، لیکن سجدہ کی حالت میں ان کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی ہیں۔نمازی حضرات معترض ہیں کہ شرعی اعتبار سے ایسا شخص امامت نہیں کراسکتا ہے، اوراس کے پیچھے نماز میں کراہیت تو نہیں ہوگی، برائے مہربانی شریعت کی رو سے فتویٰ

عنایت فرمائیں، (قدیر احمد انصاری، جنرل سکریٹری، جامع مسجد باب الاسلام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو كان لقدم الامام عوج وقام على بعضها يجوز وغيره اولى كذا في التبيين۔

ترجمہ: ''اگر امام کے پیر میں ٹیڑھا پن (ایسا نقص ہو) کہ پورا پاؤں زمین پر نہیں جما سکتا، تب بھی اس کی امامت جائز ہے، مگر (اس کے مقابلے میں) غیر معذور کی امامت بہتر ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:83 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا: ایک آدمی جس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں نہیں ہیں، کیا وہ ان لوگوں کی امامت کرسکتا ہے؟، جن کے دونوں پاؤں درست ہوں۔

اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ''شریعت میں نماز کے احکام میں معذور اس کو کہتے ہیں، جس میں وضوتوڑنے والی کوئی بات پائی جائے، اس طرح کہ وہ وضو کر کے نماز پڑھنے کا وقت بھی نہ پاسکے کہ وضوٹوٹ جائے، مثلاً بار بار پیشاب کے قطروں کا آنا، ہر وقت ریح کا خارج ہونا یا بدن سے خون یا پیپ کا بہتے رہنا، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے غیر معذور کی یا اس سے کم عذر والے کی نماز نہیں ہوتی، جیسا کہ بہارِ شریعت میں لکھا ہے۔

پیر کی انگلیاں کٹی ہونے کی وجہ سے اس قسم کا معذور نہیں ہے، وہ اپنے قدم زمین پر لگا کر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز بھی ہوجائے گی اور اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ انگلی موڑنے کا حکم اس کے لئے ہے، جس کے پیر میں انگلی ہو اور جس کے پاؤں میں انگلی ہی نہیں ہے، اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے، (وقارالفتاویٰ، جلد دوم، ص:179، مطبوعہ

بزم وقار الدین، کراچی)"۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکور امام کی اقتدا میں نماز جائز ہے، بقول سائل امام صاحب کے پاؤں کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی ہیں، اگر خدانخواستہ ان کے پاؤں کی انگلیاں سرے سے نہ ہوتیں، اور پاؤں زمین پر لگ جاتا، تب بھی ان کی امامت درست ہوتی، یا انگلیاں سالم ہوتیں مگر ناخن کے لنگ کی وجہ سے پاؤں زمین پر لگ جاتا اور انگلیاں بربنائے عذر لگ جاتیں، تب بھی امامت درست ہوتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔

ترجمہ: "اور اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، (الحج: 78)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن انس، عن النبی ﷺ قال: "یسّروا ولا تعسّروا وبشّروا ولا تنفّروا"۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "(دین میں) آسانی پیدا کرو، دشواری نہیں اور (لوگوں کو رحمت باری کی) بشارت سناؤ، انہیں دین سے متنفر نہ کرو (صحیح البخاری رقم الحدیث: 69 مطبوعہ مکتبۃ العصریہ، بیروت)"۔

نابینا کی امامت

سوال: 21

کسی نابینا قاری وحافظِ قرآن امام کے پیچھے پنج وقتہ نماز اور نمازِ جمعہ ادا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ یعنی کیا نابینا کو امام بنانا جائز ہے؟، (حافظ قاری خلیق اللہ، نواب شاہ)۔

جواب:

امام ابوداؤد سجستانی اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

عن أنس ان النبی ﷺ استخلف ابن أم مکتوم یؤم الناس وھو اعمیٰ ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (غزوۂ تبوک کے موقع پر عبداللہ) ابن اُم مکتوم کو (مدینہ منورہ میں) اپنا خلیفہ بنایا تا کہ وہ لوگوں کی امامت کریں، حالانکہ وہ نابینا تھے، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 595 المکتبۃ المکیہ، مکہ)''۔

اس کی شرح میں علامہ علی القاری الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ابن الملک نے کہا نابینا کی امامت کی کراہت تب ہے جبکہ قوم میں اس کے مقابلے میں تندرست شخص اس سے بڑا عالم یا اس کے برابر درجے کا عالم موجود ہو، اور ابن حجر نے کہا کہ اس میں نابینا کی امامت کا جواز ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بینا کی امامت اولیٰ ہے یا نابینا کی (جبکہ دونوں دستیاب ہوں)، (مرقاۃ المفاتیح، جلد: 3، ص: 84 مکتبہ امدادیہ، ملتان)''۔

نابینا شخص اگر احتیاط برتتا ہے یعنی کپڑوں یا بدن پر کوئی چیز لگ جائے تو کسی بینا شخص کو دکھا کر اطمینان کر لیتا ہے کہ کہیں نجاست تو نہیں لگی؟، اور اگر نجاست لگ گئی ہو تو دھو لیتا ہے، ایسے نابینا کی امامت جائز ہے، مگر مکروہِ تنزیہی ہے اور اگر وہ حاضرین میں مسائل نماز کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے، تو اس کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویکرہ) تنزیھاً (امامۃ اعمیٰ) ونحوہ الأعشی۔ "نھر" (الا ان یکون) ای غیر الفاسق (أعلم القوم) فھو اولیٰ۔

ترجمہ: ''نابینا اور ایسا شخص جسے رات کو نظر نہ آتا ہو، اس کی امامت مکروہ تنزیہی ہے (بحوالہ البحر) اور اگر یہ زیادہ صاحب علم ہو تو اس کی امامت بہتر ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد: 2، ص: 255 ,254 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔ چونکہ علامہ حصکفی نے نابینا کا ذکر فاسق اور اعرابی کے سیاق میں کیا ہے، اس لئے اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وحاصلہ ان قولہ "الا ان یکون أعلم القوم "خاص بالاعمیٰ، اما غیرہ فلا تنتفی الکراھۃبعلمہ۔

ترجمہ: ''اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ (علامہ حصکفی کا یہ قول کہ) ''اگر وہ پوری قوم سے زیادہ عالم ہو'' (تو وہ نابینا امامت کا زیادہ حق دار ہے) نابینا کے ساتھ خاص ہے، جہاں تک غیر نابینا (کی امامت) کا تعلق ہے، تو علم کی بنا پر اس کی کراہت منتفی نہیں ہوگی ۔۔۔۔۔۔۔ اور آگے چل کر لکھتے ہیں: کہ اگر نابینا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عالم ہے تو استحقاقِ امامت کا معاملہ بالکل برعکس ہوگا (یعنی نابینا عالم ہی زیادہ حق دار ہوگا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:2 ص: 255 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ اندھے کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی یا تحریمی یا نہیں اور یہ امامت کے واسطے سزاوار ہے یا نہیں، جواب میں وہ لکھتے ہیں: اندھا اگر تمام موجودین میں سب سے زیادہ مسائل کا جاننے والا نہ ہو اور اس کے سوا دوسرا صحیح القراءت، صحیح العقیدہ، غیر فاسقِ معلن حاضر جماعت ہے، تو اندھے کی امامت مکروہِ تنزیہی ہے، اور اگر وہی سب سے زیادہ علم نماز رکھتا ہے تو اسی کی امامت افضل ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6 ص: 520 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''نابینا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، جبکہ دوسرے لوگ

مسائلِ طہارت ونماز میں اس سے زائد یا اس کے برابر ہوں، اور اگر سب سے زائد یہی علم رکھتا ہو، تو اس کی امامت میں اصلاً کراہت نہیں، بلکہ اس صورت میں اسی کو امام بنانا بہتر ہے۔ بحر الرائق میں ہے: قید کراھۃ امامۃ الاعمیٰ فی المحیط وغیرہ بان لا یکون افضل القوم فان کان افضلھم فھو اولیٰ ۔ مکروہ تنزیہی نا جائز نہیں ہوتا مگر اس سے بچنا بہتر، اور کرنا برا ہے مگر گناہ نہیں، (فتاوی امجدیہ جلد اول ص: 107 مطبوعہ مکتبۂ رضویہ، آرام باغ، کراچی)"۔

امام صاحب کی رہائش

سوال: 22

ہماری مسجد کے امام، صاحبِ حیثیت ہیں، پھر بھی مسجد میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں، جبکہ وہ با آسانی رہائش اور دیگر ضروریات اپنے خرچے پر انجام دے سکتے ہیں، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ادا ہوجائے گی؟، (عبدالمجید بندھانوی، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر امام صاحب کے تقرر کے وقت ان کی شرائط ملازمت میں مکان کی سہولت بھی شامل تھی، جو آپ نے ان کو فراہم کی ہے تو خواہ وہ صاحبِ حیثیت ہوں، ان کا مسجد کے مکان میں رہنا جائز ہے۔ امامت کا منصب چونکہ کل وقتی ہے، کسی بھی وقت امام کی خدمات کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لئے مساجد کے ساتھ عملے کے مکانات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں عرف عام میں بھی اسے لازم وملزوم سمجھا جاتا ہے۔

فقیہ العصر علامہ محمد نور اللہ نعیمی (فتاوی نوریہ جلد 1 ص: 184) لکھتے ہیں: "تکمیل تعمیر

کے بعد ضروریات مسجد میں سے امام اول نمبر میں ہے کیونکہ مسجد کی صرف ظاہری تعمیر کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ اس کی معنوی اور حقیقی تعمیر نہ ہو حتیٰ کہ مسجد کے لئے روشنی پانی وغیرہ کے وسیع تر انتظام سے امام کی ضروریات مقدم ہیں"، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الذی یبدأ من ارتفاع الوقف عمارتہ شرط الواقف ام لاثم الیٰ ماھواقرب الی العمارۃ واعم للمصلحۃ کالامام للمسجد والمدرس للمدرسۃ یصرف الیھم بقدر کفایتھم ثم السراج والبسط کذلک الی اخر المصالح

ترجمہ: "وقف قائم کرنے سے جس چیز کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کا تعمیر کرنا (اور آباد کرنا) ہے، خواہ واقف اس کی شرط لگائے یا نہ لگائے، پھر جو امر (مسجد کی) کی آبادکاری کے لئے ضروری ہے اور مصلحت ومفادِ وقف میں جو زیادہ شامل ہے، (وہ ضروری ہے)، جیسے مسجد کے لئے امام اور مدرسہ کے لئے مدرّس، ان پر ضرورت اورکفایت کے مطابق وقف کا مال خرچ کیا جائے (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:320)"۔ مسجد کے عطیات صدقات نافلہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کا مصرف بننے کے لئے امام کا نادار ہونا شرط نہیں ہے۔ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات اورصدقاتِ واجبہ کا مصرف بننے کے لئے نادار ہونا شرط ہے۔

نماز میں خلافِ ترتیب قراءت کا حکم

سوال: 23

امام صاحب نے عشاء کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اعلیٰ کی آخری چار آیات کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں سورۂ اعلیٰ کی شروع کی تین آیا

ت تلاوت کیں۔نماز کے بعد چند لوگوں نے امام صاحب کو بتایا کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھائی ہے،اس لئے دوبارہ نماز پڑھائیں مگر امام صاحب اور چند اور افراد نے نماز کو جائز قرار دیا۔اور دوبارہ نماز نہیں پڑھائی۔آپ سے التجا ہے کہ برائے کرم مجھے صحیح راہ دکھائیں،عین نوازش ہوگی ،(محمد علی،۴۹۸فیز ااسٹریٹ نمبر۲ ڈیفنس آفیسر ہاؤسنگ اسکیم ۔ملیر کینٹ کراچی)۔

جواب:

نماز میں قرآن ترتیب سے پڑھنا یعنی سورتوں میں ترتیب رکھنا واجب ہے اور یہ احکام قراءت میں سے ہے،احکامِ نماز سے نہیں،اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے لیکن نماز واجب الاعادہ نہیں ہوگی اور اگر بھولے سے پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایک لفظ بھی خلافِ ترتیب زبان سے نکل گیا تو اسی کو پڑھے،اس کو چھوڑنا مکروہ ہے،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

لا بأس أن یقرأ سورۃ ویعیدھا فی الثانیۃوان یقرء فی الاولیٰ من محل وفی الثانیۃ من آخر ولو من سورۃ ان کان بینھما آیتان فأکثر ۔ ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ و أن یقرأ منکوساً الّا اذا ختم فیقرأ من البقرۃ۔ وفی "القنیۃ": قرأ فی الأولیٰ الکافرون وفی الثانیۃ ۔ ألم تر أو تبت۔ ثم ذکر یتم، وقیل یقطع ویبدأ ۔

ترجمہ:"اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک رکعت میں کوئی سورت پڑھی اور پھر دوسری رکعت میں بھی اُسی کو پڑھا،یا پہلی رکعت میں ایک سورت کے ایک مقام سے تلاوت کی اور دوسری رکعت میں دوسرے مقام سے،اگر چہ ان دونوں کے درمیان دو آیات یا زیادہ کا فاصلہ ہو،اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت کا چھوڑنا مکروہ ہے،اور سورت کا الٹا پڑھنا (یعنی دوسری رکعت میں ایسی سورت کا پڑھنا کہ جو ترتیب کے اعتبار سے

پہلی رکعت میں پڑھی گئی سورت سے پہلے ہو) مکروہ ہے، مگر یہ کہ ختمِ قرآن میں پھر سورۂ بقرہ سے تلاوت کی جائے۔اور"قنیہ" میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ کافرون پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۂ الم تر (الفیل) یا تبت (سورۂ لہب)، پھر (دورانِ تلاوت) یاد آیا تو اسی سورت کو مکمل کرے، اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اُسے چھوڑ دے اور پھر (ترتیب کے مطابق دوسری سورت) پڑھے ،(ردالمحتار علی المختار جلد:2،ص:238،مطبوعہ دارا حیاء التراث العربی)"۔

علامہ ابن عابدین شامی (وأن یقرأ منکوساً) کی تشریح میں لکھتے ہیں:بأن یقرأ فی الثانیة سورة أعلی مماقرأ فی الاولیٰ ، لأن ترتیب السور فی القراءة من واجبات التلاوة

۔

ترجمہ:"یعنی دوسری رکعت میں اُس سے پہلے والی سورت تلاوت کرنا، جو پہلی رکعت میں پڑھی تھی (مکروہ ہے)، اس لئے کہ قراءت میں سورتوں کا ترتیب سے پڑھنا واجباتِ تلاوت میں سے ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی مزید لکھتے ہیں:

أفاد ان التنکیس أو الفصل بالقصیرة انما یکرہ اذا کان عن قصد، فلو سھوا فلا کما فی "شرح المنیة"۔ واذا انتفت الکراھة فا عراضہ عن التی شرع فیھا لاینبغی ۔ وفی "الخلاصة ":افتتح سورة وقصدسورة أخری فلما قرأ آیة أو آیتین أراد ان یترك تلك السورة ویفتتح التی أرادھا یکرہ ۔ وفی "الفتح ":ولو کان : أی المقروء حرفاً واحداً۔

ترجمہ:"اس عبارت سے یہ مستفاد ہوا ہے کہ قرآن کو الٹا پڑھنے اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنے کو جو مکروہ لکھا گیا ہے، مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا قصداً

کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر بھول کر ہو تو مکروہ نہیں، اسی طرح ''شرح منیہ'' میں ہے: جب (بھول کر) خلافِ ترتیب سہواً پڑھنے سے کراہت نہیں ہوتی ہو تو جس سورت کو (خلافِ ترتیب) شروع کردیا ہے اسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے کہ: کسی شخص کا ارادہ دوسری سورت پڑھنے کا تھا مگر اس نے کوئی اور سورت شروع کردی اور ایک یا دو آیات پڑھنے کے بعد اگر وہ یہ چاہے کہ اُس سورت کو چھوڑ کر وہی سورت پڑھے جس کا (دل میں) ارادہ تھا ہو تو یہ مکروہ ہے اور ''فتح القدیر'' میں ہے: اگرچہ ایک حرف ہی پڑھا ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص: 239، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام نے پہلی رکعت میں ''قل اعوذ برب الناس'' پڑھی اور دوسری میں ''قل اعوذ برب الفلق'' پڑھی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، اس مسئلہ کا حکم بیان فرمایئے، آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر بھول کر ایسا کیا نماز میں حرج نہیں اور سجدہ سہو نہ چاہئے تھا اور قصداً ایسا کیا تو گناہ گار ہوگا، نماز ہوگئی، سجدۂ سہو اب بھی نہ چاہئے تھا، توبہ کرے، پہلی میں اگر سورۂ ناس پڑھی تھی تو اُسے لازم تھا کہ دوسری میں بھی سورۂ ناس ہی پڑھتا کہ فرض کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھنا صرف خلافِ اولیٰ ہے اور ترتیب اُلٹا کر پڑھنا حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 346، 347 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام نے نماز میں ایک ہی سورت ''الاعلیٰ'' کی آیات بھول کر خلافِ ترتیب پڑھی ہیں، لہٰذا نماز بلا کراہت جائز ہے اور جماعت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراءت کی غلطی سے فسادِ نماز

سوال: 24

نماز کے اندر دورانِ قراءت "عَلٰی اَبَوَیۡکَ" (سورۂ یوسف) کی جگہ "عَلٰی اَبَوَیۡكِ" پڑھ لے تو نماز ہوگی یا نہیں؟ زید نے دورانِ نماز استحوذ علیھم الشیطٰن فانسٰھم ذکراللّٰہ ط اولٰئک حزب الشیطٰن ط الا انّ حزب الشیطٰن ھم الخسرون o (مجادلہ: 19) کے بجائے "اولئک حزب اللہ" پڑھ لیتا ہے، آیا نماز میں کوئی خلل واقع ہوا یا نہیں، اور اگر امام دہرا کر دوبارہ صحیح پڑھ لے تو کیا نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، (یعقوب حنفی، نیا آباد کراچی)۔

جواب:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر نماز میں قراءت کے دوران ایسی غلطی ہوئی ہو، جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ اِعراب کی ایسی غلطی، جس سے معنی میں فساد لازم نہیں آتا، اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور اگر معنی میں اتنا تغیر ہو کہ اس کا اعتقاداً اور قصداً پڑھنا کفر ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اعادہ لازم ہوگا۔ لفظِ اَبَوَیۡکَ (کاف پر زبر) مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مؤنث کے لئے اَبَـــــــوَیۡكِ (کاف کے نیچے زیر) استعمال ہوتا ہے، اس طرح پڑھنے سے نماز ادا ہو جائے گی، احتیاطاً دہرالی جائے تو بہتر ہے۔

سورۂ مجادلہ کی آیت میں اولٰئک حزب الشیطٰن کے بجائے اولئک حزب اللہ پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی اور دہرانا واجب، اگر قصداً پڑھا تو کفر لازم ہوگا، ایسی صورت میں تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے۔ تاہم اگر بھول کر غلط پڑھنے کے بعد واپس دہرا کر صحیح پڑھ لیا تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا گیا کہ امام نے نماز کے اندر سورۃ الحشر کی آیت نمبر 20 میں "ھم الفائزون" کی جگہ "ھم الفاسقون" پڑھ لیا، لیکن اسی وقت آیت کو دوبارہ لوٹا کر صحیح کرلیا۔ نماز ہوگئی یا نہیں؟

وہ جواب میں لکھتے ہیں: نماز میں دورانِ قراءت غلط پڑھنے کے بعد پھر لوٹا کر صحیح طور پر اسے پڑھا تو یہ نماز ہوجائے گی۔ علامہ سید احمد طحطاوی متوفی 1230ھ نے حاشیہ الطحطاوی علی الدرالمختار میں لکھا و فی المضمرات قرأفی الصلوٰۃ بخطأ فاحش ثم اعادو قرأ صحیحا فصلوٰتہ جائزۃ۔

ترجمہ: "اور مضمرات میں ہے کہ اگر کسی نے نماز میں فحش غلطی کی، پھر اسے لوٹا کر صحیح پڑھ لیا، تو اس کی نماز جائز ہے، (کتاب الصلوٰۃ، باب ما یفسد الصلوٰۃ، جلد 1، ص: 267، المکتبۃ العربیہ، کوئٹہ)"۔

قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپس اسی جگہ سے پڑھنا

سوال: 25

ایک آدمی نے نماز شروع کی، اس نے سورہ فاتحہ کے بعد قراءت شروع کی، ایک سورت پڑھی درمیان میں بھول گیا اور اس سورت کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری سورت پڑھنا شروع کردی، کیا اس صورت میں اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟، (بخت ولی، راولپنڈی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں نماز درست ہوگئی اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اگر دونوں سورتوں کے درمیان ایک رکن ادا کرنے کی مقدار تاخیر ہوئی تو سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام مغرب میں

رکوع "لقد صدق اللہ رسولہ" پڑھ رہا تھا جب "فی الا نجیل" تک پڑھ لیا، آیت پارہ 22 کا متشابہ لگا اُس کے بعد "انما یرید اللہ لیذھب" تک پڑھی، پھر جب یاد آیا اُسے چھوڑ کر مقامِ اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدہ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: نماز ہوگئی اور سجدۂ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہوسکتا ہے تو سجدۂ سہو لازم آیا" کما فی الدر المختار" وغیرہ۔ اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہوگئی مگر ناقص ہوئی پھیرنا واجب ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 274، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

ریڈیو، ٹی وی پر آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کرنے کا حکم

سوال: 26

T.V یا Radio یا اس سے ملتے جلتے آلات میں بیانات چل رہے ہوں یا پھر تلاوت ہو رہی ہو تو اگر دورانِ تلاوت آیتِ سجدہ آجائے، یا حضور ﷺ کا اسم گرامی آئے تو کیا سجدہ کرنا یا درود شریف پڑھنا واجب ہے؟۔ احتیاطی طور پڑھ لیتے ہیں لیکن مسئلے کے اعتبار سے وضاحت فرمائیں، (مولانا زاہد اللہ عادل، جامع مسجد اقصیٰ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (لا) تجب (بسماعھا من الصدی والطیر) ومن کل تال حرفا، ولا بالتھجی اشباہ۔

ترجمہ: "آیت سجدہ کی گونج سننے یا پرندے (طوطے) کے آیت سجدہ باربار دہرانے سے (اگر اسے پریکٹس کرادی گئی ہو) سجدۂ تلاوت لازم نہیں آتا ۔اسی طرح کئی افراد

آیتِ سجدہ ایک ایک حرف (الگ الگ) پڑھیں تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، یا اس کے حروف جدا جدا کر کے پڑھے، تو اس کے سننے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے ''زیلعی'' وغیرہ کے حوالے سے پرندے سے اور بازگشت سے آیتِ سجدہ سننے پر سجدۂ تلاوت کے عدمِ وجوب کے قول کو راجح قرار دیا ہے جب کہ ایک ضعیف قول کے مطابق اس صورت میں بھی واجب ہے لیکن علامہ شامی عدمِ وجوب کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں: قلت والاکثر علی تصحیح الاوّل وبہ جزم فی نورالایضاح ۔میں کہتا ہوں کہ پہلا یعنی عدمِ وجوب کا قول اکثر کے نزدیک صحیح ہے اور نورالایضاح میں بھی اس قول کو اختیار کیا گیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج: 2، ص: 509)۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ولاتجب اذاسمعھامن طیر ھوالمختار۔

ترجمہ: ''اور (اگر) پرندے (مثلاً طوطے سے) آیت سجدہ سنی تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، (ج:1، ص:132)''۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر ریڈیو یا ٹی وی پر قاری براہِ راست (Live) تلاوت کررہا ہے تو بالاتفاق سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے، اگر ریکارڈنگ چل رہی ہے تو صحیح ترین قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے، اگرچہ بعض فقہاءِ کرام نے وجوب کا قول کیا ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کہ اگر آپ متوجہ ہوکر تلاوت سن رہے ہیں اور آیتِ سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کر لیتے ہیں تو اس کی افضلیت میں کوئی شک نہیں ہے، اسی طرح ریڈیو، ٹی وی پر رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک سن کر ہر بار درودِ پاک پڑھ لینا افضل ہے، ''عدمِ وجوب'' کا معنی یہ ہے کہ نہ کرنے پر گنہگار نہیں ہوگا۔

مسجد میں جماعتِ ثانی

سوال: 27

ہم یہ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ مسجد میں جماعت کے بعد دوسری جماعت کی جاتی ہے لیکن میں نے مسجد بلال ماڑی پور میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ مسجد میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے، وضاحت فرمایئے، (سید صفی اللہ شاہ، گڑھی نواب، بگرام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: المسجد اذا کان له امام معلوم و جماعة معلومة فی محلة فصلیٰ اهله فیه بالجماعة لا یباح تکرارها فیه باذان ثان اما اذا صلوا بغیر اذان یباح اجماعاً و کذا فی مسجد قارعة الطریق۔

ترجمہ: ''مسجد میں جب امام مقرر ہو اور پابندی سے جماعت ہوتی ہو اور وہاں کے رہنے والے باجماعت نماز پڑھتے ہوں تو ایسی مسجد میں اذانِ ثانی کے ساتھ جماعتِ ثانیہ جائز نہیں ہے البتہ جب وہ بغیر اذان کے جماعت سے نماز ادا کریں تو بالاتفاق دوسری جماعت جائز ہے جیسے شارع عام کی مسجد میں جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 83 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

یکره تکرار الجماعة باذان و اقامة فی مسجد محلة لا فی مسجد طریق أو مسجد لا امام له و لا مؤذن۔

ترجمہ: مسجد محلّہ میں اذان و اقامت کے ساتھ دوسری جماعت مکروہ ہے مگر وہ مسجد جو شارع عام پر ہو یا جس مسجد میں امام و مؤذن مقرر نہ ہوں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

یکرہ تکرار الجماعۃ فی مسجد محلۃ بأذان واقامۃ، الا اذا صلی بھما فیہ اولا غیر اھلہ او اھلہ لکن بمخافتۃ الاذان ، ولو کرر اھلہ بدونھما او کان مسجد طریق جاز اجماعاً کما فی مسجد لیس لہ امام ولا مؤذن ویصلی الناس فیہ فوجاً فوجاً ، فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامۃ علی حدۃ کما فی "امالی قاضیخان"اہ۔

ترجمہ: ''مسجد محلّہ میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر اس صورت میں کہ غیر محلّہ والوں نے وہاں اذان واقامت کے ساتھ اولاً جماعت کرائی ہو یا اہل محلّہ نے آہستہ اذان دیکر جماعت کروائی ہو۔ اور اگر اہل محلّہ نے بغیر اذان و اقامت کے تکرار کی ، تو یہ بالاتفاق جائز ہے یا اگر مسجد شارع ہے تو بالاتفاق تکرار جماعت جائز ہے، جیسا کہ اس مسجد کا حکم ہے، جس کے لئے امام ومؤذن مقرر نہ ہو اور لوگ اس میں گروہ درگروہ نماز ادا کرتے ہوں، تو وہاں افضل یہ ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی اذان واقامت کے ساتھ الگ الگ نماز پڑھے، جیسا کہ ''امالی قاضی خان'' میں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار ، جلد دوم، ص:245-246، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

فقہائے احناف کا معتمد مذہب یہ ہے کہ دوسری جماعت اذان کے اعادہ کے ساتھ مکروہ ہے اور بلا اعادۂ اذان دوبارہ جماعت کرانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ جماعتِ ثانی جماعتِ اولیٰ کی ہیئت پر نہ ہو، علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

عن أبی یوسف أنہ اذالم تکن الجماعۃعلی الھیئۃ الأولی لا تکرہ، والاتکرہ، وھوالصحیح ،وبالعدول عن المحراب تختلف الھیئۃ۔

ترجمہ:امام ابو یوسف سے روایت ہے، جب جماعت پہلی ہیئت پر نہ ہو،تو مکروہ نہیں ورنہ مکروہ ہے یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر ادا کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار ، جلددوم، ص: 246،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے "القطوف الدانیہ لمن احسن الجماعۃ الثانیہ" کے نام سے ایک ہی مسجد میں جماعتِ ثانیہ قائم کرنے کے مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے، اس میں آپ نے تقریباً 12 ممکنہ صورتیں اوران کے احکام بیان فرمائے ہیں،ان میں آج کل کے حالات کی مناسبت سے چند اہم صورتیں یہ ہیں:

(1)جومسجد شارع عام، بس اسٹینڈ ،ریلوے اسٹیشن ،ائیرپورٹ،سرائے وغیرہ کی ہے، جہاں لوگوں کے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں،نئی اذان واقامت کے ساتھ کسی کراہت کے بغیر تکرارجماعت جائز ہے۔

(2)ایک مسجد کسی محلے یا بستی کے لئے ہے ،وہاں کچھ اجنبی لوگ یا مسافر اذان واقامت کے ساتھ جماعت کر کے چلے گئے ،تواہل محلّہ کے لئے دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے،کیوں کہ اس مسجد میں اقامتِ جماعت انہی لوگوں کا حق ہے، جیسے اصولاً تو نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے،لیکن اگرولی کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں نے نمازِ جنازہ پڑھ لی ،تو ولی کو اعادہ کا حق ہے۔

(3) محلے یا بستی کی جماعت میں بعض اہل محلّہ نے اذان کے بغیر جماعت کر لی ،تو اب بھی وہاں اذان واقامت کے ساتھ تکرار جماعت جائز ہے۔

(4) محلے یا بستی کی مسجد میں کچھ لوگوں نے آہستہ اذان دے کر جماعت کرالی ،تو اہل

محلّہ کا دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اذان کا اصل مقصد اعلانِ عام ہے، جو آہستہ اذان اول سے حاصل نہیں ہوا۔

(5) یا امام کسی دوسرے مسلک کا ہو، مثلاً شافعی، اور اس کے بارے میں ظن غالب یا یقین ہو کہ وہ بعض فقہی مسائل میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے کہ مسلک حنفی کے مطابق وضو نہیں ہوتا، مثلاً (الف) وہ پچھنا لگوانے کے بعد نماز کے لئے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ب) جسم کی کسی عضو یا مقام سے خون نکل کر بہہ جانے سے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ج) نماز کے اندر قہقہہ لگا کر ہنسنے سے نماز تو بالاتفاق فاسد ہو جاتی ہے، مگر شوافع کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، اور اب شافعی امام ایسی صورت میں احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کے لئے وضو کا اعادہ نہیں کرتا (د) امام شافعی المسلک ہے اور وہ وضو کرتے وقت احتیاط پر عمل کرتے ہوئے چوتھائی سر یا اس سے زیادہ کا مسح نہیں کرتا بلکہ چند بالو ں کے مسح پر اکتفا کرتا ہے، تو ان صورتوں میں چونکہ احناف کے نزدیک وضو یا ہوتا ہی نہیں ہے یا فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس سے نماز ادا نہیں کی جاسکتی، اب اگر کہیں صورت حال ایسی ہے کہ امام شافعی المسلک ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے مقتدی سب کے سب یا اکثر حنفی ہیں اور وہ مندرجہ بالا مسائل میں احتیاط پر عمل نہیں کرتا، تو حنفی اپنی نماز کی حفاظت کے لئے جماعت ثانی کر سکتے ہیں۔

(6) پہلی جماعت میں امام ایسی قرأت کرتا ہے، جو موجب فسادِ نماز ہے۔

(7) ظن غالب یا یقین کی حد تک معلوم ہے کہ پہلی جماعت کا امام توہین الوہیت ورسالت کا مرتکب ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں: ''اب محل نظر صرف ایک صورت رہی کہ مسجد محلّہ میں اہل محلّہ نے باذان واقامت بروجہ سنت امام موافق المذہب سالم العقیدہ، متقی مسائل داں، صحیح

خواں کے ساتھ جماعت اولیٰ خالی عن الکراہت ادا کر لی، پھر باقی ماندہ لوگ آئے، انہیں دوبارہ اس مسجد میں جماعت قائم کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟، اور ہے تو بکراہت یا بے کراہت، اس بارے میں عین تحقیق وحق وثیق وحاصل انیق ونظر دقیق واثر توفیق یہ ہے کہ اس صورت میں تکرار جماعت باعادہ اذان ہمارے نزدیک ممنوع وبدعت ہے، یہی ہمارے امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب مہذب وظاہر الروایہ ہے، متن متین مجمع البحرین وبحر الرائق علامہ زین میں ہے:

ولا تکررھا فی مسجد محلة باذان ثان۔

''مسجد محلّہ میں دوسری اذان کے ساتھ تکرار جماعت جائز نہیں، (البحر الرائق، باب الامامۃ جلد: اول ،ص: 346)''، (فتاویٰ رضویہ جلد: 7 ص: 125 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

خواتین کے مخصوص ایام کی نمازوں کی قضا نہیں، صرف روزوں کی قضا ہے

سوال: 28

میں نماز اور روزے جو عورتوں کی مجبوری کے باعث قضاء ہوتے ہیں ان کے بارے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ رمضان کے روزے قضاء ہوتے تو میں بعد میں پورے کر لیتی تھی اور نماز قضاء بھی ادا کر لیتی تھی، پھر بھی اگر کوئی کفارہ وغیرہ ہو تو بتا دیں۔ آپ سے ایک مسئلہ یہ بھی میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضاء وغیرہ بھی ادا کر لیتی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری راہنمائی فرمائیں اور کوئی کفارہ وغیرہ ادا کرنا ہے یا نہیں جو بھی بہتر ہے مشورہ عنایت فرمائیں، (والدہ محمد رئیس، 865/4 لیاقت آبا

د،کراچی)۔

جواب:

عورتوں کا ایام مخصوصہ میں روزے رکھنا اور نماز پڑھنا حرام ہے ان دنوں میں نمازیں معاف ہیں ان کی قضاء بھی نہیں، روزوں کی قضاء اور دنوں میں فرض ہے۔

حدیثِ مبارک میں ہے:عن معاذة قالت :سألت عائشةفقلت :ما بال الحائض تقضی الصوم،ولا تقضی الصلاة؟فقالت :أحرورية أنت؟قلت:لست بحرورية، ولكني اسأل.قالت كان يصيبنا ذلك ، فنؤمر بقضاء الصوم،ولا نؤمر بقضاء الصلاة۔

ترجمہ:''معاذہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ حائضہ عورت روزہ تو قضاء کرتی ہے نماز قضاء نہیں کرتی، حضرت عائشہ نے پوچھا کیا تو حروریہ (خوارج میں سے) ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں حروریہ نہیں ہوں محض جاننا چاہتی ہوں، آپ نے فرمایا کہ حیض کے ایام میں ہمیں روزوں کی قضاء کا تو حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا، (صحیح مسلم رقم الحدیث :747)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(منها)ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلا تقضی هكذا فی الكفاية۔

ترجمہ:''(حیض ونفاس کے احکام میں ہے) کہ حیض اور نفاس والی عورت سے نماز ساقط ہو جائے گی اور اس پر اس کی قضاء بھی نہیں۔''کفایہ'' میں اسی طرح ہے،

۔۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:(ومنها)ان يحرم عليهما الصوم

فتقضیا نه هکذا فی الکفایة ۔

ترجمہ:''(حیض ونفاس کے احکام میں ہے)حیض ونفاس والی عورت پر (اس حال میں)روزے رکھنا حرام ہے،اور بعد میں وہ اسکی قضاء کرے گی''کفایہ''میں اسی طرح ہے،(فتاوی عالمگیری جلد 1 ص:38 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

حکم متفق علیہ ہے تمام مسلمانوں کا اسی پر اجماع ہے کہ حیض اور نفاس کی حالت میں عورت پر نماز اور روزہ واجب نہیں ہے۔اور اس پر اجماع ہے کہ اس پر روزہ کی قضاء واجب ہے اور نماز کی قضاء واجب نہیں ہے،ان میں فرق یہ ہے کہ نمازیں زیادہ ہیں اور دن میں بار بار پڑھی جاتی ہیں اس کے برعکس روزے صرف سال میں ایک بار واجب ہوتے ہیں،یہ حکمت ہمیں معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالٰی اور اس کے رسول مکرم ﷺ نے ایامِ حیض ونفاس میں خواتین کے لئے تخفیف فرمادی اور ان ایام کی فوت شدہ نمازوں کی قضا واجب نہیں فرمائی۔باقی احکامِ شرعیہ ''تعبدی''ہوتے ہیں یعنی جیسے اور جس طرح شارع سے ثابت ہیں،انہیں قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے،اگر ان کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری سعادت ہے اور اگر ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل وفہم کی نارسائی ہے۔

آپ نے جو لکھا ہے کہ''حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں''،ادائیگیٔ حج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے ہفرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا ادائیگی کا عزم،زکوۃ کی ادائیگی،حق العبد یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے،تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔

نمازِ قصر میں وطن کی اصطلاح

سوال: 29

زید کراچی سے حیدر آباد اپنی فیکٹری میں روزانہ آتا جاتا ہے، وہاں تین نمازوں کا وقت آتا ہے، آیا زید ان نمازوں میں قصر کرے گا یا نہیں؟ نیز بعض علماء نے کہا ہے کہ زید فیکٹری کے قیام کے دوران قصر نہیں کرے گا کیونکہ یہ وطن ترزیق ہے ،آیا وطنِ ترزیق کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟،(مولانا شبیر حسین ،کراچی)۔

جواب:

کم از کم مسافتِ سفر''جس کا سفر شروع کرنے سے ''قصر'' واجب ہو جاتی ہے، وہ مقدارِ سفر ہے، جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے)اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ مسافت کے پیمانے بھی بدلتے گئے اور پھر مسافت کو پہلے انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا،لہٰذا عہدِ حاضر کے علماء نے مسافتِ قصر کا اندازہ انگریزی میلوں سے قائم کیا۔فقہاء کرام کے اقوال میں مفتیٰ بہ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چوّن میل شرعی ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی اِکسٹھ انگریزی میل دو فرلانگ بیس گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا فقیل احدو عشرون،وقیل ثمانیة عشر، وقیل خمسة عشر،

والفتویٰ علی الثانی لانہ الاوسط۔

ترجمہ: ''بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتیٰ بہ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے، (درمختار: جلد نمبر 2 ص: 526 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)''۔

لہٰذا مفتیٰ بہ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفر شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہونگے۔

وطن کی دو قسمیں ہیں، وطنِ اصلی، وطنِ اقامت، علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

(الوطن الاصلی) ھو موطن ولادتہ او تاھلہ او توطنہ۔

ترجمہ: ''کسی شخص کا وطنِ اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کر لے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قولہ: (الوطن الاصلی) ویسمی بالاھلی و وطن الفطرۃ ح عن القھستانی، قولہ: (او تاھلہ) ای تزوجہ۔

ترجمہ: ''وطنِ اصلی'' کو ''وطنِ اہلی'' اور ''وطن الفطرۃ'' بھی کہا جاتا ہے، اور قہستانی سے منقول ہے کہ (درمختار کی عبارت میں) ''او تـــاھـــلـــہ'' سے مراد شادی کرنا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:2، ص: 535,536، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

عبارۃ عامۃ المشائخ ان الاوطان ثلثۃ، وطن اصلی وھو مولد الرجل او البلد الذی

تأهل به و وطن سفر و قسمى وطن اقامة و هو البلد الذى ينوى المسافر الاقامة فيه خمسة عشر يوما او اكثر و وطن سكنى و هو البلد الذى ينوى الاقامة فيه دون خمسة عشر يوما، و عبارة عامة المحققين من مشائخنا ان الوطن وطنان، وطن اصلى و وطن اقامة ولم يعتبروا وطن السكنى وطنا وهو الصحيح هكذا فى الكفاية۔

ترجمہ: ”عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں، ایک وطنِ اصلی اور یہ اس کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے، اور دوسرا وطنِ سفر اور اسے وطنِ اقامت بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لئے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور تیسرا وطن سکنیٰ ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی صرف دو ہی قسمیں ہیں، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت، اور وہ ”وطن سکنیٰ“ کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح ہے، اور کفایہ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج: 1، ص: 143 مکتبہٗ رشیدیہ، کوئٹہ)“۔

خلاصہ کلام یہ کہ زید فیکٹری میں رہتے ہوئے جو نمازیں جماعت کے ساتھ مقیم امام کے ساتھ ادا کرے گا انہیں پوری ادا کرے گا، اگر انفرادی طور پر پڑھے گا تو قصر کرے گا یعنی چار رکعتی نماز دو رکعت پڑھے گا، اور اسے چاہئے کہ حتی الامکان جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرے تا کہ جماعت کے اجر زائد کے ساتھ امام کی متابعت میں پوری نماز پڑھنے کا موقع ملے۔ وطنِ ترزیق، (یعنی جہاں انسان کا روزگار وابستہ ہو) کی الگ کوئی قسم اس معنی میں نہیں ہے کہ اس پر ”وطنِ اقامت“ سے ہٹ کر کسی

خاص حکم کا اطلاق کیا جاتا ہو۔

اذانِ جمعہ اور نماز کی سعی

سوال: 30

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! جب تمہیں نماز جمعہ کے لئے بلایا جائے تو کاروبار دنیا چھوڑ کر اس کے لئے سعی کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو!۔ اس آیت مبارکہ کی رو سے نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہے، ہمارے ہاں جمعہ کے دن دو اذانیں دی جاتی ہیں، اس سے کون سی اذان مراد ہے، پہلی یا دوسری، کیا عہد رسالت میں بھی دو اذانیں دی جاتیں تھیں۔ (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے: یایھاالذین امنو اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع۔ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔

ترجمہ: ''اے اہل ایمان! جب جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کے لئے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے اگر تم جانتے ہو، (الجمعہ: 9)''۔

قرآن مجید کی ایک مکمل سورت یوم جمعہ کے نام سے منسوب ''سورۃ الجمعہ'' ہے، یہ دو رکوعات پر مشتمل ہے، اس کے دوسرے رکوع میں ''سعیِ جمعہ'' کا حکم ہے، ''سعی'' کی تفسیر میں چار اقوال ہیں: (1) دل سے نیت کرنا (2) نماز جمعہ کی تیاری کرنا یعنی غسل کرنا (3) اذان کی آواز پر لبیک کہنا (4) نماز کی طرف چل پڑنا، مگر بھاگتے ہوئے نہیں وقار کے ساتھ۔

امام فخر الدین محمد بن عمر ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:
""سعی" کے معنی چل پڑنے کے ہیں، دوڑنے کے نہیں ہیں، نیت سے بھی سعی ہوتی ہے (یہ عمل قلب ہے)، اور کسی کام کی طرف متوجہ ہو جانے کا نام بھی "سعی" ہے، لیکن یہاں علماء کی ایک جماعت کے نزدیک "سعی" سے مراد عمل ہے، امام مالک اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔
سورۃ اللیل، آیت: 4 میں ہے: ان سعیکم لشتیٰ، "تمہارا عمل مختلف ہے"۔
اور رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے: "جب تم نماز کی طرف آؤ تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ، بلکہ سکون (ووقار) کے ساتھ آؤ، اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے لئے تشریف لاتے تو نرم روی سے تشریف لاتے، (تفسیر کبیر، ج: 10 ص: 542، دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔
ذکر اللہ کی تفسیر میں تین اقوال ہیں: (1) خطبہ میں امام کی نصیحت (2) نماز کا وقت (3) نماز۔ رہا یہ سوال کہ وہ کون سی اذان ہے، جس کے سننے کے بعد نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہو جاتی ہے، اور خرید وفروخت حرام ہو جاتی ہے؟۔
امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ انصاری قرطبی متوفی 1273ھ لکھتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں باقی نمازوں کی طرح جمعہ کے لئے بھی ایک ہی اذان دی جاتی تھی، اور یہ اذان اس وقت دی جاتی تھی جب رسول اللہ ﷺ ممبر پر (خطبہ دینے کے لئے) بیٹھ جاتے تھے، حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور کوفہ میں حضرت علی کے دور میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، جب مدینہ منورہ میں آبادی زیادہ ہو گئی تو حضرت عثمان نے وقت زوال (یعنی ظہر کے وقت کی ابتدا) سے ایک اذان کا اضافہ فرمادیا، یہ اذان مقام "زوراء" پر ان کے مکان پر دی جاتی تھی، جو بازار میں تھا اور منارے کی طرح

بلند تھا،لوگ (یہ پہلی اذان) سن کر چل پڑتے ،پھر جب حضرت عثمان منبر پر بیٹھتے تو رسول اللہ ﷺ کے مؤذن (دوسری) اذان دیتے اور آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔آگے چل کر لکھتے ہیں علامہ ماوردی نے (حضرت عثمان کی اضافہ کردہ) اس اذانِ اول کو بدعت قرار دیا ہے ،لیکن حضرت عثمان نے شہر کے پھیلاؤ اور آبادی کی کثرت کی بناپر ایسا کیا تاکہ لوگ تیار ہوکر خطبہ کے لئے پہنچ سکیں،حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بازار میں مسجد کی طرف جانے کے لئے اعلان کرنے کا حکم دیا تھا،تاکہ لوگ کاروبار چھوڑ کر مسجد کی جانب چل پڑیں اور جوں ہی لوگ مسجد میں جمع ہوتے (تو خطبے کے وقت) اذان دلاتے تھے،(الجامع لاحکام القرآن،ج:18،ص: 100،مکتبۃ الغزالی،دمشق)۔

نوٹ:عہد رسالت مآب ﷺ میں چونکہ مدینہ منورہ کی آبادی محدود تھی،اس لئے اذان خطبہ سنتے ہی لوگوں کا پہنچنا آسان تھا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی متوفی:1270ھ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ:''(کہ جب حضرت عثمان نے اذانِ اول کا اضافہ فرمایا)تو کسی نے آپ کو ملامت نہیں کیا،(یعنی اس سے ثابت ہوا کہ اس اذان اول کے اضافہ کو تمام صحابہ کرام نے تراویح کی جماعت کی طرح بدعتِ حسنہ تسلیم کرلیا تھا،کیونکہ اس کا مقصد،شریعت کی منشاء کا احسن وکامل طریقے سے حصول تھا)،روح المعانی،ج:28،ص:98،داراحیاءالتراث العربی،بیروت)''۔

اسی مقام پر آگے چل کر علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک صحیح ترین یہ ہے کہ(جس اذان کو سننے پر) سعی جمعہ واجب ہوتی ہے،اس سے مراد اذان اول ہے،کیونکہ اس کا مقصد نماز جمعہ'' کی تیاری کا''اعلان

ہے"۔

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی 1088ھ لکھتے ہیں:

"(ووجب السعی الیھا وترک البیع)-------(بالاذان الاول)فی الاصحّ وان لم یکن فی زمن الرسول ﷺ بل فی زمن عثمان"۔

ترجمہ:"زیادہ صحیح یہ ہے کہ پہلی اذان کے بعد جمعہ کے لئے سعی کرنا واجب ہے،اگرچہ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی،حضرت عثمان کے زمانے میں شروع ہوئی"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

"وحاصلہ ان السعی نفسہ فرض والواجب کونہ فی وقت الاذان الاول"۔

ترجمہ:"اس (عبارت کا) حاصل یہ ہے کہ فی نفسہ"سعی جمعہ"فرض ہے اوراس کاوجوب اذان اول کےوقت سےشروع ہوتا ہے"،آگے چل کرلکھتے ہیں:قال فی "شرح المنیہ): واختلفوافی المراد بالاذان الاول:فقیل الاول باعتبار المشروعیۃ وھوالذی بین یدی المنبرلانہ الذی کان اولافی زمنہ علیہ الصلاۃ والسلام وزمن ابی بکروعمر حتیٰ احدث عثمان الاذان الثانی علی "الزوراء" حیث کثر الناس۔ والاصح انہ الاول باعتبار الوقت ،وھوالذی یکون علی المنارۃ بعد الزوال"۔

"شرح المنیہ"میں کہا:فقہاءکااس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اذانِ اوّل کونسی ہے،ایک قول یہ ہے کہ اس سے وہ اذان مراد ہے جومشروعیت کےاعتبارسےاوّل ہےاوریہ وہ ہے جومنبر کے سامنے دی جاتی ہے،کیونکہ رسول اللہ ﷺاورحضرت ابوبکراورحضرت

عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں یہی اذانِ اول تھی، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب لوگوں کی آبادی بڑھ گئی تو آپ نے مقام "زوراء" پر دوسری اذان شروع کرائی اور صحیح ترین قول یہ ہے کہ وقت کے اعتبار سے یہی (مقام زوراء والی اذان) اول ہے، جو زوال کے بعد منارہ پر دی جاتی تھی، (ردالمختار ،ج:3،ص:35،داراحیاءالتراث العربی، بیروت)"۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عہدرسالت ﷺ اور عہدِ شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما)میں جمعہ کے لئے ایک ہی اذان دی جاتی تھی جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت اس کے سامنے دی جاتی تھی، اوراسی وقت سے جمعہ کے لئے سعی واجب ہوجاتی تھی اور خرید وفروخت حرام ہو جاتی تھی۔لیکن عہدِ عثمان رضی اللہ عنہ میں جب جمعے کے لئے ابتدائے وقت میں مقام "زوراء" پر پہلی اذان شروع ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر نکیر یا اختلاف ثابت نہیں ہے،لہٰذا یہ بدعتِ حسنہ قرار پائی۔

(3)اس پر اب تعامل ہے اوراسی سے جمعہ کے لئے سعی کا وجوب اور کاروبار کا ترک واجب ہو جاتا ہے،آبادی کے پھیلاؤ اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے اگر اذان ثانی سے سعی کے وجوب اور کاروبار کے ترک کرنے کا قول کیا جائے تو اکثر صورتوں میں جمعہ کے خطبۂ واجب کا استماع (سننا) چھوٹ جاتا ہے اور بعض صورتوں میں نماز کی تکبیر تحریمہ یا ایک رکعت بھی چلی جاتی ہے۔اور حدیث پاک میں ہے کہ امام جب خطبے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسجد کے دروازے پر فرشتے جن نورانی رجسٹروں میں آنے والے نمازیوں کے اسماء ترتیب کے ساتھ لکھتے ہیں اوراسی ترتیب کے مطابق ان کے اجر کے درجات ہیں، وہ رجسٹر بند ہو جاتے ہیں اور دیر سے آنے والے نمازی نورانی رجسٹروں میں ناموں کے اندراج سے محروم رہ جاتے ہیں۔لہٰذا اگر چہ اذان

ثانی کے ساتھ "سعیِ جمعہ" کے وجوب پر تو سب کا اتفاق ہے، لیکن ہمارے بعض فقہائے احناف نے اذانِ اول سے "سعیِ جمعہ" کے وجوب کے قول کو اَصَحّ (صحیح ترین) قرار دیا ہے، لوگوں کی سستی اور غفلت کو دیکھتے ہوئے عمل کے لئے یہی بہتر ہے، اگرچہ دوسرا قول بھی صحیح ہے۔

خطبۂ جمعہ کے دوران بیٹھنے کی ہیئت

سوال: 31

خطبۂ جمعہ وعیدین میں پہلے خطبہ کے دوران ہاتھ باندھ کر بیٹھنا اور دوسرے خطبہ میں ہاتھ کھول کر (یعنی بحالتِ تشہّد) بیٹھنا، شرعی اعتبار سے اس کی کیا حقیقت ہے؟، (حافظ غلام مرتضٰی سیالوی، ضلع اٹک)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: واذا شھد الرجل عند الخطبۃ ان شاء جلس محتبیاً او متربصاً او کما تیسّر لانہ لیس بصلاۃ عملاً و حقیقۃً کذا فی المضمرات ۔ ویستحب ان یقعد فیھا کما یقعد فی الصلاۃ کذا فی المعراج الدرایۃ ۔

ترجمہ: "جب کوئی شخص دورانِ خطبہ (مسجد میں) آئے تو (اسے رخصت ہے) چاہے تو اکڑوں بیٹھے (یعنی اس طرح کہ ایک تہبند میں ہو اور دونوں گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیا ہوا ہو) یا آلتی پالتی مار کر (چار زانوں) بیٹھے یا جس ہیئت میں وہ آسانی محسوس کرے، کیونکہ خطبہ عملاً اور حقیقۃً نماز نہیں ہے، "مضمرات" میں اسی طرح ہے، اور مستحب یہ ہے کہ دورانِ خطبہ اسی طرح بیٹھے جیسے نماز میں (حالتِ تشہّد) میں بیٹھتا ہے، "معراج الدرایہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری،

جلد 1، ص: 148، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔ بعض لوگ خطبۂ اولیٰ کو حالت تشہد میں ہاتھ باندھ کر بیٹھے ہوئے سنتے ہیں، یہ کہیں سے ثابت نہیں ہے۔بس دونوں خطبوں کے دوران حالت تشہد میں بیٹھنا مستحب اور کسی بھی دوسری مناسب ہیئت پر بیٹھنا جائز ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ دو خطبوں کے درمیان امام ومقتدی بغیر ہاتھ اٹھائے یا ہاتھ اٹھا کر دعا کریں یا نہ کریں ،تو امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:
مختصراً بالجملہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دعائے مذکور خطیب کے لئے مطلقاً اور سامعین کے لئے بالاتفاق جائز ،اور مذہب امام شافعی وقول امام ابی یوسف پر ان کے لئے زبان سے بھی قطعاً اجازت اور ارشاد امام کی ایک تخریج پر مکروہ ،دوسری پر جائز ،ائمہ فتویٰ نے دونوں کی تصحیح کی ،تو احد الصحیحین (یعنی دونوں صحیح روایتوں) پر دعائے مذکور امام ومقتدین سب کو دل وزبان ہر طرح سے باتفاق مذہبین حنفی وشافعی مطلقاً جائز ومشروع اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ جب ترجیح مختلف متکافی (برابر درجے کی ہو) ہو تو مکلّف کو اختیار ہے کہ ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے، اصلاً محل اعتراض وانکار نہیں ،بحر الرائق ودر مختار میں ہے: متیٰ کان فی المسئلۃ قولان مصححان جاز القضاء والافتاء باحدھما۔ ترجمہ:"جب کسی خاص مسئلے میں دو ایسے قول ہوں جن میں سے ہر ایک کو صحیح قرار دیا گیا ہو،تو ان میں کسی بھی ایک کے جواز پر فیصلہ دینا اور فتویٰ دینا دونوں جائز ہیں ،(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 490، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

عیدین ونمازِ جمعہ میں خطبہ سننا واجب ہے، ہر وہ کام جو نماز میں منع ہے، دورانِ خطبہ بھی جائز نہیں ،سماعت کے لئے توجہ اور یکسوئی لازم ہے۔امام مسلم اپنی صحیح میں حدیث

نقل فرماتے ہیں:عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ:من توضأ فأحسن الوضوء ثمّ أتی الجمعۃ فاستمع و أنصت غفر لہ مابینہ وبین الجمعۃ وزیادۃ ثلاثۃ أیام و من مسّ الحصی فقد لغا ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے وضو کیا اور اچھی طرح سے وضو کیا، پھر جمعہ پڑھنے آیا اور خاموشی سے خطبہ سنا، اِس جمعہ سے لے کر گذشتہ جمعہ تک کے اُس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، (اس کے علاوہ) مزید تین دن کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں اور فرمایا: جس شخص نے کنکریاں چھوئیں اس نے لغو کام کیا، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس حدیث کی شرح میں علامہ یحیٰی بن شرف النووی لکھتے ہیں: قولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (و من مس الحصا فقد لغا)فیہ النھی عن مس الحصا وغیرہ من أنواع العبث فی حالۃ الخطبۃ وفیہ اشارۃ الی اقبال القلب والجوارح علی الخطبۃ ۔

ترجمہ:''حضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:اور جس نے کنکریوں کو چھوا، اس نے لغو کام کیا۔اس فرمانِ رسول ﷺ میں اس طرف اشارہ ہے کہ خطبے کے دوران انسان اپنے قلب اور ظاہری حالت سے مکمل خطبے کی طرف متوجہ ہو، (صحیح مسلم بشرح الامام النووی، جلد 2، الجزء السادس، ص: 147,146 مطبوعہ: مکتبۃ الغزالی، دمشق)''۔

سماعِ خطبہ کے متعلق احادیث میں سخت تاکید وارد ہوئی ہے: عن ابن شھاب قال: أخبرنی سعید بن المسیب : ان ابا ھریرۃ أخبرہ : انّ رسول اللّٰہ ﷺ قال: "اذا قلت لصاحبك یوم الجمعۃ أنصت ۔ والامام یخطب ۔ فقد لغوت "۔

ترجمہ:''ابن شہاب فرماتے ہیں کہ سعید بن مسیّب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب جمعہ کے دن خطبۂ جمعہ کے

دوران تُو نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ: چپ رہو، تو تُو نے لغو کام کیا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 934)"۔

عن علی قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قال لصاحبہ یوم الجمعۃ صہ فقد لغا و من لغا فلیس فی جمعتہ تلک شیء۔

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعے کے دن اپنے ساتھی سے کہا "چپ رہو" تو اُس نے لغو کام کیا اور جس نے لغو کام کیا اس کے لئے اس جمعہ میں کچھ اجر نہیں، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث:)"۔

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ: من یتکلم یوم الجمعۃ والامام یخطب فھو کمثل الحمار یحمل اسفاراً والذی یقول لہ انصت لیس لہ جمعۃ۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن اُس وقت کلام کرے، جب امام خطبہ دے رہا ہو، تو وہ اس گدھے کی مانند ہے، جس پر کتابیں لدی ہوں، اور جو اس سے کہے "چپ ہو جا" اس کا جمعہ نہیں، (مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، ص: 230، مطبوعہ: دار الفکر، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے دورانِ خطبۂ جمعہ بات کرنے یا کوئی عمل کرنے سے متعلق سوال ہوا تو آپ نے جواب میں لکھا:

"عامۂ کتب مذہب میں صاف تصریح ہے کہ جو فعل نماز میں حرام ہے، خطبہ ہونے کی حالت میں بھی حرام ہے، خلاصہ و عالمگیریہ و متن و شرح تنویر کی عبارات خزانۃ المفتیین بعینہا عبارتِ خلاصہ ہے اور اسی سے بحر و حاشیۃ البحر للعلامۃ الشامی میں بہ نقل نہر

ماثور، وجیز کردری میں ہے: مایحرم فی الصلوٰۃ یحرم فی الخطبۃ کالاکل والشرب حال الخطبۃ۔ ترجمہ: ''جو کچھ نماز میں حرام ہے، خطبہ میں بھی حرام ہے، مثلاً خطبہ کے دوران کھانا اور پینا''۔

شرح منیہ امام محمد ابن امیر الحاج حلبی میں ہے:

کما یکرہ الکلام بانواعہ یکرہ ما یجری مجراہ من کتابۃ ونحوھا مما یشغل من سماعھا حتی ان فی شرح الزاھدی ویکرہ لمستمع الخطبۃ مایکرہ فی الصلوٰۃ کالاکل والشرب والعبث والالتفات۔

ترجمہ: ''جیسے ہر طرح کی گفتگو منع ہے ویسے ہی اس کے قائم مقام مثلاً کتابت وغیرہ جو خطبہ کے سماع میں خلل ڈالے حتی کہ شرح الزاہدی میں ہے کہ خطبہ کے سامع کے لئے ہر وہ شے مکروہ ہے جو نماز میں مکروہ ہے مثلاً کھانا پینا، عبث فعل اور کسی طرف متوجہ ہونا وغیرہ۔ اسی طرح علامہ سید احمد مصری نے حاشیۂ شرح نورالایضاح میں بحوالۂ شرح الکنز للعلامۃ عمر بن نجیم وشرح القدوری لمختار بن محمود سے نقل کیا، شرح نقایہ علامہ محمد قہستانی میں ہے: کما منع الکلام منع الاکل والشرب والعبث والالتفات والتخطی وغیرھا مما منع فی الصلوٰۃ کما فی جلابی۔ ترجمہ: ''جس طرح (دورانِ خطبہ کلام منع ہے) اسی طرح کھانا پینا عبث کام، کسی اور طرف متوجہ ہونا اور گردن پھلانگنا جو کہ نماز میں ممنوع ہیں جیسا کہ جلابی میں ہے۔ متن وشرح علامہ حسن شرنبلالی میں ہے: (کرہ لحاضر الخطبۃ الاکل والشرب) وقال الکمال یحرم (والعبث والالتفات) فیجتنب مایجتنبہ فی الصلوٰۃ۔ ترجمہ: ''(خطبہ میں حاضر شخص کے لئے کھانا پینا مکروہ ہے) کمال نے کہا حرام ہے (بے فائدہ کام اور کسی اور طرف متوجہ ہونا) پس ہر شے سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے

نماز میں اجتناب کیا جاتا ہے۔ غنیۃ شرح منیہ للعلامہ ابراہیم الحلبی میں ہے:

الاستماع والانصات واجب عندنا وعند الجمهور حتی انه یکره قراءة القرآن ونحوها وردالسلام وتشمیت العاطس وکذا الاکل والشرب وکل عمل۔

ترجمہ:"خطبہ سننا اوراس کی طرف متوجہ ہونا ہمارے اور جمہور علماء کے نزدیک واجب ہے حتیٰ کہ اس کے دوران قراءتِ قرآن وغیرہ، سلام کا جواب، چھینک کا جواب مکروہ ہے اوراسی طرح کھانا پینا اور ہر عمل کا یہی حکم ہے،(فتاویٰ رضویہ، جلد 8،ص: 330,331،مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن،لاہور)"۔

نمازِ جمعہ کے بعد طویل دعا

سوال: 32

جمعہ کی نماز کے فوراًبعد کچھ لوگ سنتیں پڑھنے کھڑے ہوجاتے ہیں اورامام صاحب دعا مانگ رہے ہوتے ہیں اور جولوگ نمازِ جمعہ کے فوراًبعد نکلنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی رکاوٹ بنتے ہیں،ایسے لوگوں کے لئے کیا حکم ہے؟نیز امام صاحب جو اتنی لمبی دعا کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟،(یاسر رحمان،ضلع کوٹلی تحصیل نکیال،آزاد کشمیر)۔

جواب:

وہ فرض نمازیں،جن کے بعد سنتیں ہیں،یعنی ظہر وجمعہ ومغرب وعشاء مختصر دعا کرنی چاہئے،امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ"بعد نمازِ جمعہ انحرافِ قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑکر مناجات کرنا جائز ہے یانہیں"۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا:"امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سنت ہے اور

اس کا ترک یعنی بعد سلام قبلہ رُو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا ومناجات بھی بالاجماع جائز ہے مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر وجمعہ ومغرب وعشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگرچہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔ اقول ویمکن الاستیناس له بقوله عزو جل "واذا کانوا معه علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستأذنوہ "فان فراغه من الدعاء بعد اذنامنه دلالة بذلك العرف جار۔

ترجمہ: "(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی سے استدلال ممکن ہے "اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں"، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ کرنی چاہئے اگرچہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر وعصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: "حدیث میں ہے حضور پُرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات، فتعرضوا له لعله ان یصیبکم نفحة منھا فلا تشقون بعدھا ابدا۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر عن محمد بن مسلمة رضی اللہ تعالیٰ عنه۔ ترجمہ: "بیشک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ایام زندگی میں کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں، جن میں رحمتِ باری تعالیٰ کے جھونکے آتے ہیں، تو انہیں پانے کی

تدبیر کرو، شاید ان میں سے کوئی مبارک لحہ تمہیں نصیب ہو جائے تو پھر کبھی بدبختی تمہارے پاس نہ آئے ،اسے طبرانی نے کبیر میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

اور خود حدیث نے اُن اوقات میں سے ایک وقت ''اجتماعِ مسلمین'' کا نشان دیا کہ ایک گروہِ مسلمان جمع ہو کر دعا مانگے ،کچھ عرض کریں ،کچھ آمین کہیں ، کتاب المستدرک علی البخاری و مسلم میں ہے :عن حبیب بن مسلمة الفهری رضی اللہ تعالیٰ عنه و کان مستجاب الدعوات قال سمعت رسول الله ﷺ یقول لا یجتمع ملأ فیدعوا بعضهم الا اجابهم الله۔

ترجمہ: ''حبیب بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ مستجاب الدعوات تھے،فرماتے ہیں: میں نے حضور پرنور سید عالم ﷺ کو فرماتے سنا کہ جب بھی کوئی جماعتِ مسلمین جمع ہو اور ان میں سے بعض دعا کریں اور بعض آمین کہیں ،تو اللہ عزوجل ان کی دعا قبول فرمائے گا۔

علماء نے مجمعِ مسلمین کو اوقاتِ قبولیتِ دعا میں شمار کیا ہے۔حصن حصین میں ہے :واجتماع المسلمین یعنی مسلمانوں کا اجتماع اوقاتِ اجابت سے ہونا حدیثِ صحاح ستہ سے مستفاد ہے ،علامہ علی القاری شرح میں فرماتے ہیں: ثم کل مایکون الاجتماع فیه اکثر کالجمعة و العیدین و عرفة یتوقع فیه رجاء الا جابة اظهر۔ یعنی جس قدر مجمع کثیر ہوگا جیسے جمعہ و عیدین وعرفات میں ،اسی قدر قبولیت دعا کی امید بہت زیادہ ہوگی ، (فتاویٰ رضویہ جلد 8،ص:522,523 رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)''۔

لہٰذا جہاں پہلے سے یہ امر معروف ومعتاد ہے کہ جمعہ کے بعد اجتماعی دعا ہوتی ہے،

وہاں لوگوں کی اکثریت کا احترام کرنا چاہیے۔ آخر خطبہ جمعہ وعید کے وقت سنتیں یا نوافل پڑھنے کی ممانعت بھی اسی احترام کے سبب مشروع ہے۔ اور اگر دعا کرنے والوں کے درمیان سے کوئی شخص کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر جانا چاہے، تو اس کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے، البتہ اگر سنتیں وہیں پڑھنی ہیں تو اختتامِ دعا کا انتظار کرلے۔

کپڑا لٹکا کر چلنے یا گھسیٹے ہوئے چلنے کا حکم

نماز میں "کفِ ثوب، جرِ ثوب اور اسبالِ ازار" کا حکم

محترم جناب مفتی صاحب روزنامہ ایکسپریس کی وساطت سے دو اہم مسائل پیش کرتا ہوں، جن کی معاشرے میں اصلاح کرنا فرضِ عین ہے۔

سوال: 33

دورانِ نماز اور علاوہ نماز شلوار کو ٹخنے سے دوہرا اور پتلون پہنی ہو تو پائنچوں سے دہرا کرنا شرعی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیونکہ ٹخنوں کو ڈھانپنا دوزخ کی طرف لے جاتا ہے، اگر شلوار یا پتلون لمبی ہو تو کیا کیا جائے حالانکہ اس کی نیت میں تکبر بھی نہیں ہے ازراہِ کرم حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، (حاجی عبدالشکور میر، راولپنڈی)۔

جواب:

نوٹ: اس مسئلے میں بعض حضرات بہت زیادہ شدّت کرتے ہیں اور دوسروں سے نفرت اور تعلّی کرتے ہیں، یعنی اپنے تقوے اور پارسائی کا زیادہ ہی کچھ اظہار کرتے ہیں، خالص شرعی و دینی مسئلے میں توازن اور راہِ اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں، اس کے نتیجے میں بعض لبرل مزاج کے لوگ اسلام اور اہلِ دین پر طعن کرتے ہیں کہ ان کا

فہم اسلام فقط نماز میں شلوار و پائنچے کی لمبائی چیک کرنے تک ہے، گردو پیش میں جو اور بڑی برائیاں، ظلم وتعدّی، استحصال، لوٹ کھسوٹ، ناجائز نفع خوری، رشوت خوری حقوق انسانی کی پامالی، قتل وغارت اور دہشت گردی انہیں نظر نہیں آتی، نہ ہی وہ اِن قومی اور معاشرتی جرائم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، خاص طور وہ دعوت وتبلیغ کی جماعتیں جنہوں نے نماز کو اسلام کا ایک اساسی رکن سمجھنے کے بجائے کل دین سمجھ لیا ہے اور دین کے باقی شعبہ جات کی دعوت وتبلیغ توجیہات اور ترجیحات کا محور نہیں ہیں۔

لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک بار پھر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو مع دلائل (احادیث وفقہ) تفصیل سے بیان کردیا جائے، کسی شخص کو خود شارع بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، کسی معاملے میں جو صحیح دینی مسئلہ ہے وہ بیان کردینا چاہیے، اپنی طرف سے کسی مسئلے کی شدت یا حرمت میں اضافہ درست نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک شلوار کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، تمام پر ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ عن النبی ﷺ قال: "وما اسفل من الکعبین من الازار ففی النار"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ازار کا جتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو وہ جہنم میں ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5787)''۔

عن ابی هریرۃ: ان رسول اللہ ﷺ قال: "لاینظر اللہ یوم القیامۃ الی من جر ازارہ بطرا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف قیامت کے روز نظر بھی نہیں فرمائے گا، جو ازراہ تکبر اپنی ازار (تہبند) کو گھسیٹ کر چلتا ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5788)''۔

عن ابی ھریرۃ قال: بینما رجل یصلی مسبلاً ازارہ اذ قال لہ رسول اللہ ﷺ: "اذھب فتوضا"، فذھب فتوضا فقال لہ رجل: یارسول اللہ، مالک امرتہ ان یتوضا؟ قال: "انہ کان یصلی وھومسبل ازارہ، وان اللہ جل ذکرہ لایقبل صلاۃ رجل مسبل ازارہ"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں ایک شخص تہبند لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا، نبی ﷺ نے اس سے فرمایا: جا کر وضو کرو، اس نے جا کر وضو کیا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے اس کو وضو کرنے کا حکم کیوں دیا؟ آپ نے فرمایا: یہ شخص تہبند لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں کرتا، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 638)''۔

تکبر کے بغیر یا اتفاقاً ٹخنے کے نیچے ازار لٹکنے کی رخصت سے متعلق احادیث:

عن سالم بن عبداللہ، عن ابیہ رضی اللہ عنہ، عن النبی ﷺ قال: "من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ"۔ قال ابوبکر: یارسول اللہ، ان احد شقی ازاری یسترخی، الا ان اتعاھد ذلک منہ؟ فقال النبی ﷺ: "لست ممن یصنعہ خیلاء"۔

ترجمہ: ''حضرت سالم بن عبداللہ اپنے والد حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو تکبر کے باعث کپڑا گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا۔ حضرت ابوبکر عرض گزار ہوئے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری چادر کا ایک سرا غیر ارادی طور پر لٹک جاتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ ہمہ وقت ادھر متوجہ رہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کے باعث ایسا کرتے ہیں، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5784)"۔

عن ابی بکرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال: خسفت الشمس ونحن عندالنبی ﷺ، فقال یجرثوبہ مستعجلا، حتی اتی المسجد، وثاب الناس فصلی رکعتین فجلی عنھا، ثم اقبل علینا، وقال: "ان الشمس والقمر ایتان من ایات اللّٰہ، فاذا رأیتم منھا شیئا فصلُّوا، وادعوا اللّٰہ حتی یکشفھا"۔

ترجمہ: "حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورج کو گرہن لگا اور ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ آپ جلدی سے کپڑا گھسیٹتے ہوئے اُٹھے یہاں تک کہ مسجد میں پہنچ گئے اور لوگ بھی جمع ہو گئے تو آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جب تم انہیں گہن لگا ہوا دیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو، یہاں تک کہ وہ پورا نظر آنے لگے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5785)"۔

حدثنا شعبۃ قال: لقیت محارب بن دثار علی فرس، وھو یاتی مکانہ الذی یقضی فیہ، فسألتہ عن ھذا الحدیث فحدثنی فقال: سمعت عبد اللّٰہ بن عمرَرضی اللّٰہ عنھما یقول: قال رسول اللّٰہ ﷺ: "من جرّثوبہٗ مُخیلۃ لم ینظرِاللّٰہ الیہ یومَ القیامۃ"۔ فقلت لمحارب: اذکرازارہ؟ قال: ماخص ازاراً

ولا قميصا۔ تابعه جبلة بن سحيم، وزيد بن اسلم، وزيد بن عبدالله، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ۔ وقال الليث ، عن نافع، عن ابن عمر: مثله۔ وتابعه موسیٰ بن عقبة، وعمربن محمد، وقدامة بن موسی، عن سالم، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ: "من جرثوبهٔ خيلاء"۔

ترجمہ: ''شعبہ کا بیان ہے کہ میں مُحارب بن دثار (قاضی کوفہ) سے ملا جبکہ وہ گھوڑے پرسوار ہوکر عدالت کی طرف جارہے تھے،تو میں نے ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کوفرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ازراہ تکبر کپڑا گھسیٹ کر چلے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا، میں نے مُحارب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے ازار کا ذکر کیا؟ فرمایا کہ ازار یا قمیص کی تخصیص نہیں کی۔ جبلہ بن سحیم زید بن اسلم اور زید بن عبداللہ،حضرت ابن عمر نے نبی کریم ﷺ سے اسی کی روایت کی ہے۔موسیٰ بن عقبہ،عمر بن محمد،قدامہ بن موسیٰ، سالم،حضرت ابن عمر نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ جو اپنا کپڑا بطور تکبر گھسیٹ کر چلے گا،(صحیح بخاری رقم الحدیث: 5791)''۔

عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: "من جرثوبة خيلاء، لم ينظر الله اليه يوم القيامة"۔ فقال ابو بكر: ان احدشقی ثوبی يسترخی،الا ان اتعاهد ذلك منه؟ فقال رسول الله ﷺ: "انك لست تصنع ذلك خيلاء"۔ قال موسیٰ: فقلت لسالم: اذكرعبد الله : من جرازاره؟ قال لم اسمعه ذكر الا ثوبه۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا:۔جو ازراہِ تکبر کپڑا گھسیٹے گا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا۔حضرت ابو بکر کہنے لگے کہ میرے کپڑے کا ایک کونہ عموماً لٹک جاتا ہے،لہٰذا اب میں احتیاط کیا کروں گا،پس رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ تم ایسا ازراہِ تکبر نہیں کرتے۔موسیٰ بن عقبہ نے سالم سے دریافت کیا کہ کیا حضرت عبداللہ بن عمر نے ''من جرّ ازارہ'' (یعنی جو شخص اپنی تہبند کو گھسیٹے) کہا ہے؟جواب دیا:میں نے یہ الفاظ نہیں سنے، بلکہ میں نے تو یہ سنا کہ انہوں نے ''ثوبہٗ'' (یعنی مطلقاً کپڑا گھسیٹے ہوئے چلنے کی بابت) کہا ہے(صحیح بخاری رقم الحدیث:3665)۔

عن ابن عباس قال: أُمر النبیﷺ أن یسجد علی سبعة، ونهی أن یکف شعرہ وثیابه۔قال ابو الربیع:علیٰ سبعة أعظم، ونهی أن یکف شعرہ وثیابه، الکفّین والرکبتین والقدمین والجبهة۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے سات (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا اور نماز کی حالت میں بال سنوارنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا ہے،ابوالربیعہ کی روایت میں سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے اور بالوں کو سنوارنے اور کپڑوں کو سمیٹنے کی ممانعت کا ذکر ہے،وہ سات ہڈیاں یہ ہیں ،دو ہتھیلیاں،دو گھٹنے،دونوں قدم اور پیشانی،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:1076)۔

اس حدیث میں ''کفِ ثوب'' سے ممانعت کا حکم ہے۔ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا،پتلون کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے اوپر موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں،اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں،اس پر بھی ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث

مبارک اور دیگر احادیث کی روشنی کی رو سے ممنوع ہے۔

علامہ عینی لکھتے ہیں: من جرازاره من غیر قصد التخیُّل فانه لا باس به من غیر کراهة و کذالك یجوز لدفع ضرر یحصل له کان یکون تحت کعبیه جراح او حکة او نحو ذلك ان لم یغطها تؤذیه الهوام کالذباب ونحوه بالجلوس علیها ولا یجد مایسترها به الازاره او ردائه اوقمیصه وهذا کما یجوز کشف العورة للتداوی وغیر ذلك۔

ترجمہ: ''جس شخص نے بغیر قصد تکبر کے تہبند ٹخنوں کے نیچے باندھا اس میں کوئی کراہت نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے، اسی طرح کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے بھی ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانا جائز ہے، مثلاً اس کے ٹخنوں کے نیچے کوئی زخم ہو یا خارش ہو یا اگر وہ ٹخنوں کو نہ ڈھانپے تو اس پر مکھیاں اور حشرات الارض کے بیٹھنے کا خطرہ ہو اور لمبی قمیص یا لمبا تہبند اور کوئی چیز ڈھانپنے کے لئے میسر نہ ہو۔

علامہ عینی مزید لکھتے ہیں: انه لا حرج علی من یجر ازاره بغیر قصد کما ذکرنا ه فان قلت روی ابن ابی شیبة عن ابن عمر انه کان یکره جر الازار علی کل حال قلت قال ابن بطال هو من تشدیداته والا فقد روی هو حدیث الباب فلم یخف علیه الحکم۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے اپنے تہبند کے ایک جانب پھسل جانے کا ذکر کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے، (یعنی تم پر اس وعید کا اطلاق نہیں ہوتا)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا تہبند بلا قصد پھسل جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر حال میں تہبند لٹکانے کو مکروہ کہتے تھے، اس کے جواب

میں علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابن عمر کی تشدیدات (یعنی احتیاط کی بنا پر کسی مسئلے میں شدت کرنا) میں سے ہے ورنہ حضرت ابن عمر تو خود اس حدیث کے راوی ہیں ان سے یہ حکم کیسے مخفی ہوسکتا ہے ، (عمدۃ القاری ،جلد 21 ص: 296 مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ ،مصر)''۔

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں: لدلالۃ ظواھر الاحادیث علیھا فان کان للخیلاء فھو ممنوع منع تحریم و الا فمنع تنزیہ ۔

ترجمہ:''بخاری کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکبر کے ساتھ کپڑا لٹکا کر چلنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر تکبر کی نیت سے نہ ہوتو مکروہ تنزیہی ہے، (مرقات ،جلد 8 ص: 239 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان)''۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص تکبُّر ،اِسراف اور طغیان (سرکشی) کی نیت سے اپنے تہبند کو لمبا بناتا ہے اور اس کو گھسیٹتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالی اس کی طرف لطف وعنایت کی نظر نہیں فرمائے گا۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ اگر تہبند اس طرح نہ ہو تو حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے ،اور اگر کوئی عذر ہو مثلاً سردی ہو یا کوئی بیماری ہو (مثلاً ٹخنے کے نیچے کوئی زخم ہو جس پر مکھیاں بیٹھتی ہوں ان سے زخم کو بچانے کے لئے ٹخنہ ڈھانپے) تو بالکل مکروہ نہیں ہے ،(اشعۃ اللمعات ،جلد 3 ص: 536، 537 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنو)''۔

مزید لکھتے ہیں: حرام وہ صورت ہے جب کوئی شخص عُجب اور تکبُّر سے کپڑا لٹکائے ،۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: طعام اور لباس میں توسیع ، اِسراف اور تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر مباح ہے ،(اشعۃ اللمعات ،جلد 3 ص: 555،555 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنو)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: فی الخلاصة ان یکرہ کذا فی شرح مُنیة المصلّی ویدخل ایضاً فی کف الثوب تشمیر کمہ کما فی فتح القدیر وظاھرہ الاطلاق وفی الخلاصة ومنیة المصلی قید الکراھة بان یکون رافعاً کمیہ الی المرفقین وظاھرہ انہ لا یکرہ اذا کان یرفعھا الی مادونھا والظاھر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل وذکر فی المجتبیٰ فی کراھیة تشمیة الکمین قولین۔

ترجمہ: ''خلاصہ میں مذکور ہے کہ نمازی کا کپڑا موڑنا مکروہ ہے، اسی طرح ''شرح منیة المصلی'' میں ہے اور کپڑا موڑنے میں آستیوں کا اُڑسنا بھی شامل ہے اسی طرح ''فتح القدیر'' میں ہے اور یہ بظاہر مطلق ہے، لیکن ''خلاصہ'' اور ''منیة المصلی'' میں ہے کہ اگر آستیوں کو کہنیوں تک چڑھالیا تو مکروہ ہوگا اور کہنیوں سے کم تک آستین چڑھائی ہیں تو مکروہ نہیں ہوگا، لیکن تحقیق یہ ہے کہ ہر حال میں مکروہ ہوگا کیونکہ کپڑا موڑنے کا اطلاق ہر صورت پر آتا ہے اور ''مجتبیٰ'' میں آستین چڑھانے کی کراہت کے بارے میں دو قول ذکر کئے گئے ہیں ، (یعنی ایک کراہت کا اور دوسرا عدمِ کراہت کا)، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 24، مطبوعہ طبعہ علمیہ، مصر)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (و) کرہ (کفہ) أی رفعہ ولو لتراب کمشمر کم أو ذیل (وعبثہ بہ) أی بثوبہ۔

ترجمہ: ''اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لئے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا''

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: أی کما لو دخل فی الصلاة وھو مشمّر کمہ أو ذیلہ ، وأشار بذلک الی أن الکراھة لا تختص بالکف

وهو في الصلاة ، كما افاده في "شرح المنية "،لكن قال في "القنية":واختلف فيمن صلى وقد شمر كميه لعمل كان يعمله قبل الصلاة أو هيئته ذلك ومنه مالو شمر للوضوء ثم عجل لادراك الركعة مع الامام ۔واذا دخل في الصلاة كذلك وقلنا بالكراهة فهل الافضل إرخاءُ كميه فيها بعمل قليل أو تركهما ؟لم أرهٗ: والأظهر الأول بدليل قوله الآتي : "ولو سقطت قلنسوته فاعادتها أفضل "تأمل۔

ترجمہ:"یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا،اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ "شرح المنیہ" سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔لیکن "القنیہ" میں کہا ہے کہ:"اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسے ہے۔" اور انہی میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس نے وضو کے لئے آستین چڑھائے، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کرے اور اسی حالت میں نماز میں داخل ہوجائے،تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے،تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا،لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)،اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: "اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے،غور کیجئے"۔

آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:وقيد الكراهة في "الخلاصة "و "المنية

"بأن يكون رافعاً كميه الى المرفقين ۔وظاهره أنه لا يكره الى مادونهما ۔
قال في "البحر": والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب على الكل ۔
ترجمہ: ''خلاصہ'' اور''منیہ'' میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن "البحر الرائق" میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے کیونکہ ''کفِ ثوب'' تمام صورتوں پر صادق آتا ہے۔(ردالمحتار جلد: 2،ص:350، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔
امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا''آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی نماز پڑھنی مکروہ ہے یا نہیں؟''جواب دیا:''ضرور مکروہ اور سخت وشدید مکروہ ہے۔''(فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص: 311، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔
مفتی محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی لکھتے ہیں:
قوله من جرّ إزاره بَطَراً اى تكبراً و فرحاً و طغياناً ويفهم ان جرّهٗ بغيرذالك لايكون حراما لكنه مكروه كراهةٌ تنزيه۔
ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ: جو شخص تکبر، نشاط اور سرکشی کی نیت سے اپنا کپڑا زمین پر گھسیٹ کر چلا، (حدیث مبارک کے ان الفاظ سے) یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا لباس گھسیٹے ہوئے زمین پر چلتا ہے، لیکن اس کی نیت تکبر وسرکشی کی نہیں ہے، تو اس کا یہ عمل حرام نہیں ہوتا، بلکہ مکروہِ تنزیہی ہوگا، (التعلیق الصبیح، ج:4،ص:383)''۔
''کفِ ثوب'' کو بیشتر فقہاء کرام نے مکروہِ تحریمی کہا ہے اور بقول علامہ ابن عابدین

شامی جو کراہت کی نفی کرتے ہیں وہ کراہتِ تحریمی کی نفی کرتے ہیں، کراہتِ تنزیہی سب کے نزدیک ثابت ہے، (منحۃ الخالق حاشیۃ البحرالرائق ج ۲ ص ۲۴) اور اس حکم کراہت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شروع میں ذکر کردی گئی ہیں۔ نماز میں ہیئتِ لباس کے بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ۔

ترجمہ: ''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) اختیار کیا کرو، (الاعراف: 30)۔''

یعنی نماز باوقار لباس پہن کر پڑھنی چاہئے اور اوپر ''کفِ ثوب'' کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں، یہ سب وقار کے منافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ وضع اختیار کرکے کسی باوقار اور ذی وجاہت ہستی کے سامنے نہیں جاتا، چہ جائے کہ ''احکم الحاکمین'' کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ اگر کوئی شخص ہاف کٹ آستین والی قمیص پہنے ہوئے ہے، یعنی ایسی قمیص جس کی آستین کی اصل وضع اور ساخت ہاف کٹ ہے، یعنی کہنیوں یا اس سے اوپر ہے، اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے تو مکروہ نہیں ہوگی، کیونکہ نماز میں پہنچوں تک آستینوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے (یعنی قباحت اس میں ہے کہ اپنی ساخت میں قمیص پوری آستین والی ہو اور پھر خلافِ وضع آستین چڑھا کر نماز پڑھے)۔ عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کے مسلمان احرام باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور احرام میں پوری کلائیاں ڈھکی ہوئی نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ڈھکنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز نبی علیہ السلام اور متعدد صحابہ کرام نے ایک کپڑا اپنے جسم پر لپیٹ کر بھی نماز پڑھی ہے اور اس صورت میں پوری کلائیوں کا ڈھکنا متصور ہی نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے اپنی تحقیقی بیان میں

فرماتے ہیں: ہماری تحقیق یہ ہے کہ احادیث میں ''جرِ ثوب اور ''اِسبال اِزار'' کے الفاظ ہیں۔ ''جرِ ثوب'' کا معنی ہے کپڑا گھسیٹنا اور ''اِسبال الِازار'' کا معنی ہے تہبند کا ٹخنوں سے نیچے ہونا۔ اگر کوئی مرد جرِ ثوب کرے یعنی اس کا تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں سے بہت نیچا ہو حتیٰ کہ اس کے قدموں سے نیچے گھسٹ رہا ہو تو یہ بغیر تکبر کے بھی مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ اس میں بغیر کسی ضرورت اور بغیر کسی فائدہ کے کپڑے کو ضائع کرنا ہے، ہو یہ اسراف کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کپڑا قدموں کے نیچے زمین پر گھسٹتا رہے گا تو نجاست کے ساتھ آلودہ ہوگا اور کپڑے کو محلِ نجاست میں ڈالنا بھی مکروہِ تحریمی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے، کیونکہ عہد رسالت میں عورتیں کپڑا گھسیٹ کر چلتی تھیں اور مردوں کے لئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا بھی مکروہِ تحریمی ہے اس لئے اگر جرِ ثوب بغیر تکبر کے ہو پھر بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر مالکی نے اس کو مذموم فرمایا ہے (تمہید جلد: 3، ص: 244)۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو مکروہِ تحریمی فرمایا ہے، (فتح الباری، جلد: 10، ص: 263)۔ اور اگر ''جرِ ثوب'' میں کپڑا گھسیٹنے کے ساتھ اظہارِ تکبر بھی ہو تو یہ شدید مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اور اگر ''اِسبالِ ازار'' ہو یعنی تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں کے نیچے ہو لیکن اس کے قد وقامت کے برابر ہو گھسٹ نہ رہا ہو تو اگر اس میں تکبر نہیں ہے صرف زینت کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ صرف خلافِ اَولیٰ ہے اور اگر اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اور اکڑ اکڑ کر چلتا ہے اور اِتراتا ہے تو پھر یہ تکبر کی وجہ سے مکروہِ تحریمی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ حرمت کی علّت صرف تکبُّر ہے، اگر ایک مرد نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھتا ہے اور اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار سمجھتا ہے اور ان کو حقیر

سمجھتا ہے تو یہ بھی مکروہِ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے،اس لئے حرمت میں اصل تکبُّر ہے۔

ہماری اس تحقیق کی تائید حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی 852ھ کی اس عبارت میں ہے: ''اگر کسی شخص کا لباس بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہو تو اس کا حال مختلف ہے اگر وہ کپڑا اس کے ٹخنوں کے نیچے لٹک رہا ہو لیکن وہ کپڑا پہننے والے کے قد اور اس کی قامت کے برابر ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہوگی ، خصوصاً جبکہ بلا قصد ایسا ہو (یعنی غیر ارادی طور پر تہبند یا شلوار پیٹ سے پھسل کر ٹخنوں سے نیچے لٹک گئی ہو)، جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لئے اس طرح واقع ہوا،اور اگر کپڑا پہننے والے کے قد وقامت سے زائد ہو تو اس سے منع کیا جائے گا کیونکہ اس میں اسراف ہے اور اس کو حرام کہا جائے گا،اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے اور یہ پہلی وجہ سے زیادہ قوی وجہ ہے ، کیونکہ امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کے لباس کی نوع کا لباس پہنتا ہے،اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس طرح کا لباس پہننے والا اس خدشے سے محفوظ نہیں ہوگا کہ اس کے لباس پر نجاست لگ جائے (کیونکہ اس کا لباس قدموں کے نیچے لٹک رہا ہے)اور اس ممانعت کی طرف اشارہ اس حدیث میں ہے جس کو امام ترمذی نے شمائل (رقم الحدیث : 121)میں اور امام نسائی نے سنن کبریٰ (رقم الحدیث: 9682,9683)میں حضرت عبید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ایک تہبند باندھے ہوئے جا رہا تھا اور وہ تہبند زمین پر گھسٹ رہا تھا کہ اچانک ایک شخص نے کہا: اپنا کپڑا اوپر اٹھاؤ اس میں زیادہ صفائی اور زیادہ بقا ہے ، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نبی ﷺ تھے ، میں نے کہا: یا رسول اللہ ! یہ تو ایک سیاہ اور سفید دھاریوں والا تہبند ہے (یعنی اس معمولی کپڑے میں

تکبر کرنے کا کوئی معنی نہیں ہے)، آپ نے فرمایا: کیا تمہارے لئے میری شخصیت میں نمونہ نہیں ہے؟، میں نے دیکھا تو آپ نے آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھا ہوا تھا (مسند احمد جلد 5 ص: 364) اور اس وجہ سے بھی ممنوع ہے کہ کپڑا گھسیٹنے میں تکبر کی بدگمانی ہوتی ہے۔قامت سے نیچے کپڑا لٹکانا کپڑا گھسیٹنے کو مستلزم ہے اور کپڑا گھسیٹنا تکبر کو مستلزم ہے خواہ پہننے والے نے تکبر کا قصد نہ کیا ہو اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، احمد بن منیع نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم تہبند کو گھسیٹنے سے بچو کیونکہ تہبند کو گھسیٹنا تکبر سے ہے، (فتح الباری جلد 10 ص: 263,264 مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)، (تبیان القرآن جلد 4، ص: 331 ,330 ,323 ,322 مطبوعہ: فرید بک اسٹال، لاہور)"۔

تسبیحات فرض کے فوراً بعد پڑھی جائیں یا سُنن ونوافل کے بعد؟

سوال: 34

کیا فرض نماز کے فوراً بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنا افضل ہے یا پہلے بقیہ نماز مکمل کرنا افضل ہے؟، کیونکہ کچھ نمازی فرض نماز کے بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں اور بقیہ نماز بعد میں ادا کرتے ہیں، اس طرح اگلی صف میں بیٹھے ہوئے نمازی جو پہلے نماز مکمل کرلیتے ہیں انہیں، واپس اپنے کام پر جانے کی جلدی ہوتی ہے، اسطرح جلدی جانہیں پاتے ہیں، (قاری محمد مختار یا قیانی، مدرس دارالعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

نماز کے بعد تسبیحات واذکار کی فضیلت احادیث میں کثرت سے وارد ہوئیں ہیں: عن کعب بن عجرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "معقبات

لایخیب قائلھن "یُسبّح اللّٰہ فی دُبُرِ الصّلاۃ ثلاثاً وثلاثینَ ،ویُحَمّدُہٗ ثلاثاً وثلاثینَ ، ویُکبّرہٗ أربعاً وثلاثینَ "۔

ترجمہ:''کعب بن عجرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: کچھ کلمات (نماز کے بعد بلا فاصلہ کہنے کے ہیں) جن کا کہنے والا نامراد نہیں رہتا، (ان کلمات میں) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہنا، تینتیس مرتبہ ''الحمدللہ'' کہنا، چونتیس مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہنا، (سنن نسائی، رقم الحدیث:1348)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: یکرہ تاخیر السنۃ الا بقدر : اللّٰھم أنتَ السّلامُ الخ۔قال الحُلوانی :لابَأس بالفصل بالأوراد ، واختارہ الکمال ، قال الحلبی : ان أُرید بالکراھۃ التنزیھیۃ إرتفعَ الخلاف ۔ قلتُ :وفی حفظی حَمْلُہٗ علی القلیلۃ ، ویستحب أن یستغفر ثلاثاً ویقرأُ آیۃالکرسِیّ والمُعَوِّذاتِ ویُسَبّحُ وَیُحَمّدُ وَیُکَبِّرُ ثلاثاً وثلاثین ؛ویُھَلّل تمامَ المائۃِ ویدعوا وَیختِمُ بسبحان ربك ۔

ترجمہ:''سنتوں میں تاخیر'' اَللّٰھُمّ اَنْتَ السّلام **'(حدیث پاک میں روایت کردہ پورے کلمات یہ ہیں:** اَللّٰھُمّ اَنْتَ السَّلامُ وَمِنْكَ السَّلَام، تَبارَکْتَ یَا ذَاالْجَلالِ وَالْاِکْرَام) **کی مقدار سے زیادہ مکروہ ہے۔حلوانی نے فرمایا:اذکار کے ساتھ فرائض وسنن میں فاصلے میں کوئی حرج نہیں،کمال نے اسی کو اختیار کیا ہے۔حلبی کہتے ہیں: کہ اگر کراہت سے کراہتِ تنزیہی مراد ہے تو اختلاف ختم ہوجاتا ہے۔(قلت میں کہتا ہوں)اور مجھے یہاں تک یاد ہے کہ یہ (تنزیہی) قلیل فصل پر محمول ہے،اور مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ استغفار پڑھے،آیۃ الکرسی اور مُعَوِّذات (سورۃالفلق وسورۃالناس) تلاوت کرے اور ''سبحان اللہ،الحمدللہ،اللہ اکبر'' تینتیس،تینتیس مرتبہ پڑھے،اور**

سوویں مرتبہ" لا اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰہ "پڑھے،اس کے بعد دعا کرے اور اختتام "سُبۡحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ وَسَلَامٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَالۡحَمۡدُلِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ "پر کرے،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2 ص:218،219،دار احیاء التراث العربی ،بیروت)"۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:(اِلاَّ بقدرِ اَللّٰھُمَّ الخ)لِمَا رَوَاہُ مُسۡلِمٌ وَالتِّرمذی عن عائشۃَ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھا قالت:"کان رسولُ اللّٰہ ﷺ لا یقعد اِلاَّ بمقدار ما یقولُ: اَللّٰھُمَّ انتَ السلامُ ومنکَ السَّلامُ ،تبارکتَ یا ذَاالجلالِ والاکرام" واما ما وَرَدَمِنَ الاحادیثِ فی الاَذکار عقیب الصَّلاۃِ فلا دلالۃَ فیہ علی الۡاِتیانِ بھاقبلَ السُّنَّۃِ ، بل یُحمَلُ علیَ الاِتیانِ بھا بعدَھا، لأن السُّنَّۃَ مِنۡ لواحقِ الفَریضۃِ وتوابعھا ومُکَمِّلاَتِھا فلم تکنۡ أجنبیۃ عنھا ، فما یفعل بعدھا یُطلق علیہِ أنّہ عقیبَ الفریضۃ۔

ترجمہ:"(یعنی مقدار: اللّٰھم الخ)کیونکہ مسلم اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف" اَللّٰھُمَّ اَنۡتَ السَّلامُ وَمِنۡکَ السَّلامُ، تَبَارَکۡتَ یاَ ذَاالۡجَلالِ وَالۡاِکۡرَام " کی مقدار ہی بیٹھتے تھے،اور دیگر روایات میں جو نماز کے بعداذکار کا ذکر ہے اس میں یہ دلالت نہیں کہ وہ اذکار سنتوں سے پہلے ہوتے تھے بلکہ (ان تسبیحات واوراد کے پڑھنے کو سنتوں کے بعد پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے)،کیونکہ سنتیں فرائض کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں اوران کے تابع ہوتی ہیں،اوران (میں نادانستہ طور پر کوئی کمی رہ جائے تو اس کی)تکمیل کا سبب ہیں،لہٰذا یہ فرائض سے بالکل الگ کوئی چیز نہیں ہیں،لہٰذا جو تسبیحات ان سنتوں کے بعد پڑھی جائیں،ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عمل فرضوں کے بعد ادا ہوا،((ردالمحتار

علی الدر المختار جلد 2 ص: 218، 219، دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سُنّتیں ہیں، (یعنی ظہر و جمعہ و مغرب وعشاء) ان نمازوں کے بعد دعا بھی مختصر کرنی چاہیے، امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال ہوا کہ "بعد نمازِ جمعہ انحرافِ قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں"۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: "امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سُنّت ہے اور اس کا ترک یعنی بعدِ سلام قبلہ رُو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا و مناجات بھی بالاجماع جائز ہے مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر و جمعہ و مغرب وعشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگرچہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔ اقول و یمکن الاستیناس له بقوله عزّوجلّ "واذا کانوا معه علی امرٍ جامعٍ لَمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ "فَاِنَّ فَرَاغَهُ مِنَ الدُّعَاءِ يُعَدُّ اِذْنَامِنْهُ دَلَالَةً بِالْمِلْكِ الْعُرْفِ جار۔

ترجمہ: "(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی سے استدلال ممکن ہے "اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں"، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ کرنی چاہیئے اگرچہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر وعصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

فرض کے بعد اذکار کے بارے میں یہ دو احادیث بھی ملاحظہ ہوں: قال رسول اللّٰہ ﷺ من قرأ ایة الکرسی دُبُرَ کل صلوٰۃ مکتوبة لم یمنعه من دخول الجنة الا الموت وزاد الطبرانی و قل ھو اللّٰہ احد۔

ترجمہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی اس کے لئے جنت میں جانے سے موت کے سوا اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔ اور طبرانی نے قل ھو اللہ احد پڑھنے کی زیادتی بھی روایت کی ہے، (سنن نسائی، رقم الحدیث:)"۔

عن عقبة بن عامر قال امرنی رسول اللّٰہ ﷺ ان اقرأ المعوذات فی دبر کل صلوٰۃ۔

ترجمہ "حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس، (یہ سورتیں) پڑھا کروں، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 1335)"۔

ان پر بحث کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

"امام ابن ہمام نے ان اذکار کی یہ تاویل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سنتیں پڑھنے کے بعد یہ اذکار پڑھا کرتے تھے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ فرض کے بعد یہ اذکار پڑھتے تھے جیسا کہ صحیح مسلم کی (حدیث نمبر 1243) اور ابن حبان، نسائی اور طبرانی کی آیت الکرسی والی حدیث ہے علامہ ابن ہمام نے کہا سنتیں چونکہ فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں اس لیے جو ذکر سنتوں کے بعد ہوگا وہ فرض کے بعد ہی ہوگا۔ اس پر پھر اعتراض ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سنن اور نوافل گھر میں پڑھتے تھے پھر صحابہ کرام کو کیسے پتا چلا کہ رسول اللہ نماز کے بعد یہ ذکر

کرتے تھے ۔مثلاً صحیح مسلم میں ہے: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد بآواز بلند پڑھتے تھے ۔لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ لہ الملك ولہ الحمد وهو علی كل شئی قدیر لاحول و لاقوة الا باللہ لااله الا اللہ و لا نعبد الا ایاه لہ النعمة ولہ الفضل ولہ الثناء الحسن لااله الا اللہ مخلصین لہ الدین ولو كره الكافرون۔۔۔۔ تو امام ابن ہمام تاویل درتاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے حجرہ کے باہر سے ذکر کی آواز سن لیتے تھے ۔اس تاویل سے قطع نظر ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کا ذہن اس اعتراض کی طرف متوجہ نہیں ہوا... کہ صحابہ بھی تو اس وقت اپنے اپنے گھروں میں سنن اور نوافل پڑھتے تھے ۔اس کے علاوہ سنن ابن حبان میں جو روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اس کے جنت میں جانے کے لئے موت کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں ۔اس روایت کے الفاظ ابن ہمام کی تاویل کا ساتھ نہیں دیتے ۔حضرت عائشہ نے جو روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللّٰھمّ انت السلام کی مقدار تک بیٹھتے تھے یہ دوام واستمرار پر محمول نہیں ہے بعض اوقات آپ صرف اللّٰھم انتَ السلام ومنكَ السلام پڑھنے تک بیٹھتے اور بعض اوقات اس سے زیادہ مقدار تک بیٹھتے اور ذکر کرتے رہتے ۔امت کی سہولت کے لئے آپ نے نہ کسی ایک ذکر کو معین کیا نہ کسی ایک مقدار کو معین فرمایا، یہی توجیہ آپ کی زندگی کے عام معمولات کے موافق ہے ۔بہرحال نمازی فرض نماز پڑھنے کے بعد آیت الکرسی پڑھے، تین مرتبہ استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو۔ پڑھے اور کلمہ شریف کا ذکر کرے، کیونکہ ان کے پڑھنے پر بہت اجر و ثواب اور جنت کی بشارت ہے ۔نیز فرض کے بعد سنتیں پڑھنے میں اصل سنت یہ ہے کہ سنتیں گھر

میں پڑھی جائیں۔ دیگر احادیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ فرض اور سنن میں فاصلہ ہونا چاہئے، اس لیے افضل یہی ہے کہ ان اذکار کو فرض کے بعد پڑھا جائے ۔فرض نماز کے بعد اذکار کے سلسلہ میں اس حکایت پر بھی عمل کرنا چاہئے۔

ابن قیم جوزی سند ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں ابو بکر بن محمد بیان کرتے ہیں کہ میں ابو بکر بن مجاہد کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اچانک وہاں شبلی آگئے تو ابو بکر بن مجاہد نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) بوسہ دیا، میں نے ان سے کہا یا سیّدی آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں، حالانکہ بشمول آپ کے تمام اہل بغداد کے خیال میں یہ دیوانہ ہے۔ابو بکر بن مجاہد نے کہا میں نے شبلی کی اس طرح تعظیم کی ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعظیم کی تھی، کیونکہ میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی۔آپ کی خدمت میں شبلی حاضر ہوا، آپ نے کھڑے ہو کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ شبلی کو کیوں سرفراز فرما رہے ہیں؟، آپ نے فرمایا، یہ ہر فرض کے بعد یہ آیت پڑھتا ہے۔ ”لقد جاء کم رسول من انفسکم“ (یعنی سورۂ توبہ کی آخری دو آیات)، اس کے بعد تین مرتبہ کہتا ہے ”صلی اللہ علیك یا محمد“۔ بعد میں میری شبلی سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے پوچھا تم درود کس طرح پڑھتے ہو؟، انہوں نے اسی طرح بتایا، (شرح صحیح مسلم، جلد: 2، ص: 194، 195)“۔جیسا کہ معلوم ہوا کہ جماعت فرض کے بعد سنتیں گھر پر پڑھنا افضل ہیں، تاہم مسجد میں بھی پڑھ سکتے ہیں، البتہ جماعت کے بعد مسجد میں دیر تک سُنَن و نوافل پڑھنے والے حضرات اس امر کا اہتمام ضرور کریں کہ مسجد سے باہر جانے والوں کے لئے راستہ موجود ہو اور انہیں نمازی کے آگے سے نہ گزرنا پڑے، اگر کہیں دیوار یا پلر ہے تو اسے سُترہ بنا کر کھڑے

ہو جائیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ فرائض کے بعد بعض نمازی جلدی سے آخری صف میں سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نماز ختم کر کے باہر نکلنے والے نمازیوں کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ وہ نمازی کی حرمت کو پامال کر کے اس کے آگے سے گزریں، اسی طرح بعض نمازی پچھلی صفوں میں دروازوں کے عین سامنے سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نمازی کے لئے پیچھے نکل کر جانے کا راستہ ہی نہیں رہتا، پس نمازیوں کو ان تمام امور کا خیال رکھنا چاہئے۔

﴿کتاب المساجد﴾

مسجد کی چھت پر بالغ طالبات کے مدرسے کا حکم

سوال: 35

اگر کوئی شخص مسجد کی چھت پر بالغ لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرے، اور اس میں بالغ ونابالغ لڑکیاں تعلیم حاصل کریں۔سوال یہ ہے کہ آیا مسجد کی چھت کو ایسے مدرسہ کے لئے وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟، ازراہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرماکرثواب دارین حاصل کریں، (مولانا محمد بہرام خان نعیمی، جامع مسجد قادریہ، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: قوله الی عنان السماء بفتح العین و کذا الیٰ تحت الثریٰ کما فی البیری عن الاستیجابی ۔ ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے، جیسا کہ ''بیری'' میں ''استیجابی'' کے حوالے سے منقول ہے ،(ردالمحتار علی الدرالمختار ،جلد: 2،ص: 270-271،مطبوعہ: داراحیاءالتراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وسطح المسجد له حکم المسجد کذافی الجوهرة النیرہ۔

ترجمہ: ''اور مسجد کی چھت مسجد ہی کے حکم میں ہے، ''جوہرہ نیرہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: اول،ص: 38،مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مسجد کی چھت پر مدرسے کا قیام، وقف میں تبدیلی کرنا ہے اور مسجد مکمل ہونے کے بعد اس کے مصرف میں تغییر کرنا جائز نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یجوز تغییر الوقف عن ھیئتہ۔

ترجمہ: "وقف کی ھیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490، مطبوعہ مکتبہء رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: اما لو تمت المسجدیۃ ثم اراد البناء منع۔

ترجمہ: "اگر کسی مسجد کی مسجدیت تمام ہو جائے پھر اگر اس میں مزید تعمیر کا ارادہ ہو (جس سے اس وقف کے مصرف میں تبدیلی ہوتی ہو) تو اسے روک دیا جائے گا، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 6 ص:428 داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔"

چونکہ مسجد کی چھت بھی مسجد ہی کے حکم میں ہے، اس لئے اس کی مسجدیت کا تبدیل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، البتہ مسجد میں دینی درس وتدریس جائز ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: یجوز الدرس فی المسجد وان کان فیہ استعمال اللبود والبواری المسبلہ لاجل المسجد کذا فی القنیہ۔

ترجمہ: "اور مسجد میں درس وتدریس جائز ہے اگرچہ اس میں مسجد کی دریاں، نمدے جو مسجد کے لئے وقف ہیں، استعمال ہوں، "قنیہ" میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص:320 مکتبہٗ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

البتہ مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کا شور نمازیوں کی نماز میں خلل انداز نہ ہو، ورنہ اوقات نماز میں درس وتدریس کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ بالغ طالبات کا مسجد کی چھت پر مدرسہ قائم کرنا بوجوہ درست نہیں ہے، ایک تو یہ کہ ایسی طالبات اور ان کی معلمات کے فطری طور پر ایامِ حیض بھی آتے ہیں، اور ان ایام میں عورت

کا مطلقاً مسجد میں داخل ہونا منع ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولایحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیہ۔

ترجمہ: ''اور جنبی، اور حیض ونفاس والی عورت کا مسجد کی چھت پر ٹھیرنا جائز نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 2، ص: 370، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

درمختار محل مذکور: یحرم فیہ السوال ویکرہ الاعطاء وانشاد ضالۃ وشعر الا مافیہ ذکر ورفع صوت بذکر الالمتفقھۃ ویمنع منہ کل مؤذ ولوبلسانہ۔

ترجمہ: ''مسجد میں سوال کرنا حرام اور سائل کو مسجد میں دینا مکروہ ہے، اور اسی طرح گمشدہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنا۔ اور ایسے اشعار پڑھنا جن میں ذکر نہ ہو، اور فقہ کی تعلیم وتعلم کے علاوہ آواز بلند کرنا مکروہ ہے، اور ہر ایذا دینے والے کو مسجد سے منع کیا جائیگا اگرچہ زبان سے ایذا پہنچاتا ہو۔'' اور اگر ایسے نہ ہوں تو انہیں مسجد میں غیر اوقات نماز میں پڑھانا مضائقہ نہیں رکھتا جب کہ معلم بلاتنخواہ محض لوجہ اللہ پڑھاتا ہو ورنہ ہرگز جائز نہیں اگرچہ جوان اور بوڑھے ہی پڑھیں کہ اب یہ اور پیشوں کی طرح دنیا کمانا ہے اور مسجد میں اس کی اجازت نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری جلد: 5، ص: 122، ''لو جلس المعلم فی المسجد والوراق یکتب فان کان المعلم یعلم للحسبۃ والوراق یکتب لنفسہ فلاباس بہ لانہ قربۃ وان کان بالاجرۃ یکرہ الاان یقع لھما الضرورۃ کذافی محیط السرخی''۔

ترجمہ: ''اگر معلم مسجد میں بیٹھ کر تعلیم دیتا ہے اور کاتب مسجد میں بیٹھ کر لکھتا ہے اگر تو

معلم ثواب کی نیت سے ایسا کرتا ہے اور کاتب اپنے لئے لکھتا ہے نہ کہ اجرت پر تو حرج نہیں کیونکہ یہ قربت وعبادت ہے، اور اگر اجرت کے لئے ہے تو بلاضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے، امام سرخسی کی محیط میں بھی ایسا ہی ہے، (فتاوٰی عالمگیری جلد:5، ص:122)''، (فتاوٰی رضویہ جلد: 16، ص: 459، مطبوعہ: رضا فاونڈیشن ،لاہور)''۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''مسجد کے اندر علمِ دین کی تعلیم جائز اور اس کے جواز پر قرآن وحدیث شاہد، قال اللّٰہ تعالیٰ و من اظلم ممن منع مسٰجداللّٰہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعیٰ فی خرابھا ۔حدیث میں ہے: خرج رسول اللّٰہ ﷺ ونحن فی الصفۃ فقال ایکم یحب ان یغدو کل یوم الیٰ بطحان او العقیق فیاتی بناقتین کوماوین فی غیراثم ولا قطع رحم فقلنا یارسول اللّٰہ کلنا نحب ذالک قال افلا یغدو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرأ ایتین من کتاب اللّٰہ خیرلہ من ناقتین وثلث خیرلہ من ثلث واربع خیرلہ من اربع ومن اعدادھن من الابل رواہ مسلم عن عقبۃ بن عامر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو مساجد میں ذکرِ الٰہی کو روکے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے، حدیث میں ہے: ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ (اپنے حجرۂ اقدس سے) نکلے اور ہم (اس وقت) صفہ میں تھے، تو آپ نے فرمایا: تم میں سے کون اس بات کو پسند کرے گا کہ ہر روز صبح بطحان یا عقیق کی طرف نکلے اور کسی گناہ یا قطعِ رحمی کے بغیر دو بلند کوہان والی اونٹنیاں لائے، تو ہم نے عرض کیا :یارسول اللہ ﷺ! (بلاشبہ) ہم میں سے ہر ایک اس بات کو پسند کرے گا، (تو رسول

اللہ ﷺ نے) فرمایا: تو تم میں سے ہر شخص (ہر روز) صبح کے وقت مسجد کی طرف کیوں نہیں نکل پڑتا، تا کہ وہ کتاب اللہ کی دو آیتیں پڑھائے یا پڑھے، یہ (عمل) اس کے لئے دو بلند کوہان والی اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتوں کا پڑھنا پڑھانا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتوں کا پڑھنا پڑھانا چار اونٹنیوں سے اور ان سے زیادہ آیتوں کا پڑھنا پڑھانا اتنی ہی تعداد کی اونٹنیوں سے بہتر ہے،(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1842 مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز المکۃ المکرمہ، اس حدیث کو امام مسلم نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے)"۔

فی نفسہ تعلیم سے مسجد کی کوئی بے حرمتی نہیں ہے، تعلیم کو احترام کے خلاف کہنا غلط ہے ،البتہ اگر پڑھنے یا پڑھانے والے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہوں تو ان کو اس سے منع کیا جائے اور روکا جائے ،واللہ تعالیٰ اعلم ،(فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 256 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)"۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: مسجد میں علم دین کی تعلیم جائز ہے، حضور اقدس ﷺ کے زمانہ پاک میں مسجد نبوی میں علم دین کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک دونوں حرم محترم میں علم دین کی تعلیم بلا نکیر جاری ہے، حدیثوں سے اس کا جواز ثابت ہے، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 269 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)"۔

خلاصہ یہ کہ فی نفسہ مسجد میں دینی درس وتدریس جائز ہے، لیکن مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا لازم ہے ،اور جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں محیط سرخسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ضرورت کی بنا پر اجرت کے عوض بھی مسجد میں تدریس جائز ہے، لیکن بالغ طالبات کے لئے مسجد کی چھت پر درس وتدریس کا انتظام کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں

کئی شرعی مفاسد کا احتمال ہے ،اور مسجد کے وقف میں تبدیلی کر کے کسی بھی طرح کا مدرسہ قائم کرنا بہرصورت جائز نہیں ہے۔

مسجد کے قیام کے بعد اس کی حیثیت کو تبدیل کرنا

سوال: 36

ہمارے ہاں ایک مسجد موسوم (اڈہ لاریاں والی مسجد) کی جدید تعمیر کی گئی۔ مسجد کا ڈیزائن اسطرح بنایا گیا کہ عینِ مسجد کو جائے وضو بنا دیا گیا ہے۔اور مسجد کے کچھ حصے کو دکان بنا دیا گیا ہے۔ازروئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟،(محمد جابد کھوڑ،ضلع اٹک)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں جیسا کہ سوال سے واضح ہوتا ہے کہ جس جگہ وضو خانہ بنایا گیا،وہ پہلے مسجد تھی، مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہی ہے اوراس کی مسجدیت کبھی باطل نہیں ہوسکتی۔فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے،علامہ شامی لکھتے ہیں:

قوله الی عنان السماء بفتح العین و کذا الی تحت الثری کما فی البیری عن الاستیجابی ۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے''بیری'' میں استیجابی سے اسی طرح منقول ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد:2،ص:370-371،مطبوعہ ،داراحیاءالتراث العربی،بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:ولا یجوز تغییر الوقف عن هیئته ۔

ترجمہ:''وقف کی ھیئت کو بدلنا جائز نہیں ،(فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490،مطبوعہ

مکتبہء رشیدیہ،کوئٹہ)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: جو زمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اوراس کے بھی اس کام میں جس کیلیئے واقف نے وقف کی ،وقف کواس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں،شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل بہ۔ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 546 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف باب ۱۱ میں محیط امام شمس الائمہ سرخسی سے ہے:

قیم المسجد لایجوز لہ ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفی فنائہ لان المسجد اذا جعل حانوتاً ومسکنا تسقط حرمتہ وھذالایجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمہ حکم المسجد، ترجمہ:"متولی کومسجد کی حد یا مسجد کے فناء میں دکانیں بنانے کا کوئی اختیار نہیں، کیونکہ مسجد کو جب دکان یا رہائش گاہ بنادیا جائے،تو اس کا احترام ساقط ہوجاتا ہے، جو کہ نا جائز ہے ۔اور فنائے مسجد چونکہ مسجد کے تابع ہے لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مسجد کا ہے،(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:352 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (کہ مسجد کے اوپر امام کے لئے بالاخانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں:صورتِ مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام ،اور وہ بالاخانہ بھی قطعی حرام ،ہاں وقت بنائے مسجد قبلِ تمامِ مسجدیت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالاخانہ بانی بنائے اور اسکے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے،اور اگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگر چہ

مسجد کی دیوار کا صرف اسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہرگز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھادیں گے، درمختار میں ہے: لو بنی فوقه بيتا للامام لا يضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجدية ثم اراد البناء منع ولو قال عنيتُ ذالك لم يُصَدّق، تاتارخانيه فاذا كان هذا في الواقف فكيف بغيره فيجب هدمه ولو على جدار المسجد ولا يجوز اخذ الاجرة منه ولا ان يجعل شيئا منه مستغلا ولا سكنى بزازية۔

ترجمہ: "اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنا دیا،تو حرج نہیں کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے،لیکن تمامِ مسجدیّت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے،تو اس کو منع کیا جائے گا،اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (تاتارخانیہ) جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہو سکتا ہے لہٰذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے اگرچہ صرف دیوارِ مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو،اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)۔(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:432,433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایک جگہ کی مسجدیّت متحقّق ہو چکی تھی،اسے عین مسجد قرار دیا جا چکا تھا اور بطور مسجد ہی وہ زیرِ استعمال رہی،اس لئے اب اس کی مسجدیّت کو باطل کر کے اس کی جگہ وضو خانہ یا دوکانیں بنانا درست نہیں ہے،البتہ اسے مسجد کا حصہ قائم رکھتے ہوئے اور آدابِ مسجد کو ملحوظ رکھتے ہوئے درس وتدریس کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں

سوال: 37

سرکار دو عالم ﷺ کے منبر کی تین سیڑھیاں تھی لیکن ایک دفعہ سرکار دو عالم ﷺ منبر پر چڑھے تو تین مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے آمین کہا اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ منبر کی سیڑھیاں چار تھیں اور آپ ﷺ چوتھی سیڑھی پر بیٹھے ہوں گے،(سید عالم شاہ، جامع مسجد مصطفیٰ اعظم نگر لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ردالمحتار میں ہے: منبرہ ﷺ کان ثلث درج غیر المسماۃ بالمستراح۔

ترجمہ: حضور ﷺ کے مقدس منبر کے تین زینے اس تخت کے علاوہ تھے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔حضور سید عالم ﷺ درجۂ بالا پر خطبہ فرمایا کرتے ،صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسرے پر پڑھا، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے تیسرے پر، جب زمانہ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آیا پھر اول پر خطبہ فرمایا سبب پوچھا گیا،فرمایا اگر دوسرے پر پڑھتا لوگ گمان کرتے کہ میں صدیق اکبر کا ہمسر ہوں اور تیسرے پر تو وہم ہوتا کہ فاروقِ اعظم کے برابر ہوں،لہذا وہاں پڑھا جہاں یہ احتمال متصور ہی نہیں اصل سنت اول درجہ پر قیام ہے۔وما فعلہ الصدیق فکان تأدبا منہ مع رسول اللہ ﷺ وما فعل الفاروق فکان تأدبا مع الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کے ادب کی بنا پر ایسا کیا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ادب کی خاطر۔بلندیٔ منبر سے اصل مقصود یہ ہے کہ سب حاضرین خطیب کو دیکھیں اور اس کی آواز سنیں جہاں یہ

حاجت بسبب کثرت حضار و دوری صفوف تین زینوں میں پوری نہ ہو تو زینے زیادہ کرنے کا خود ہی اختیار ہے اور بہتر عدد طاق کی مراعات فـانّ اللّٰہ وتـر یحبّ الوتر (اللہ تعالٰی وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے)واللہ تعالٰی اعلم،(فتاوی رضویہ جلد 8 ص: 343,344 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)‘‘۔

محدّث بریلوی امام احمد رضا قادری قدس سرھم العزیز کی تحریر سے واضح ہے کہ منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں تین تھیں اور چوتھا تخت یا بیٹھنے کی جگہ تھی، خلیفہ اول و دوم نے ادب کو ملحوظ رکھا، حضرت ابوبکر منبر رسول پر اس جگہ بیٹھے ، جہاں حضور ﷺ کے قدم مبارک ہوتے تھے اور پھر حضرت عمر حضرت ابوبکر کے قدموں کی جگہ بیٹھ گئے، یہ دونوں اکابر ادب واحترام کی وجہ سے اجر پائیں گے، تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان نے قیامت تک آنے والے خطباء حضرات کے لئے یُسر (آسانی) کو ملحوظ رکھا، اور وہ بھی اس اخلاص اور نیک نیتی کا اجر پائیں گے، منبر کی سیڑھیاں تین سے زائد پانچ یا سات بھی بنائی جاسکتی ہیں، طاق عدد بہتر ہے۔

مسجد کی بالائی منزل پر جماعت

سوال: 38

ہماری مسجد جو کہ پچاس سالہ پرانی بنی ہوئی تھی اس کی جگہ نئی تعمیر تین منزلہ ہوئی ہے لیکن پہلے والے مصلّی پر ابھی نماز ہو رہی ہے ہم لوگ پہلی منزل پر نماز کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں۔اس مسئلے میں آپ کی راہنمائی کی ضرورت ہے آیا اوپر نماز باجماعت نماز ادا کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے؟،(محمد اسلم، جنرل سیکریٹری جامعہ مسجد غوثیہ لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

مسجد کی عمارت بجمیع اجزاء مسجد کہلاتی ہے اور مسجد کے جمیع اجزاء کا حکم یکساں ہے، جس طرح نیچے مسجد کے اندر نماز صحیح اور مشروع ہے، اسی طرح فرسٹ فلور پر بھی نماز باجماعت جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں فرسٹ فلور پر نماز باجماعت پڑھنے میں ازروئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، البتہ فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے فقط امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہِ تنزیہی ہے، لیکن اگر امام کے ساتھ کچھ مقتدی بھی اوپر کھڑے ہوں اور باقی امام سے نیچے ہوں تو ایسی صورت میں بلا کراہت نماز جائز ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ویکرہ ان یکون الامام وحدہ علی الدکان و کذا القلب۔۔۔وان کان بعض القوم معہ فالاصح انہ لایکرہ الخ۔ "(فتاوی عالمگیری جلد 1 ص:108 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

صورت مسئولہ میں جو لوگ نیچے یا اوپر کی منزل میں امام کی اقتداء میں کھڑے ہوں گے، اگر ان کو امام کے انتقالات یعنی رکوع اور سجدہ میں جانے کا اس طرح تشہد میں بیٹھنے کا اور سلام پھیرنے کا کسی ذریعہ سے خواہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے یا مکبرین کے ذریعے علم ہو جاتا ہے تو نیچے کھڑے ہو کر ان کا اقتداء کرنا درست ہے اور اگر ان کو امام کے انتقالات کا علم نہیں ہوتا تو پھر ان کا امام کی اقتداء کرنا، اس صورت میں صحیح نہیں، نماز جائز نہیں ہوگی۔

فنائے مسجد کا حکم

سوال: 39

عرض یہ ہے کہ ہماری مسجد میں ایک مدرسہ مسجد کمیٹی کے زیرانتظام دینی خدمات انجام دے رہا ہے، جس میں بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم کا علیحدہ علیحدہ انتظام ہے، مدرسے میں ایک خاتون مُعلّمہ بھی ہیں جن کی کارکردگی سے کمیٹی مطمئن ہے اور سمجھتی ہے کہ مذکورہ خاتون سنّیت کی ترقی وترویج کے لئے اچھا کام کررہی ہیں، ان کا کوئی مکان نہیں ہے، اور شوہر بھی بے روزگار ہے۔ انتظامیہ فنائے مسجد کے احاطے میں جہاں مدرسہ ہے، پہلے مسجد کا وضوخانہ بعد میں لائبریری اور پھر خادم کی رہائش رہی ہے، مدرسے کی اوپر والی منزل میں شروع سے بچوں کے مدرسے کی جگہ ہے، لیکن اب وہاں مؤذن صاحب کی رہائش ہے، جہاں اوپر مؤذن صاحب اور نیچے خادم کی رہائش ہو، وہاں پر مُعلّمہ کو بھی رہائش کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ نہیں؟ اسی مدرسے کے ناظم، جن کا کوئی گھر نہیں ہے اور وہ اچھا کام کررہے ہیں، اسی احاطے میں ان کو بھی رہائش کی جگہ دی جاسکتی ہے، (محمد غوث محی الدین، R-1043/15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

یہاں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فنائے مسجد کیا ہے؟ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز "غنیۃ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فناء المسجد هو المكان المتصل به ليس بينه طريق ترجمہ: "فنائے مسجد وہ مکان ہے جو مسجد کے متصل ہو اور درمیان میں راستہ نہ ہو، (غنیۃ المستملی، فصل فی احکام المسجد ص: 614 سہیل اکیڈمی لاہور)"۔ اور فنائے مسجد کی حرمت مثل مسجد ہے

،فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف باب ۱۱ میں محیط امام شمس الائمہ سرخسی سے ہے:

قیم المسجد لایجوز له ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً ومسکنا تسقط حرمته وھذالایجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد، ترجمہ:''متولی کو مسجد کی حد یا مسجد کے فناء میں دکانیں بنانے کا کوئی اختیار نہیں کیونکہ مسجد کو جب دکان یا رہائش گاہ بنادیا جائے تو اس کا احترام ساقط ہوجاتا ہے جو کہ ناجائز ہے اور فنائے مسجد چونکہ مسجد کے تابع ہے لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مسجد کا ہے،(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:352 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے جیسا کہ آپ نے سوال میں تفصیل سے بتایا کہ:'' انتظامیہ فنائے مسجد کے احاطے میں جہاں مدرسہ ہے، پہلے مسجد کا وضوخانہ بعد میں لائبریری اور پھر خادم کی رہائش رہی ہے،مدرسے کی اوپر والی منزل میں شروع سے بچوں کے مدرسے کی جگہ ہے،لیکن اب وہاں مؤذن صاحب کی رہائش ہے،''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مقام پر بار بار تغییر وتبدیل کی گئی جو کہ جائز نہیں،علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:**ولا یجوز تغییر الوقف عن ھیئته**۔

ترجمہ:''وقف کی ھیئت کو بدلنا جائز نہیں،(فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490،مطبوعہ مکتبہء رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: جو زمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اور اس کے بھی اس کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی، وقف کو اس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں،شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل به (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص

کی مثل ہے)(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 546 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (مسجد کے اوپر امام کے لئے بالا خانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں: صورتِ مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام ،اور وہ بالا خانہ بھی قطعی حرام، ہاں وقت بنائے مسجد قبل تمام مسجدیت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالا خانہ بانی بنائے اور اسکے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے اور اگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگر چہ مسجد کی دیوار کا صرف اسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہرگز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھادیں گے، درمختار میں ہے:لو بنى فوقه بيتا للامام لا يضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجدية ثم اراد البناء منع ولوقال عنيت ذالك لم يصدق تاتارخانيه فاذا كان هذا فى الواقف فكيف بغيره فيجب هدمه ولو على جدار المسجد ولا يجوز اخذ الاجرة منه ولا ان يجعل شيئا منه مستغلا ولا سكنى بزازية۔ ترجمہ:"اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنادیا تو حرج نہیں کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے لیکن تمامِ مسجدیت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو اس کو منع کیا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (تاتارخانیہ) جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہوسکتا ہے لہٰذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے اگر چہ صرف دیوار مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو، اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)،(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 432,433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

مذکورہ بالا تمام عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ فنائے مسجد، مسجد کے تابع ہے، اور اس کی

حرمت مثل مسجد کے ہے لہٰذا اس کا حکم بھی مسجد کے حکم میں ہوگا، چونکہ پہلے بھی مسجد انتظامیہ نے خلاف شرع عمل کیا اور اسے برقرار رکھا اور اب پھر اسی غلطی کا اعادہ کرنے کا ارادہ ہے، مسجد یا مدرسے کی انتظامیہ اگر معلّمہ یا ناظم مدرسہ کو رہائش دینا ہی چاہتے ہیں تو اپنی جیب سے انہیں کرائے پر مکان لے کر دے دیں مالِ وقف سے نہیں۔

چندہ جس مقصد کے لئے جمع کیا گیا ہے،اسے اس کے بجائے دوسرے مصارف پر صرف کرنا

سوال: 40

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ستائیسویں شب کو ختم قرآن کے سلسلہ میں چندہ جمع کیا گیا اور اس چندہ کو مختلف جگہوں پر خرچ کیا گیا ،مثلاً 8000ہزار روپے کے بجلی، گیس وغیرہ کے بل ادا کئے گئے اور مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے ٹینٹ لگایا گیا، تو اس کا بھی کرایہ ختم قرآن سے نکالا گیا اور جمعدار کو 500سو روپے ختم قرآن سے دیا گیا اور اعتکاف والوں کو پھول کے ہار پہنائے گئے ۔براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بتایئے، (حبیب اللہ چشتی ،اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

چندہ یا عطیہ جمع کرنے میں ہمیشہ یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ جس کام کے لئے جمع کیا گیا ہے صرف اسی کام میں خرچ کیا جائے، کسی دوسرے کام میں خرچ نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس کام میں خرچ کرنے کے بعد جو رقم بچ جائے تو جن لوگوں سے چندہ لیا گیا تھا، ان کو واپس لوٹا دیا جائے یا ان لوگوں سے اجازت لیکر اسے دوسرے کام میں خرچ کیا جائے۔

اگر محض ختم قرآن کے نام سے چندہ جمع کیا گیا تھا تو اس رقم سے دوسرے امور کی ادائیگی نہیں کی جاسکتی ،ہاں اگر چندہ لیتے وقت، دینے والوں سے یہ اجازت لے لی گئی ہو کہ وہ اس رقم کے خرچ میں یہ اختیار دے دیں کہ جس نیک کام میں مناسب سمجھیں ،عطیہ جمع کرنے والے اس رقم کو وہاں خرچ کرنے کے مختار ہوں گے تو اس صورت میں اس رقم کو دیگر مصارف میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے میلاد و ایصال ثواب کے لئے کئے جانے والے چندے میں سے فاضل چندے کے مصرف سے متعلق سوال ہوا ،آپ نے جواب میں فرمایا:''ایسے چندوں سے جو روپیہ فاضل بچے ،وہ چندہ دہندان کا ہے انہیں کی طرف رجوع لازم ہے، وہ دیگ وغیرہ جس امر کی اجازت دیں، وہی کیا جائے ۔ان میں جو نہ رہے اس کے عاقل بالغ وارثوں کی طرف رجوع کیا جائے ،اگر ان میں کوئی مجنون یا نابالغ ہے تو باقیوں کی اجازت صرف اپنے حصص کے قدر میں معتبر ہوگی، صبی ومجنون کا حصہ خواہی نخواہی واپس دینا ہوگا، اور اگر وارث بھی معلوم نہ ہوں تو جس کام کے لئے چندہ دہندوں نے دیا تھا، اسی میں صرف کریں، وہ بھی نہ بن پڑے تو فقراء پر تصدق کردیں، غرض بے اجازت مالکان دیگ لینے کی اجازت نہیں ۔درمختار میں ہے:ان لم یکن بیت المال معموراً او منتظمافعلی المسلمین تکفینه فان لم یقدر واسألو االناس له ثوبا فان فضل شئی رد للمتصدق ان علم والا کفن به مثله والا تصدق به مجتبیٰ ۔

ترجمہ:''اگر بیت المال میں مال نہ ہو یا کوئی منتظم نہ ہو تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو کفن پہنائیں اور اگر کوئی قادر نہ ہو تو لوگوں سے چندہ لیا جائے اور کفن کے چندہ سے کچھ بچ جائے تو یہ چندہ دینے والا معلوم ہو تو اسے لوٹا دیا جائے ورنہ اس سے ایسے ہی

فقیر کو کفن پہنا دیا جائے، یہ بھی نہ ہوسکے تو کسی فقیر کو صدقہ کر دیا جائے، مجتبیٰ۔

ردالمحتار میں ہے: (قولہ والا کفن بہ مثلہ) ھذا لم یذکرہ فی "المجتبیٰ" بل زادہ علیہ فی البحر عن التجنیس والواقعات قلت وفی مختارات النوازل لصاحب الھدایۃ فقیر مات فجمع من الناس الدراھم و کفنوہ وفضل شئی ان عرف صاحبہ یرد علیہ والا یصرف الی کفن فقیر اٰخر او یتصدق بہ۔

ترجمہ: ماتن کا قول کہ اسی جیسے فقیر کو پہنا دیا جائے، یہ عبارت مجتبےٰ میں مذکور نہیں بلکہ یہ "البحرالرائق" میں "تجنیس" اور "واقعات" کے حوالے سے مذکور ہے میں کہتا ہوں اور صاحب ہدایہ کی کتاب "مختارات النوازل" میں ہے کہ فقیر فوت ہوا تو لوگوں نے چندہ جمع کر کے اس کو کفن دیا اور چندہ بچ گیا، اگر اس زائد چندہ والے شخص معلوم ہو تو اسے واپس کیا جائے، ورنہ اس کو کسی دوسرے فقیر کے کفن میں خرچ کیا جائے یا پھر صدقہ کر دیا جائے۔

اسی طرح اور کتب میں ہے:

ترجمہ: "قلت (میں کہتا ہوں) ردالمحتار میں "مختارات" کی عبارت نقل کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ کسی فقیر کو کفن پہنانے یا صدقہ کرنے میں ترتیب مذکور نہیں ہے، جیسا کہ شرح میں ہے، اقول (میں کہتا ہوں) لیکن خانیہ پھر ہندیہ میں ہے کہ اگر زائد چندے والا معلوم ہو، تو اسے واپس کیا جائے اور اگر معلوم نہ ہو تو پھر کسی اور محتاج کو کفن دیا جائے، اور اگر کسی کفن میں صرف کرنا مقدور نہ ہو تو فقراء پر صدقہ کیا جائے تو یہ عبارت ترتیب کے لئے نص ہے، اس میں شک نہیں کہ اس ترتیب کے اپنانے سے یقیناً عہدہ برآں ہوسکتا، پھر یہ اگر چہ وقف نہیں تو اسکے مشابہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ چندہ دینے والے مالک کی غرض کو پورا کرنا زیادہ محکم ہے، اسی لئے ہم نے

اس ترتیب کو قابلِ اعتماد قرار دیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 134 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس مصرف کے لئے چندہ لیا گیا ہے، اسی پر خرچ کرنا شرعاً لازم ہے، اور اگر اس مصرف سے رقم بچ جائے تو بقیہ رقم یا تو چندہ دینے والوں کو واپس کردی جائے ورنہ اگر چندہ دہندگان دستیاب نہ ہوں تو اس رقم کو فقراء پر صدقہ کردیا جائے۔

مسجد کا استعمال شدہ سامان کسی دوسری مسجد میں دینا

سوال: 41

ہماری مسجد میں لاتعداد قرآن پاک، صفیں اور مدرسہ میں قرآن پاک رکھ کر پڑھنے والی بنچیں ہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں ہمیں مشورہ دیں کہ آیا ہم یہ مسجد کا سامان کسی اور مسجد یا مدرسہ میں دے سکتے ہیں جہاں ان چیزوں کی ضرورت ہو؟، (انتظامیہ جامع مسجد نورانی۔لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

مسجد میں پڑھنے کے لئے جو قرآن مجید کے نسخے رکھے جاتے ہیں، اگر کمیٹی کے لوگ چاہیں تو انہیں دوسری مسجد کو بھی دے سکتے ہیں، کہ وہ صرف اسی مسجد میں قرأت کرنے کے لئے موقوف نہیں ہوں گے علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: انہ لو وقف مصحفاً علی المسجد جاز ویقرء فی ذلک المسجد وفی موضع آخر ولا یکون مقصوراً علی ھذا المسجد فھذا یدل علی عدم تعیین المکان۔

ترجمہ: "جب کوئی مصحف (قرآن مجید کا نسخہ) کسی مسجد کے لئے تلاوت کی غرض سے وقف کیا ہو تو جائز ہے کہ اس مسجد والے اس قرآن کی اسی مسجد میں تلاوت کریں اور دوسری جگہ بھی تلاوت کرسکتے ہیں، صرف اسی مسجد کے لئے مخصوص نہیں ہوگا، پس یہ

تعیین مکان کی نفی پر دلیل ہے، مزید لکھتے ہیں کہ: وأما الحصیر والقنادیل فالصحیح من مذهب ابی یوسف أنه لا یعود الی ملك متخذه بل یحول الی مسجد آخر أو یبیعه قیم المسجد للمسجد ۔

ترجمہ: ''چٹائیاں اور قندیلیں اگر مسجد کے لئے بے کار ہو جائیں تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ دینے والے کی ملک کی طرف نہیں لوٹیں گی بلکہ کسی دوسری مسجد کو دے دی جائیں گی یا متولی مسجد انہیں مسجد کے کام میں صرف کردے ، (البحر الرائق ،جلد 5،ص: 381،ص: 421 مکتبہ رشیدیہ ،کوئٹہ)''۔

لہٰذا جب ضرورت سے زائد قرآنی نسخے موجود ہوں تو ان کو کسی دوسری مسجد یا ایسی جگہوں پر جہاں پڑھنے والے زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے ہوں اور ان کو قرآن کی ضرورت ہے ،تو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے ،اسی طرح چٹائیاں اور ڈیسک بھی اگر مسجد کے استعمال کے لئے کارآمد نہ ہوں ،تو دوسری مسجد کو دیئے جاسکتے ہیں اور متولی مسجد انہیں فروخت کر کے دیگر مصالح مسجد کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔

خزانچی کے گھر سے مسجد کی رقم کی چوری

سوال: 42

مسجد کمیٹی کے خزانچی یا دوسرا ذمہ دار جس کے پاس مسجد کا فنڈ موجود ہوتا ہے، اسکے گھر پر ڈکیتی پڑی اور ڈاکو مسجد کا فنڈ بھی لے گئے جو کہ تقریباً پچیس ہزار اور گھر کا دیگر سامان، T.V ،کمپیوٹر، زیورات ،موبائل وغیرہ لے گئے ۔اب کمیٹی کا ذمہ دار یہ فنڈ مسجد کو دے گا یا معاف ہو جائے گا؟، (محمد توفیق ، C-11 بلاک N نارتھ ناظم آباد ،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص (خزانچی یا ذمہ دار) کی حیثیت امین کی سی ہے اور مسجد کا مال اس کے پاس بطور امانت تھا لہذا اگر اس نے اس کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی تو اس پر کوئی ضمان نہیں اور صورت مسئولہ سے یہی ظاہر ہے کہ اس کی جانب سے کوئی غفلت نہیں پائی گئی۔ ہاں اگر حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی کی تو ضمان ہوگا جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: اگر متولی نے کوئی بے احتیاطی نہ کی تو اس پر تاوان نہیں لانــه كــالــوصـي امـيـن فـالقول قولـه بيمين۔ (کیونکہ وہ (متولی) وصی کی طرح امین ہے تو قسم کے ساتھ اس کی بات مان لی جائے گی) اور اگر بے احتیاطی کی مثلاً صندوق کھلا چھوڑ دیا غیر محفوظ جگہ رکھا تو اس پر تاوان ہے لان الامين بالتعدى ضمين۔ (کیونکہ حد سے تجاوز (لاپرواہی اور بے احتیاطی) کی وجہ سے امین پر ضمان لازم ہوتا ہے) (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 570 رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

لیکن یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ آیا قواعد وضوابط کی رو سے اتنی رقم خزانچی صاحب کو گھر میں رکھنے کا اختیار ہے اور انہیں اس کی اجازت ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس پر کوئی ضمان نہیں ہے، ورنہ یہ بلا اختیار اتنی رقم گھر میں رکھنا اس کی جانب سے تعدی (اختیارات وحدود سے تجاوز) میں شامل ہوگا اور اس پر ضمان آئے گا اور اگر یہ عمل پوری انتظامیہ کی اجازت سے ہے تو وہ سب اس ذمہ داری میں شریک ہوں گے۔

مسجد اور مسلک

سوال: 43

ہمارے علاقے کی جامع مسجد ابو ہریرہ واقع سیکٹر V گلشنِ معمار 1996ء

میں ٹرسٹ ہوئی یہ مسجد مسلک حقہ اہلسنت وجماعت حنفی بریلوی کے نام سے ٹرسٹ ہوئی اس مسجد کا مکمل انتظام مسلک حقہ اہلسنت حنفی بریلوی کے زیرِ انتظام چلایا جاتا ہے چند دن پہلے مسجد انتظامیہ نے سائن بورڈ سے لفظِ بریلوی مٹوا دیا ان سے جب پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا کہ ہم نے بریلوی لکھ کر اپنے آپ کو بریلویت تک محدود کر لیا ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قول وفعل سے کسی کی دل آزاری نہ ہو، کیونکہ مسجد اللہ کا گھر ہے اس میں سب کو نماز پڑھنے کا حق ہے اس لئے لفظ بریلوی مٹا دیا گیا ہے۔ اب چونکہ لفظِ بریلوی مٹانے پر تنازعہ شروع ہو چکا ہے، لہٰذا آپ سے التماس ہے کہ دلائل کی روشنی میں واضح فرمائیں کہ کیا مسجد انتظامیہ کا مذکورہ بالا موقف درست ہے، جبکہ یہ لفظ پہلے سے ٹرسٹ دستاویزات میں بھی تحریر شدہ ہے کیا اس کو دوبارہ لکھوا دیا جائے یا ضروری نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں، (محمد آفتاب قادری، سیکٹر V گلشنِ معمار، کراچی)۔

جواب:

ہمارے نزدیک دینِ اسلام کے صراطِ مستقیم کی صحیح تعبیر کا حامل مسلک اہلسنت وجماعت ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث مبارک سے مستفاد ہے جس میں آپ ﷺ نے فرقۂ ناجیہ (یعنی آخرت میں نجات پانے والے مکتبۂ فکر) کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ: "ما انا علیہ و اصحابی" یعنی فرقۂ ناجیہ وہ کہلائے گا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریق (حق) پر قائم و ثابت ہو، اس کو ہم "اہلِ سنت و جماعت" سے تعبیر کرتے ہیں، اب اہلِ سنت وجماعت میں چار مسلّمہ مکاتبِ فکر ہیں، جنہیں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کہا جاتا ہے، پاکستان میں چونکہ غالب اکثریت حنفی مکتبۂ فکر کی ہے، اس لئے امتیاز کے لئے "سنی حنفی" بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ "اہل

سنت و جماعت" یا "سُنی حنفی" میں بھی پاکستان کے تناظر میں ایک ابہام رہ جاتا ہے، کیونکہ برصغیر پاک وہند کے عرف میں سنی حنفی مکتبۂ فکر کے دوگروہ ہیں، ایک کوعرف عام میں بریلوی کہا جاتا ہے، جو امام احمد رضا خان قادری حنفی بریلوی قدس سرہم العزیز کی طرف منسوب ہے کیونکہ اس وقت کے ہندوستان کے تناظر میں بعض کلامی و اعتقادی مسائل پر اختلاف ہوا اور بعض علماء کی عبارات سے توہین الوہیت و رسالت کا ایہام وتاثر پیدا ہوتا تھا، جس کی نشاندہی انہوں نے فرمائی اور متنبہ فرمایا، اس کے مقابل ایک مکتبۂ فکر علماء دیوبند کی طرف منسوب ہو کر دیوبندی کہلایا۔ اب یہ تقسیم عرف جدید ہے اور عوام وخواص میں شائع وذائع ہے۔ اور بعض مساجد کے ٹرسٹ کے اغراض ومقاصد یا انجمن اساسی دستاویزات میں بھی لکھ دیا جاتا ہے اور بعض جگہ مساجد کے بورڈز پر بھی لکھا ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ بعد میں فرقہ وارانہ تنازعات کا سدِ باب ہو سکے، جس مسجد کی بنیاد جس نے ڈالی ہے وہ اسی کے پاس رہے اور اسی کا استحقاق تسلیم کیا جائے، لہٰذا مستقبل کے تنازعات کو رفع کرنے، مسجد کو باہمی آویزش سے بچانے کے لئے پاکستان کے عرف عام کے تناظر میں بریلوی لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ درس، تقریر اور خطابات میں ائمہ وخطباء کو مثبت انداز بیان اختیار کرنا چاہئے، اپنے مسلک کی حقانیت کو کتاب وسنت اور فقہ حنفی کے دلائل سے مزین کر کے بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی کراہت اور عذر کی بنا پر جواز کی صورتیں

سوال: 44

ہماری مسجد سے متصل جنازہ گاہ ہے، جس میں میت کو لانے کے لئے باہر سے دروازہ ہے اور نمازی حضرات کے لئے مسجد ہی سے دروازہ ہے، بعض اوقات

جنازہ گاہ بھر جاتی ہے اور بقیہ نمازی مسجد میں صف بنا لیتے ہیں ایک صاحب کا کہنا ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے یہ گناہ کا کام ہے براہِ کرم واضح فرمائیے کیا ایسی صورت میں دیگر شرکاء مسجد میں صف بنائیں یا نمازِ جنازہ سے محروم رہیں؟،(انتظامیہ جامع مسجد غوثیہ، آگرہ تاج کالونی لیاری، کراچی)۔

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن ابی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ: من صلیٰ علی جنازة فی المسجد فلا شئی له ۔

ترجمہ:"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :جس نے مسجد میں (رکھی ہوئی) میت کی نمازِ جنازہ پڑھی ،اس کے لئے کوئی (اجر) نہیں ہے،(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:3184)"۔اس حدیث کو امام ابن ماجہ ،امام عبدالرزاق ،امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے ۔فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی، علامہ ابن ہمام نے کراہتِ تنزیہی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ یہ افضل اور اولیٰ کا خلاف ہے، یعنی مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا بھی مباح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ خارجِ مسجد پڑھی جائے ،(فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد:2،ص:1026)"۔

علامہ خوارزمی لکھتے ہیں:"اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ہے: من صلیٰ علی جنازة فی المسجد فلا شئی له ۔ اس حدیث میں ظرف (فی المسجد) کا تعلق اگر صلیٰ کے ساتھ کیا جائے تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہوگا (کیونکہ

ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر میت کی نمازِ جنازہ پڑھی ،خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا مسجد سے باہر، اگر نمازی مسجد کے اندر کھڑا ہے تو یہ نماز جنازہ بہرصورت مکروہ ہے)اوراگر ظرف (فی المسجد) کوجنازہ کی صفت بنایا جائے ،تو پھر صرف اس وقت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہوگا جب جنازہ مسجد میں رکھا ہوا ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کراہت کی علّت یہ ہو کہ مسجد کوصرف فرض پڑھنے کے لئے بنایا گیا ہے ،تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے،اوراگر کراہت کی علّت یہ ہو کہ مسجد (میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی صورت میں مسجد) کے نجاست میں آلودہ ہونے کا خدشہ ہے ،تو جب جنازہ مسجد سے باہر ہوتو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہوگا ،شمس الائمہ نے مبسوط میں اسی طرف میلان کیا ہے، (کفایہ مع فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم،علامہ غلام رسول سعیدی،جلد:2،ص:291028,)"۔

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی لکھتے ہیں:وعندنا اذا كانت الجنازة خارجَ المسجد لم يكره ان يصلى الناس عليها فى المسجد انما الكراهةفى ادخال الجنازة لقوله عليه الصلوٰة والسلام جَنّبُوْ امساجدَكم صبيانَكم ومجانيَكم فاذا كانَ الصبيُّ يُنْهٰى عن المسجد فالميّتُ اولىٰ ۔

ترجمہ:" جب جنازہ مسجد سے باہر ہوتو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، کراہت صرف میت کومسجد کے اندرداخل کرنے میں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :بچوں اور پاگلوں کواپنی مسجد سے دور رکھو، جب بچوں کومسجد سے دور رکھنے کا حکم ہے،تو میت کو دور رکھنا اولیٰ ہے،(المبسوط جلد 2ص: 68،مطبوعہ دارا لمعرفۃ ،بیروت)"۔

علامہ سید طحطاوی لکھتے ہیں:و كلام شمس الائمه السرخسى يفيدان هذا هو

المذهب حيث قال وعندنا ان كانت الجنازة خارج المسجد لم يكره ان يصلى عليها فى المسجد۔

ترجمہ: ''شمس الائمہ سرخسی کی (اس) عبارت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ احناف کا مذہب (مختار) یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ اگر جنازہ مسجد سے باہر ہو تو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح جلد 2 ص:240 المکتبۃ الغوثیہ، کراچی)''۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وكرهت تحريما) وقيل (تنزيها فى مسجد جماعةهو) اى الميت (فيه) وحدهٗ او مع القوم (واختلف فى الخارجة) عن المسجد وحدهٗ او مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً۔

ترجمہ: ''اور ایسی مسجد میں جہاں جماعت کا اہتمام ہو، (نمازِ جنازہ) مکروہ تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہِ تنزیہی ہے، خواہ صرف میت مسجد میں رکھی یا میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، جب صرف میت مسجد سے باہر رکھی ہو (اور نمازی مسجد کے اندر ہوں) یا میت کے ساتھ کچھ نمازی بھی مسجد سے باہر ہوں (اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں) تو اس صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے، اور مختار قول یہ ہے کہ بہر صورت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، (یعنی میت اور سب نمازی مسجد کے اندر ہوں یا میت اور بعض نمازی مسجد سے باہر ہوں اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں مگر ظاہر ہے کہ کراہت صرف ان نمازیوں کے حق میں ہوگی، جو مسجد کے اندر کھڑے ہیں)۔ درمختار کی اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران اس امر پر بھی کلام کیا ہے کہ حدیث پاک'' (من

صلیٰ علی جنازة فی المسجد فلا شئی له ۔ ''(یعنی جس نے مسجد میں میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، اس کے لئے کوئی اجر نہیں)اور ایک روایت میں ہے "فلیس له اجر ")۔اس حدیث میں ''فی المسجد''میں تین احتمالات ہیں:(1) یہ کہ ظرف ''صلیٰ'' سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ: جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر کسی میت کا جنازہ پڑھا،تو اس کے لئے کوئی اجر نہیں ،(اس کی رو سے دونوں احتمالات یکساں ہیں،خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا خارجِ مسجد)،(2) یہ کہ ظرف ''فی المسجد''میت سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے کسی کی نماز جنازہ پڑھی، دراں حالیکہ میت مسجد میں رکھی ہو،تو اس کے لئے کوئی اجر نہیں ،اس کی رو سے دونوں احتمالات کا یکساں حکم ہوگا،خواہ نماز پڑھنے والے مسجد میں کھڑے ہوں یا خارجِ مسجد ۔(3) یہ کہ ظرف (فی المسجد) ''صلیٰ''اور''میت''دونوں کے ساتھ متعلق ہو ،تو اس صورت میں جب نمازی اور میت دونوں مسجد میں ہوں گے،تو نمازِ جنازہ مکروہ ہوگی ،اور اگر کوئی ایک (نمازی یا میت)خارجِ مسجد ہے تو نماز مکروہ نہیں ہے ،(اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں: اور ان تمام صورتوں میں یہ مفہوم مذہبِ مختار کے خلاف ہے ،(کیونکہ مذہبِ مختار یہ ہے)مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،ج:3،ص:118 ،داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وصلاةُ الجنازة فی المسجد الذی تقام فیه الجماعة مکروهةٌ سواء کان المیت والقوم فی المسجد أو کان المیتُ خارجَ المسجد والقوم فی المسجد او کان الامام مع بعض القوم خارجَ المسجد والقوم الباقی فی المسجد اوالمیت فی المسجد والامام والقوم خارج المسجد،

هو المختار كذا في الخلاصة۔

ترجمہ: ''جس مسجد میں نماز باجماعت (باقاعدگی سے) ہوتی ہو، اس میں نماز جنازہ مکروہ ہے، خواہ (1) میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، (2) یا میت مسجد سے باہر ہو اور نماز پڑھنے والے مسجد میں ہوں، (3) یا امام اور بعض نماز پڑھنے والے مسجد سے باہر ہوں اور باقی لوگ مسجد میں ہوں، یا میت مسجد میں ہو اور امام اور مقتدی مسجد سے باہر ہوں، یہی مذہب مختار ہے اور ''خلاصہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: 1، ص: 165، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اگر بارش ہو رہی ہو تو اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''ولا تكره بعذر المطر ونحوه هكذا في الكافي''۔

ترجمہ: ''اور بارش یا اس جیسے دیگر اعذار کی بنا پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج: 1، ص 165، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

بعض تنگ شہری علاقوں میں مسجد کے باہر کھلی جگہ ہوتی ہی نہیں، جہاں نماز جنازہ پڑھی جا سکے، ایسی صورت میں بعض مقامات پر لوگ سڑکوں یا گلیوں کو بلاک کر کے وہاں پر جنازہ پڑھتے ہیں، جبکہ شارع عام اور دوسرے کی زمین پر بلا اجازت جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''تكره في الشارع واراض الناس كذا في المضمرات''۔

ترجمہ: ''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلا اجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج: 1، ص: 165، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

تو جس طرح ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ بارش اور اس جیسے دیگر اعذار کی بناء

پر مسجد میں نمازِ جنازہ مکروہ نہیں ہے،تو دیگر اَعذار میں جگہ کی تنگی یا کسی مقام پر کھلی جگہ کا بالکل نہ ہونا بھی اِن اَعذار میں شامل ہے،لہٰذا ایسی صورت میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے اور بعض مساجد میں محراب کے آگے میت ،امام اور ایک یا چند صفوں کی لوگوں کے لئے جگہ ہوتی ہے،اور بقیہ لوگ مسجد کے اندر متصل صف بندی کرتے ہیں،بر بناء عذر یہ بھی جائز ہے اور مکروہ نہیں ہے پھر سڑک پر سب کا حق ہے،اسے لوگوں کی آمد ورفت کے لئے بند کر دینا مستحسن نہیں ہے خواہ تقریبات کے لئے ہو، مجھے میرے استاد علامہ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان کے استاد مکرم محدث اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ کو ہم ایک تنگ راستے پر لے جا رہے تھے اور ہم آگے سے لوگوں کو ہٹا کر راستہ بنا رہے تھے،آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو، راستے پر سب کا حق ہے۔آپ نے اپنے محلے اور مسجد کی جو صورتِ حال بیان کی ہے کہ جنازہ گاہ موجود ہے اور جنازے کی نماز جنازہ گاہ ہی میں ادا کی جاتی ہے لیکن جگہ کی تنگی کے باعث کچھ نمازی متصلاً مسجد میں صفیں بنا لیتے ہیں،جگہ کی تنگی کے عذر کی بنا پر یہ جائز ہے،البتہ جہاں مسجد سے باہر جنازہ گاہ یا کھلا میدان موجود ہو اور سب نمازی جنازہ گاہ میں سما جاتے ہوں،وہاں پر مسجد میں مطلقاً نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے اور جو مسجد صرف جنازہ گاہ کے طور پر بنائی گئی ہے،وہاں پر مطلقاً نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

نامکمل وقف

سوال : 45

میری ملکیت ایک پلاٹ تھا جس کا K-D-A کے کاغذات کے مطابق ایک اور دعوے دار موجود تھا مطلب کہ پلاٹ متنازعہ تھا ہمارے علاقے میں مدرسے کی ضرورت تھی میں نے وقتی طور پر فی الحال کی نیت سے مدرسے والوں کو پلاٹ کی فائل

دی، گھر والوں کو خبر ہوئی تو زوجہ نے کہا کہ پلاٹ تو آپ نے بچی کے نام کرنے کی نیت سے لیا تھا اب میں فائل واپس مانگتا ہوں تو مدرسے کے منتظمین فتویٰ مانگتے ہیں ، کہتے ہیں کہ وقف کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاسکتی مگر میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے وقف یا ھبہ نہیں کیا تھا صرف وقتی طور پر فائل دی تھی دوسری بات یہ کہ قانونی طور پر متنازعہ پلاٹ مسجد یا مدرسے کو نہیں دیا جاسکتا، برائے کرم رہنمائی فرمائیں میں کافی عرصے سے پریشانی کا شکار ہوں، (سید محفوظ علی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

وقف یا ھبہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ واقف (وقف کرنے والا) وقتِ وقف اس شے کا مالک ہو، جسے وہ وقف کر رہا ہے اگر وقتِ وقف مالک نہ تھا اور پھر مالک ہو گیا، جب بھی یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں :

ومنها الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه أو صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفاً كذا في البحر الرائق۔

ترجمہ: "(وقف کی شرائط میں سے) ایک شرط یہ بھی ہے کہ وقف کرتے وقت واقف اس شے کا مالک ہو یہاں تک کہ اگر کوئی (شخص کسی) زمین کو غصب کر کے وقف کردے پھر اس کے مالک سے اس زمین کو خرید لے اور قیمت مالک کو ادا کردے یا کچھ دینے پر مصالحت کرلی تو یہ وقف (درست) نہیں ہوسکتا، "البحر الرائق" میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 353 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

وقف کے لئے مخصوص الفاظ ہیں جن سے وقف صحیح ہوتا ہے، مثلاً میری یہ

جائیداد صدقۂ موقوفہ ہے کہ ہمیشہ مساکین پر اس کی آمدنی صرف ہوتی رہے یا اللہ تعالیٰ کے لئے میں نے اسے وقف کیا۔ مسجد یا مدرسہ یا فلاں نیک کام پر میں نے وقف کیا یا فقراء پر وقف کیا۔ اس چیز کو میں نے اللہ کی راہ کے لئے کر دیا۔ صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو یہ وقف نامکمل ہے محض فائل دینے سے وقف مکمل نہیں ہوتا، مدرسہ والوں کو چاہئے کہ آپ کی فائل واپس کردیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

غسل میت سے پہلے ایصالِ ثواب یا قرآن خوانی

سوال: 46

اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور لوگ فوری طور پر قرآن خوانی کرنا چاہیں تو کیا اس کی اجازت ہے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جب تک میت کو غسل نہ دیا جائے، قرآن خوانی کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ ازراہِ کرم رہنمائی فرما دیجیے، (سید عابد علی، کراچی)۔

جواب:

فی نفسہٖ زندہ یا مردہ کسی بھی شخص کے لئے کسی بھی وقت میں ایصالِ ثواب یا دعائے مغفرت کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہو تو غسل یا تدفین سے پہلے اس کے لئے دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب جائز ہے، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے اس پر بحث کی ہے کہ میت سامنے رکھی ہو اور ابھی اسے غسل نہ دیا ہو تو اس کے سامنے اسی مقام پر تلاوت قرآن کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ فقہاء نے اس پر گفتگو کی ہے اور اس کی وجوہ پر بحث کی ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: بلکہ جن کے نزدیک موت سے بدن نجس ہو جاتا ہے اور غسل میت اُسے نجاستِ حقیقیہ سے تطہیر کے لئے رکھا گیا ہے، وہ قبل غسل میت کے پاس بیٹھ کر تلاوت کو منع کرتے ہیں جب تک اسے بالکل ڈھانک نہ دیا جائے کہ نجاستِ منکشفہ کا قرب ہوگا، تنویر میں ہے:

کرہ قرأۃ القرآن عندہ الی تمام غسلہ۔

ترجمہ: ''میت کو غسل دینے تک اس کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے''۔ درمختار میں ہے:

علله الشرنبلالی فی امدادالفتاح تنزیھا للقرآن عن نجاسة المیت لتنجسه بالموت قیل نجاسة خبث وقیل حدث وعلیه فینبغی جوازھا کقراءة المحدث۔

ترجمہ: امدادالفتاح میں علامہ شرنبلالی نے اس کی یہ علت بیان فرمائی کہ قرآن مجید کو میت کی نجاست اور ناپاکی سے بچایا جائے، کیونکہ وہ (میت) موت کی وجہ سے ناپاک ہوجاتی ہے، پھر اس نجاست میں اختلاف ہے، چنانچہ بعض نے کہا کہ یہ نجاست خبث ہے جبکہ بعض کے نزدیک حدث ہے۔لہٰذا اس بنیاد پر لازم ہے کہ میت کے پاس تلاوت قرآن مجید جائز ہو، جیسے بے وضو کا یاد سے قرآن پڑھنا۔

ردالمحتار میں ہے: وذکر ان محل الکراھة اذا کان قریبا منه اما اذا بعد عنه فلا کراھة قلت والظاھر ان ھذاایضا اذالم یکن المیت مسجی بثوب لیستر جمیع بدنه۔

ترجمہ: ''علامہ طحطاوی نے ذکر کیا کہ اس کراہت کا محل یہ ہے کہ جب (تلاوت کرنے والا) میت کے قریب بیٹھا ہو، لیکن جب وہ اس سے دور بیٹھا ہے، (اور قرآن مجید پڑھ رہا ہے) تو پھر کراہت نہ ہوگی، میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ کراہت بھی تب ہوگی جب میت کسی ایسے کپڑے سے جو اس کے سارے جسم کو چھپائے ڈھانپی ہوئی نہ ہو، (فتاوی رضویہ جلد: 23، ص: 454 - 453، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس بحث کی کا مستفاد یہ ہے کہ فی نفسہٖ غسل میت سے پہلے میت سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھ کر میت کے لئے ایصال

ثواب کرنے یا قرآن خوانی کی کوئی ممانعت نہیں ہے، ہاں اگر میت کے قریب بیٹھ کر تلاوت کریں اور میت کو کپڑے یا چادر سے ڈھانپ کر رکھ دیا گیا ہو، تب بھی حرج نہیں ہے، ہاں اگر میت کو کپڑے سے ڈھانپا ہوا نہیں ہے، کھلی ہے، تو اس میں فقہاء کرام کے دو اقوال ہیں، جو اسے بے وضو (محدث) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک جائز ہے اور جو اسے خبث (نجاستِ حقیقی) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک وہاں پر تلاوت مکروہ ہے۔

مصنوعی دانتوں کے ساتھ تدفین

سوال: 47

کسی شخص کے انتقال کے بعد تدفین کے وقت مصنوعی دانتوں (جو کہ فکس ہیں اور نکالے نہیں جا سکتے)، کے ساتھ دفن کیا جا سکتا ہے، (جمال سیکٹر 3-7D، نارتھ کراچی)۔

جواب:

مسلمان میت کی تجہیز و تکفین، تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے، کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو، نہ کیا جائے۔ مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم و تکریم کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے۔ محقق علی الاطلاق رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ فتح القدیر، جلد: 2، ص: 102، (مکتبۂ نوریہ رضویہ سکھر) میں فرماتے ہیں: وتوضیحہ الاتفاق علی انّ حرمۃ المسلم میتاً کحرمتہ

حیاً۔ ترجمہ:اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت وحرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے۔(ت)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کسر عظم المیت واذاہ ککسرہ حیاً۔ رواہ امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ باسناد حسن عن اُمّ المؤمنین عائشہ الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ ترجمہ: ''مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ نے بسند حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا''۔ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، المیت یؤذیہ فی قبرہ ما یؤذیہ فی بیتہ۔ ترجمہ: ''سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں:افـــادان حرمۃ المؤمن بعد موتہ باقیۃ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیاتہ رواہ ابی بکر بن ابی شیبۃ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔علماءفرماتے ہیں:المیت یتاذی بما یتاذی بہ الحی ۔ کذا فی ردّالمحتار وغیرہ من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے،مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں،جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔(ت)علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں:ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت متالم میگردد بجمیع انچہ متالم میگردد بدان حی ولازم ایست کہ متلذ ذگردد بتمام انچہ متلذذ می شود بدان زندہ، انتہی ۔اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ

کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (ت)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 442-441، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا "کاٹا مردے کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

نا جائز ہے، فی الدر لا یسرح شعرہ ای یکرہ تحریما ولا یقص ظفرہ الا المکسور ولا شعرہ ولا یختن، وفی ردالمحتار عن النھر عن القنیۃ التزیین بعد موتھا و الامتشاط وقطع الشعر لا یجوز۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: "درمختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھانہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں، مگر وہ جو ٹوٹا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، ردالمحتار میں "نہر" سے، اس میں "قنیہ" سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زینت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 91-92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نہ صرف میت کی تعظیم وتکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم وادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ:"لأن یجلس احدکم علی جمرۃ فتحرق ثیابہ حتی تخلص الی جلدۃ خیرلہ من أن یجلس علی قبر"۔

ترجمہ: "ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس

سے کہ قبر پر بیٹھے،(ابو داؤد، رقم الحدیث : 3220،مطبوعہ موسسۃ الریان بیروت)"۔

عن عقبۃ بن عامر،قال: قال رسول اللہ ﷺ:لأن امشی علی جمرۃ أو سیف،أو اخصف نعلی برجلی،أحبّ الیّ من ان امشی علی قبر مسلم۔وما أبالی اوسط القبور قضیت حاجتی،أو وسط السوق"

ترجمہ:"عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: مجھے زیادہ پسند ہے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا ، بہ نسبت اس کے کہ قبرِ مسلم پر چلوں،اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:1568،مطبوعہ دارالفکر بیروت)"۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ مصنوعی دانت اس طور پر نصب کیے ہوئے ہیں جنہیں نکالا نہیں جاسکتا ،اور انہیں نکالنے کی کوشش کرنا میت کو اذیت دینا ہے،اور میت کو اذیت دینا جائز نہیں ہے،لہٰذا مصنوعی دانتوں کے ساتھ میت کی تدفین جائز ہے۔

پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت

سوال: 48

کیا شریعت میں پوسٹ مارٹم کی اجازت ہے؟،اگر اجازت ہے تو قرآن پاک یا حدیث میں ہے اس کی کوئی مثال موجود ہے؟۔

سوال: 49

کیا شہید کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے؟،کیونکہ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ سر(چہرے) سے لے کر پیٹ تک اس کو کاٹتے ہیں،صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ گولی سے مرا ہے یا کسی چاقو سے یا گولی کتنی دور سے لگی ہے یا زخم کتنا گہرا ہے۔اور اس کے

بعد قانون میں اتنا ہے کہ یہ میڈیکل رپورٹ صرف موت کا سبب جاننے کے لئے کی جاتی ہے،اور قانون میں صرف اس رپورٹ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا یہ تو صرف گواہوں کی گواہی سے مشابہت کرنے کے لئے ہوتی ہے، کہ واقعی گواہان سچ بول رہے ہیں کورٹ میں۔

سوال: 50

کیا کسی بھی آدمی (مردہ) کو قبر سے نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم کیا جا سکتا ہے،شریعت اجازت دیتی ہے؟ یہ سب اور آپ کو تو معلوم ہے کہ پاکستان میں میڈیکل رپورٹس کیسے دی جاتی ہیں، کیا اس کے باوجود بھی پوسٹ مارٹم کیا جا سکتا ہے؟، (منصور علی ایڈوکیٹ، ڈسٹرکٹ لاڑکانہ تحصیل میرو خان ولیج ٹیو ٹھارو ودھو)۔

جواب:

آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پیشتر مسلمان میت کی حرمت سے متعلق ہم چند حوالے نقل کرتے ہیں: مسلمان میت کی تجہیز و تکفین ،تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے ،کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو،نہ کیا جائے۔مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم وتکریم کا اندازہ ہوتا ہے،امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے۔محقق علی الاطلاق رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ فتح القدیر ،(جلد:2،ص:102،مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)میں فرماتے ہیں:وتوضیحہ الاتفاق علی انّ حرمۃالمسلم میتاً کحرمتہ حیاً۔ ترجمہ:اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت وحرمت زندہ

مسلمان کی طرح ہے۔(ت)۔نبی ﷺ فرماتے ہیں: کسر عظم المیت واذاہ ککسرہ حیاً۔ رواہ امام احمد وابوداؤد و ابن ماجہ باسناد حسن عن اُمّ المؤمنین عائشہ الصدیقۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا۔

ترجمہ:"مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ نے بسندِ حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا"۔یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، المیت یؤذیہ فی قبرہ ما یؤذیہ فی بیتہ۔ ترجمہ:"سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں:افادان حرمۃ المؤمن بعد موتہ باقیۃ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیاتہ رواہ ابی بکر بن ابی شیبۃ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔علماء فرماتے ہیں:المیت یتاذی بما یتاذی بہ الحی ۔کذا فی ردّالمحتار وغیرہ من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے،مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں،جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔(ت)علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں:ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت متالم میگردد بجمیع انچہ متالم میگردد بدان حی ولازم لغست کہ متلذذ گرود بتمام انچہ متلذذمی شود بدان زندہ،انتہی ۔اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے،ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے،اور یہ لازم ہے

کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہوان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 442-441، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا" کاٹا مردے کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟، اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "نا جائز ہے، فی الدر لا یسرح شعرہ ای یکرہ تحریما و لا یقص ظفرہ الا المکسور و لا شعرہ و لا یختن، وفی ردالمحتار عن النھر عن القنیۃ التزیین بعد موتھا و الامتشاط وقطع الشعر لا یجوز۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: "درمختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھا نہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں، مگر وہ جو ٹوٹا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، ردالمحتار میں "نہر" سے، اس میں "قنیہ" سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زینت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 9، ص: 92-91، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

نہ صرف میت کی تعظیم وتکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم وادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "لأن یجلس احدکم علی جمرۃ فتحرق ثیابہ حتی تخلص الی جلدۃ خیر لہ من أن یجلس علی قبر"۔

ترجمہ: "ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے، (ابو داؤد، رقم الحدیث: 3220، مطبوعہ موسسۃ الریان بیروت)"۔

میت کے پوسٹ مارٹم کی ضرورت دو جگہ پیش آتی ہے، ایک ہے ضرورتِ تعلیم، اس کے لئے عام طور پر کسی لاوارث میت کو قبضے میں کرنے کے بعد میڈیکل کالج کے طلباء اس کے جسم پر آپریشن کی مشق کرتے ہیں اور اس کے جسم کے مختلف اعضاء پر طبی نوعیت کے تجربات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ سرجری کی مشق کے لئے جانوروں اور غیر مسلم اموات کو حاصل کرنا چاہئے اور مسلم اموات پر سرجری کی مشق کرنا جائز نہیں ہے اور غیر مسلم اموات کا حصول اس قدر دشوار نہیں ہوتا جس کی بنا پر مسلمان میت کی چیر پھاڑ کر کے اس کی بے حرمتی کی جائے۔

آج کل انسانی جان کو بچانے کے لئے سرجری اور آپریشن ایک ضروری طریقہ علاج ہے پتہ یا مثانہ میں پتھری کی صورت میں آپریشن کے ذریعے پتھری کو باہر نکالا جاتا ہے، اگر گردہ خراب ہو جائے تو اس کو آپریشن کر کے باہر نکال دیتے ہیں، بعض دفعہ عورت کے پیٹ میں بچہ آڑا یا ترچھا ہوتا ہے اور اگر آپریشن کے ذریعے ڈیلیوری نہ کی جائے تو ماں اور بچہ دونوں مر جاتے ہیں، بعض دفعہ جسم کے کسی عضو میں کوئی ناسور ہو جاتا ہے اور باقی جسم کو اس کے زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے اس عضو کو کاٹنا پڑتا ہے، بعض حادثات میں جسم کی مختلف ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اس موقع پر ہڈی جوڑنے کے لئے آپریشن ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح بم کے ٹکڑوں اور گولیوں کو جسم سے نکالنے کے لئے آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے۔

پوسٹ مارٹم کی دوسری وجہ جو بالعموم پیش آتی ہے وہ ہے مقدمہ کی تحقیق اور کسی بے قصور مسلمان کو قتل کی سزا سے بچانے کا مسئلہ مثلاً ایک شخص کو پولیس نے پستول سمیت پکڑ لیا اور اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنے پستول سے فلاں شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے، جبکہ ملزم یہ کہتا ہے کہ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی اور تمام شواہد اور قرائن ملزم کے

خلاف ہیں، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ مقتول کے جسم میں جو گولی ہے آیا وہ اس نمبر کی گولی ہے جو ملزم کے پستول میں ہے یا کوئی اور گولی ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مقتول کے جسم میں ملزم کے پستول کی گولی ہے تو وہ قاتل ثابت ہو جائے گا اور اگر وہ گولی اس کے پستول کی نہیں ہے، تو وہ بری ہو جائے گا، ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری ہے اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

مذکورہ بالا مسئلے کی تحقیق انتہائی مفصل انداز میں شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے اپنی تصنیف شرح صحیح مسلم (جلد دوم، ص:830-823) میں کی ہے، جس کا خلاصہ ہم نے بیان کیا ہے۔ میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً زمین مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

(لا یخرج منه) بعد اهالة التراب (الا) لحق آدمی، (کأن تکون الارض مغصوبة أو أخذت بشفعة) و یخیر المالك بین اخراجه و مساواته بالأرض۔

ترجمہ: "(میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہو گا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کر دے، (ردالمختار جلد 3 صفحہ 135,136، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)"۔

تمام حوالہ جات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی

نہیں، بلکہ ضروری ہے(کیونکہ جب مسلمان میت کی حرمت اس قدر ہے جیسا کہ ہم نے اس فتویٰ کی ابتداء میں بیان کی ہے تو زندہ کی بدرجہ اولیٰ ہے)اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

جھوٹی قبر بنانا اور اس کی تعظیم کرنا

سوال: 51

ایک ایسی جگہ جہاں کسی بزرگ وولی کی قبر نہ ہو اور نہ ہی وہاں کوئی دفن ہو، بس اتنا کہا جاتا ہو کہ یہاں کسی زمانے میں گذرتے ہوئے کسی قافلے کا ایک بچہ غائب ہوگیا تھا (یہ معلوم نہیں کہ یہ بچہ ہندو، سکھ یا عیسائی ہے، جن کا تھا) زندہ پیر کا نام دے کر عرس کرنا منتیں چڑھانا، صدقات دینا اور مقدس جان کر حاضری دینا، درختوں کا نہ کاٹنا، وہاں کی خاک کو شفایاب سمجھنا وغیرہ وغیرہ، جائز ہے یا ناجائز؟۔اب یہ جگہ محکمۂ اوقاف کے پاس ہے عرس تو نہیں ہوتا، لیکن عورتوں اور مردوں کی حاضری جیسے معاملات جاری ہیں۔اس صورتِ حال کو روکنا جائز ہے یا نہیں؟، (مولانا محمد جہانگیر صدیقی، علیمیہ مسجد، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

جھوٹی قبر بنا کر اس کی تعظیم کرنا ناجائز ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا ''کسی ولی اللہ کا مزار شریف فرضی بنانا اور اس پر چادر وغیرہ چڑھانا، اور اس پر فاتحہ پڑھنا اور اصل مزار کا سا ادب ولحاظ کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔
جواب میں لکھتے ہیں: فرضی مزار بنانا اور اس کے ساتھ اصل کا سا معاملہ کرنا ناجائز وبدعت ہے، مزید سوال ہوا کہ ''زید نے ایک قبر فرضی اور مصنوعی، جس کا پہلے سے کوئی وجود نہ تھا، بنوا کر یہ بات مشہور کی کہ اس قبر میں امروہہ کے زین العابدین تشریف

لائے ہیں، مجھ کو خواب میں بشارت ہوئی ہے، ایسی روایاتِ کاذبہ سے اس قبر کی عظمت لوگوں کے سامنے بیان کر کے قبر پرستی کی طرف بلانے لگا، حتیٰ کہ اس میں اس کو کامیابی ہونے لگی اور بہت سی مخلوق اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس قبر پر چادریں اور مرغ اور بکری اور مٹھائیاں، روپیہ اور پیسہ چڑھانے لگے، اور اپنی مرادیں اور منتیں اس قبر سے مانگنے لگے اور زید اس آمدنی سے متمتع ہوتا ہے، ایسے شخص کے واسطے شریعت کیا حکم لگاتی ہے''؟۔

آپ نے جواب دیا: ''قبر بلا مقبور (یعنی جس میں کوئی دفن نہ ہو) کی طرف بلانا اور اس کے لئے وہ افعال کرانا گناہ ہے، اور جبکہ وہ اس پر مصر ہے اور باعلان اسے کر رہا ہے تو فاسقِ معلن ہے اور فاسق معلن کو امام بنانا گناہ اور پھیرنی واجب۔ اس جلسہ زیارتِ قبر بے مقبور میں شرکت جائز نہیں۔ زید کے اس معاملے سے جو خوش ہیں خصوصاً وہ جو مُمِدّ و معاون ہیں، سب گناہ گار و فاسق ہیں، **قال اللہ تعالیٰ: ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان،** گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ بلکہ وہ بھی جو باوصفِ قدرت ساکت ہے، قال اللّٰہ تعالیٰ: کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون ۔ وہ برے کام سے ایک دوسرے کو روکتے نہ تھے، کیا ہی برا کام وہ کرتے تھے۔

ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: جھوٹا مزار بنانا اور اس کی تعظیم کرنا جائز نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9 ص: 425، 426، 427 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

مردہ پیدا ہونے والے بچے کے کفن دفن، غسل دینے اور نام رکھنے کا مسئلہ

سوال: 52

اگر کوئی بچہ مسلمان کے گھر مردہ حالت میں پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس کی

تدفین کے بارے میں کیا حکم ہے کیا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا یا کسی الگ جگہ پر؟ اوراس کو غسل دینے اورنام رکھنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ ،(طارق عزیز، دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

وہ بچہ جو ماں کے بطن سے مردہ حالت میں پیدا ہوا، یعنی دورانِ تولُّد یا بعد میں اس نے کوئی آواز نہیں نکالی، کوئی حرکت نہیں کی، سانس نہیں لیا، زندگی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی، تو اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، غسل دینا بہتر ہے، اسے معمول کا مسنون کفن دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس پاک کپڑے میں لپیٹ کر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کردیا جائے، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ دیگر قبور کی وجہ سے اس میت کے آثار کی بے حرمتی کی نوبت نہیں آئے گی۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وان لـم یستهل ادرج فی خرقة ولم یصل علیه ویغسل فی غیر ظاهر الروایة وهو المختار کذا فی الهدایة۔

ترجمہ:''اوراگر بچہ (مردہ پیدا ہوا اور) کوئی آواز نہیں نکالی، تو اسے پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے اوراس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، (فقہ حنفی کی ظاہر الروایہ میں تو اسے غسل دینا ثابت نہیں ہے لیکن) غیر ظاہر الروایہ کی ایک روایت میں ہے کہ اسے غسل دیا جائے گا، اوریہی (قول) مختار ہے اور''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:159 ،مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والا) یستهل (غُسِّل ویُسمّی) عندالثانی وهوالاصح، فیُفتٰی به علیٰ خلاف

ظاهر الرواية اكرماً لبنی آدم کمافی "ملتقی البحار" واذا ستبان بعض خلقه غُسّل وحشر وهو المختار۔

ترجمہ:اور اگر بچہ پیدا ہونے پر آواز نہ نکالے تو دوسری روایت کے مطابق اسے غسل دیا جائے اور نام رکھا جائے، یہی صحیح ترین ہے۔اور بنی آدم کے اکرام کی خاطر "ظاہر الروایۃ" کے خلاف اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ "ملتقی البحار" میں ہے، ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 3، ص: 122)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "اکثر دیکھا گیا مرا ہوا بچہ کسی کے ہاں پیدا ہوتا ہے، اس کو ہانڈی میں رکھ کر گورستان سے علیحدہ دفن کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ پکا مسان (یعنی اس سے بد فالی مراد لیتے ہیں) ہے، اس سے اہل ہنود کی طرح بچتے ہیں، یہ کیونکر ہے؟"۔

آپ نے جواب دیا: "یہ شیطانی خیال ہے اسے مسلمانوں کے گورستان ہی میں دفن کریں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9 ص: 390، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

مسلمان مرد یا عورت کا بچہ زندہ پیدا ہوا یعنی اکثر حصہ باہر ہونے کے وقت زندہ تھا، پھر مر گیا تو اس کو غسل وکفن دیں گے اور اس کی نماز پڑھیں گے ورنہ اسے ویسے ہی نہلا کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیں گے اس کے لئے غسل وکفن بطریقِ مسنون نہیں اور نماز بھی اس کی نہیں پڑھی جائے گی ، (بہارِ شریعت ، جلد اول، ص: 335، 336، مطبوعہ مکتبۂ امجدیہ، کراچی)"۔

زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائی

سوال: 53

ایک شخص جو کہ قرض دار ہے اور بینک سے سود پر رقم قرض لی ہے گھر گروی ہے کچھ اور لوگوں کا پیسہ بھی دینا ہے جو کہ لاکھوں میں ہے، ضروریاتِ زندگی کی اشیاء گھر میں موجود ہیں۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی قریبی رشتے دار زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرضہ ادا کرنا چاہے تو کتنی رقم زکوٰۃ کی مد میں اسے دے سکتا ہے؟۔

سوال: 54

ایک شخص مختلف لوگوں سے قرض لیتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو جاتا ہے اس کے گھر کے افراد وہ قرض چکانے کی استطاعت نہیں رکھتے کیا کوئی قریبی رشتہ دار یہ قرض زکوٰۃ کی رقم سے ادا کر سکتا ہے؟، (سعید غنی آرائیں، بلاک 5-E 62/10 نیو کراچی)۔

جواب:

ایسا قرض دار جس کے پاس ادائے قرض کے وسائل نہ ہوں اور قرض کی رقم اس کی موجودہ املاک سے زیادہ ہو اگر کوئی حسنِ سلوک کے طور پر اس کے قرض کی ادائیگی کرنا چاہے تو وہ اپنی استطاعت وصلاحیت کے مطابق کر سکتا ہے قرض کی رقم خواہ بینک کی ہو یا شخصی، قرض کے سلسلے میں برابر ہیں البتہ شخصی قرض میں سود نہیں ہونا چاہئے جبکہ بینک کے قرض میں سود دینا ہوتا ہے اس لئے یہ شخصی قرض سے بدتر ہوتا

ہے۔

زکوۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی از زکوۃ کی رقم ھبہ یا قرض کہہ کر دینا

سوال: 55

کیا زکوۃ کی رقم ایسے عزیز کو دی جاسکتی ہے، جو اپنی قلیل تنخواہ کی وجہ سے مقروض ہے اور اس کی لڑکی کی شادی طے ہوگئی ہے، مگر شادی کا خرچہ نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے، معلوم ہے کہ وہ شخص زکوۃ کی رقم لینے پر تیار نہیں ہوگا تو کیا اس کو بغیر بتائے، اس کے قریبی رشتہ دار زکوۃ کی رقم دے سکتے ہیں، کیا اس طرح زکوۃ کی ادائی ہو جائے گی؟، (واجد حسین، A-286/1 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

زکوۃ کی صحیح ادائی کے لئے ضروری ہے کہ جسے زکوۃ دی جارہی ہے، وہ مستحقِ زکوۃ ہو، صاحبِ نصاب نہ ہو، سید نہ ہو، تو ایسے شخص کو زکوۃ دی جاسکتی ہے۔ مستحقِ زکوۃ وہ شخص ہے، جس کے پاس کم از کم نصاب کے مساوی بنیادی ضروریات سے فاضل مال موجود نہ ہو، نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مالِ تجارت جو اس کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔ قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔

زکوۃ کی رقم سے اس کا قرض بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور اسے یعنی مستحقِ زکوۃ شخص کو یہ بتائے بغیر بھی دی جاسکتی ہے کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے، جبکہ اندیشہ ہو کہ خودداری کی بنا پر نہیں لے گا، بلکہ ھبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جاسکتی ہے اور دل میں یہ نیت ہو کہ واپس

نہیں لوں گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن أعطى مسكيناً دراهم وسماها هبةً أو قرضاً ونوى الزكاةُ فانها تُجزيه وهو الاصح هكذا في البحرالرائق ناقلاً عن المبتغي والقنية۔

ترجمہ: ''اور جو شخص کسی مسکین (مستحق زکوٰۃ شخص) کو کچھ درہم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ کہہ کر دے کہ یہ ہبہ یا قرضہ ہےاور زکوٰۃ کی ادائی کی نیت کر لے تو یہ عمل ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہےاور یہی قول صحیح ترین ہے ''بحرالرائق'' میں ''المبتغی'' اور ''قنیہ'' سے اسی طرح منقول ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 171، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال: 56

میں نے زکوٰۃ کے پیسے رکھے تھے، جو ایک صاحب کو جو انتہائی مجبور تھے، ادھار میں دیدیئے، سوال یہ پوچھنا ہے کہ کیا زکوٰۃ میں سے رقم بطور ادھار دی جاسکتی ہے۔ کیا سال گزرنے کے بعد جب ادھار دی ہوئی رقم مل جائے، اس وقت زکوٰۃ دینے پر کوئی حرج تو نہیں؟، (محمد حامد علی، گلشن اقبال)۔

جواب:

اپنے مال میں سے زکوٰۃ کی رقم نکال کر اسے اپنے پاس الگ رکھنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، بلکہ اسے مستحق تک پہنچانا اور اسے اس کا مالک بنانا ضروری ہے، اور اگر اس رقم کو رکھے ہوئے سال گزر جاتا ہے، یا اسے آپ نے ادھار پر کسی کو دے رکھا ہے تو آپ جب آئندہ سال کی زکوٰۃ ادا کریں گے تو زکوٰۃ کی نیت سے الگ رکھی ہوئی یا کسی کو قرض دی ہوئی اس رقم پر بھی آپ کو زکوٰۃ ادا کرنی لازمی ہوگی۔ اور

اگر آپ نے گذشتہ کئی سالوں سے اس رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں کی ہو تو مقدارِ واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم اگر نصاب کی مقدار کو پہنچتی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، مثلاً آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور سال گذرنے پر ساڑھے بارہ ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہوگئی اور اس سال آپ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تو آئندہ سال کی زکوٰۃ جب ادا کریں گے تو مقدارِ واجب یعنی ساڑھے بارہ ہزار کو چھوڑ کر بقیہ چار لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو کی زکوٰۃ آپ پر واجب ہوگی۔ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ کی نیت سے اپنے کل رقم میں سے جو پیسے آپ نے علیحدہ کئے اور پھر وہ رقم آپ نے دوسرے کو بطورِ قرض دے دی اب آپ آئندہ سال جب زکوٰۃ ادا کریں گے تو گذشتہ سال آپ کی رقم پر جتنی زکوٰۃ واجب تھی اس مقدارِ واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لہٰذا جو پیسے آپ نے قرض میں دیئے وہ کل رقم میں سے شمار نہیں ہونگے بلکہ قرض کی وصولیابی کے بعد گذشتہ سال کی زکوٰۃ کی مد میں ان کو خرچ کرنا واجب ہوگا۔

اسپتال کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری

سوال: 57

میرا ایک ہسپتال ہے اس میں غرباء، مساکین کا مفت علاج کیا جاتا ہے، آنکھوں کے علاج و آپریشن کا شعبہ بھی ہے۔ غیر مستحق افراد سے مناسب فیس اور خرچہ لیا جاتا ہے اس آمدنی سے بھی غرباء و مساکین کے علاج میں رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اب ہم ہسپتال میں آلات و مشینری وغیرہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں خصوصاً شعبہ امراضِ چشم میں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی رقم سے آلات و مشنری برائے ہسپتال خریدی جاسکتی ہیں؟، (اخلاق احمد، پشاور)۔

جواب:

محتاط صورت تو یہ ہے کہ آلات و مشینری زکوۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق زکوۃ کی ملک کردی جائے اور وہ اسے آپ کے ہسپتال کو ھبہ کردے، پھر اسے آپ مستحق زکوۃ مریضوں، نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کرسکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کرسکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

زکوۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا

سوال: 58

میں اپنی سالانہ زکوۃ میں سے محلے کے دو مدرسے اس طرح چلاتا ہوں کہ محلے کے بچے پڑھنے کے لئے آتے ہیں، کوئی رہائشی یا مسافر طالب علم نہیں ہے۔ لڑکوں کو معلم قاری صاحب اور لڑکیوں کو معلّمہ قاریہ صاحبہ پڑھاتی ہیں۔ ان دونوں کا ماہانہ وظیفہ، مدرسے کے لئے ڈیسکیں، پنکھا اور دیگر اخراجات زکوۃ کی رقم سے ادا کرتا ہوں، گذشتہ دو سال سے اسی مذکورہ بالا طرز پر یہ دو مدارس میں چلا رہا ہوں، کیا میری ادا کردہ زکوۃ درست ہے؟، (حافظ فہیم احمد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوۃ قرآن مجید کی سورۃ التوبۃ: 60 میں متعین فرما دیئے ہیں اور وہ آٹھ مدات ہیں:

(1) فقراء (2) مساکین (3) عاملین زکوۃ (4) مؤلفۃ القلوب (5) جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلے دبی ہوئی ہو (6) جن پر کوئی بھاری تاوان آگیا ہو، جس سے گلو

خلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو(7) جو اپنے آپ کو ہمہ وقتی اللہ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تگ ودو کے لئے انہیں وقت میسر نہ ہو(8) جو مسافر کسی ایسے مقام پر گھر گئے ہوں کہ قوت لایموت دستیاب نہ ہو اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔ زکوۃ کا مال صرف اس پر صرف کیا جا سکتا ہے جو قرآن مجید میں بیان کردہ ان مدات میں سے کسی ایک کے تحت مستحق زکوۃ قرار پاتا ہو۔ وہ مقامی شہری بچے جو مدارس یا مکاتب تعلیم القرآن میں حفظ وناظرہ کی تعلیم پا رہے ہوتے ہیں اور جن کے والدین اور کفیل خود زکوۃ وصدقات ادا کرتے ہیں، ان پر بلاواسطہ یا بالواسطہ زکوۃ کی رقم صرف کرنا درست نہیں ہے، بالواسطہ اس طرح کہ ان کے معلم ومدرس کو اس لئے زکوۃ کی رقم میں سے تنخواہ دی جائے کہ وہ ان بچوں کو پڑھاتا ہے۔ ہاں البتہ اگر ایسا کوئی مدرس فی نفسہ مستحق زکوۃ ہے تو اسے زکوۃ دی جا سکتی ہے، عام ازیں کہ وہ بچوں کو پڑھائے یا نہ پڑھائے، اگر اسے زکوۃ غیر مشروط طور پر استحقاق کی بنا پر دی جا رہی ہو اور وہ رضا کارانہ طور پر رضائے الٰہی کے لئے قرآن مجید کی تعلیم دے رہا ہو، اسے اس پر شرط یا لازم نہ قرار دیا گیا ہو تو درست ہے۔ البتہ اگر زیر تعلیم بچے بھی ایسے لوگوں کے ہیں، جو نادار اور مستحق زکوۃ ہیں تو ادارے کا سربراہ زکوۃ دینے والوں کا وکیل بن کر ان پر زکوۃ کی رقم خرچ کر سکتا ہے۔

ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوۃ واجب نہیں

سوال: 59

ایک شخص کا قضاء الٰہی سے انتقال ہو گیا اور اس کی جائداد اس کے شرعی ورثاء میں 2 سال کے بعد تقسیم کی گئی آیا تقسیم کے بعد گذشتہ دو سالوں کی زکوۃ ان کے ذمے

واجب الادا ہے یانہیں؟،(منور صدیقی،ملیر کراچی)۔

جواب:

واضح رہے کہ وجوب زکوۃ کے لئے بعض شرائط ہیں، جب یہ تمام شرائط پائی جائیں تو اس مال پر زکوۃ واجب ہوگی، اور اگر ان میں سے کل یا بعض شرائط نہ پائی جائیں، تو زکوۃ واجب نہ ہوگی۔ وجوبِ زکوۃ کی شرائط میں سے ایک شرط "ملکِ تامّ" (Complete Ownership) ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: (ومنها الملك التام) وهو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذاوجدفيه الملك دون اليد كا الصداق قبل القبض اوو جد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لاتجب فيه الزكوة كذافي السراج الوهاج۔

ترجمہ: "(اور وجوبِ زکوۃ کی شرائط میں سے ایک "ملکِ تامّ" ہے) اور (ملکِ تامّ) اسے کہتے ہیں کہ جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں پائے جائیں، لیکن جب ملکیت پائی جائے مگر قبضہ نہ پایا جائے، اس کی مثال (دینِ) مہر ہے، جو ابھی (بیوی کے) قبضے میں نہیں آیا، یا قبضہ پایا جائے مگر ملکیت نہ ہو، جیسے (عبد) مکاتَب یا مقروض کے قبضے میں مال کا ہونا (کہ اس میں ملکیت نہیں ہے) تو ان دونوں صورتوں میں اس مال پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی، "السراج الوھاج میں اسی طرح ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول،ص: 172، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

اور ملکِ تام تب ہی ہوگا، جبکہ اصل یعنی "مالکِ مال"، مال پر قبضہ کرلے یا اس کا وکیل مال پر قبضہ کرلے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وقد مران المراد بالملك التام رقبة و يدا۔

ترجمہ:"اور تحقیق (پیچھے) گذر چکا ہے کہ (ملک) تام سے مراد یہ ہے کہ مملوک پر ملکیت بھی کامل ہو اور قبضہ بھی ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:3،ص:168،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

اور وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مال نصاب حقیقۃً یا تقدیراً نامی ہو۔اور نامی ہونا یہ ہے کہ اس کو مال تجارت سے بڑھا سکے اور تجارت قبضہ سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:(و منها كون النصاب ناميا) حقيقة بالتوالد و التناسل و التجارة أو تقديرا بان يتمكن من الاستمناء بكون المال في يده او في يد نائبه۔

ترجمہ:"وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک نصاب کا نامی (بڑھوتری کے قابل) ہونا ہے، حقیقت میں تو نمو (Growth) یہ ہے کہ توالد و تناسل (جیسے جانوروں کی افزائش نسل ہوتی ہے) یا تجارت کے ذریعے ہو، یا تقدیراً نمو ہو، کہ مال کا مالک اپنے مال میں نمو اور اضافے کی قدرت رکھتا ہو اور یہ تب ہو سکتا ہے جب مال اس کے (براہِ راست) یا اس کے نائب کے قبضے میں ہو، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1: ص: 174، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: و أما سائر الديون المقر بها فهي علىٰ ثلاث مراتب عند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ ضعيف و هو كل دين ملكه بغير فعله لا بدلا عن شئي نحو الميراث او بفعله لا بدلا عن شئي كالوصية او بفعله بدلا عما ليس بمال كالمهر و بدل الخلع و الصلح عن دم العمد و الدية و بدل الكتابة لا زكاة فيه عنده حتى يقبض نصابا و يحول عليه الحول۔

ترجمہ:"لیکن ایسے تمام قرضے جن کا اقرار کیا جا چکا ہو، امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ

کے نزدیک ان کے تین درجے ہیں، (ایک دین) ضعیف، یہ وہ دین ہے جس کا وہ اپنے کسی فعل کے بغیر مالک بن گیا ہو، اور وہ مال کسی چیز کے بدلے میں اسے نہ ملا ہو، جیسے مالِ وراثت، یا اس کے فعل سے تو ہو لیکن کسی چیز کے بدلے میں نہ ہو، جیسے وصیت یا اسکے فعل سے تو ہو لیکن کسی مال کے بدلے میں نہ ملا ہو جیسے مہر، بدلِ خلع، قتلِ عمد پر صلح کے عوض ملنے والا مال، دیت اور بدلِ کتابت، ایسے اموال میں امام اعظم کے نزدیک زکوٰۃ نہیں ہے، تاوقتیکہ کے وہ قبضے میں آجائے اور نصابِ زکوٰۃ کے برابر ہو اور اس پر سال گزر جائے (بشرطیکہ وہ شخص پہلے سے صاحبِ نصاب نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1:، ص:174، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: کسی شخص کی وفات کے ساتھ ہی، اس کا مال ترکہ بن جاتا ہے اور حکماً اس مال کی ملکیت ورثاء کو منتقل ہو جاتی ہے، لیکن تقسیمِ وراثت سے پہلے ورثاء کا اس مال پر "ملکِ تام" (یعنی ملکیت مع قبضہ) نہیں ہوتا تاوقتیکہ تقسیمِ وراثت کے بعد وہ اس پر قبضہ کر لیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ترکے کی تقسیم سے پہلے سالوں کی زکوٰۃ اس مال پر واجب نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ کی رقم سے ڈائیلیسس مشین کی خریداری

سوال : 60

عرض یہ ہے کہ ہم عزیزطبیہ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام فیڈرل "بی" ایریا میں ایک ڈائیلیسس سینٹر چلا رہے ہیں جہاں پر ناکارہ گردے کے مریضوں کا ڈائیلیسس کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ تر زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کا ڈائیلیسس کیا جاتا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ آدھے چارج یا پورے چارج دیتے ہیں ان کا بھی ڈائیلیسس کیا جاتا ہے۔

ہمیں کچھ صاحب ثروت حضرات زکوٰۃ کی مد سے ڈائلیسس کی مشین دینا چاہتے ہیں ،ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ:

1۔کیا زکوٰۃ فنڈ سے ڈائلیسس مشین لی جائے یا نہیں؟

2۔اگر مشین لی جائے تو اس پر پورے یا آدھے چارج دینے والے مریضوں کا علاج کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟،اگر چارج دینے والوں کا علاج زکوٰۃ فنڈ سے لی ہوئی ڈائلیسس مشین سے نہیں کر سکتے تو برائے مہربانی شریعت اسلامیہ کے مطابق اسکا کوئی حل ہوسکتا ہے تاکہ عوام الناس کے فائدے کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے خریدی ہوئی ڈائلیسس مشین استعمال ہو سکے،(احمد عبدالشکور منشی)۔

جواب:

محتاط صورت تو یہ ہے کہ ڈائلیسس مشین زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق کی ملک کر دی جائے اور وہ اسے آپ کے ڈائلیسس سنٹر کو ھبہ کر دے،پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں،نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت بر سبیل تنزل یہ ہے کہ ائمہ احناف کے ہاں تو زکوٰۃ میں تملیک یعنی مستحق کو مالک بنانا شرط ہے لیکن اہلسنت کے دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تملیک شرط نہیں ہے۔ہمارے مفسرین احناف میں سے علامہ خفاجی ،علامہ شیخ زادہ ،علامہ ابوسعود اور علامہ محمود آلوسی نے فقراء،مساکین ،عاملین اور مولفۃ القلوب کے لئے تو تملیک کی شرط کو برقرار رکھا ہے لیکن مکاتب غلاموں کی آزادی ،مقروض افراد یا کسی تاوان یا جرمانے میں پھنسے ہوئے افراد، مسافروں اور ان لوگوں کے لئے جو ہمہ وقت اللہ کے دین

کے کسی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں، جیسے مجاہدین فی سبیل اللہ یا دینی طلبہ، لیکن مستحق زکوٰۃ ہیں، ان کے لئے تملیک کو شرط لازم قرار نہیں دیا بلکہ ان کے مصالح پر خرچ کرسکتے ہیں، پس اگر ڈائلیسس مشینیں زکوٰۃ فنڈ سے خریدی جائیں تو پھر ان مشینوں سے صرف مستحقین ہی استفادہ کرسکیں گے۔

علامہ قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفی 1069ھ سورۃ التوبۃ آیت نمبر 60، جس میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کا بیان فرمایا ہے، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: پہلے چار مصارف کے ساتھ "لام" اور آخری چار مصارف کے ساتھ "فی" ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کو ان حصوں کا مالک بنادیا جائے۔ اور آخری چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ میں سے ان کے حصے کا مالک نہیں بنایا جائے گا، بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (اس کے حصے کی زکوٰۃ) اس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا، اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے، (عنایت القاضی جلد 4 ص: 558، دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

چونکہ گردے کی بیماری ایک خطرناک مہلک بیماری ہے، جو جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے، مریض کی بقاءِ حیات کے لئے ڈائلیسس طبی طور پر ناگزیر ہے، اس لئے ہم نے اس میں دوسرے ائمہ کے قول کو اس اصول کی بنیاد پر اختیار کیا ہے کہ: "ضرورت ممنوعات کو بھی مباح کر دیتی ہے"۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی پیشِ نظر رہے کہ: "ضرورت کی بناء پر دی جانے والی رخصت یا جواز کو اس کے دائرے میں محدود رکھنا چاہئے"۔ ہم نے اس مسئلے میں بعض حنفی مفسرین کے بیان کردہ یُسر (آسانی)

والے قول کو نقل کیا ہے، لیکن فقہ حنفی کا مسلمہ اور مختار مسلک یہی ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے، لہٰذا ہماری بیان کردہ اس رخصت کو دوسرے مقامات یا مواقع کے لئے استعمال نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مقامی مدارس میں زکوٰۃ اور نفلی صدقات کا استعمال

سوال: 61

مسجد میں ایک مدرسہ ہے اور اس مدرسہ میں بچے اور بچیاں فی سبیل اللہ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس مدرسے میں نہ مستقل رہائش کا انتظام ہے نہ قیام کا اور نہ طعام کا، اس مدرسے کے اخراجات جس میں مدرسے کی دیکھ بھال اور استاد کی تنخواہ وغیرہ شامل ہے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے درج ذیل میں سے کونسا پیسا استعمال کرنا درست ہے؟۔ چرم قربانی کے ذریعے جو رقم حاصل ہوتی ہے زکوٰۃ اور فطرہ سے حاصل ہونے والی رقم صدقات وخیرات اور ہدیہ سے حاصل ہونے والی رقم، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر میری ذہنی تشفی فرمائیں، (عبدالرؤف تاجی ملیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتب تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس ومکاتب میں ان مقامی لوگوں کے بچے حفظ وناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوٰۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں، ان مدارس ومکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ، فدیہ، فدیہ صوم، نذر، کفارہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ ایسے مصرف کے لئے زکوٰۃ

لینا اور دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ خود اپنی زکوٰۃ سے استفادہ کی بالواسطہ صورت ہے۔

ایسے مدارس میں چرم قربانی کی مد میں حاصل شدہ رقم، عام خیرات یعنی نفلی صدقات اور عطیات کی رقوم صرف کی جاسکتی ہیں، اسی طرح کوئی نفلی طور پر ایصال ثواب کرنا چاہے تو وہ بھی کرسکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک کی شرط

سوال: 62

اس خط کے ذریعے ایک اہم مسئلے پر آپ کی رائے کا خواستگار ہوں امید ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات نکال کر مجھے اپنی رائے سے مستفیض فرمائیں گے۔میں نے بہت سال پہلے اپنے ہر بچے کے نام پر یا اس کے لئے اپنے نام پر قسطوں میں پلاٹ لئے تھے، نیت خالصتاً یہ تھی کہ یہ پلاٹ بچوں کے بڑے ہونے پر ان کے حوالے کردوں گا کہ اس پر مکان بنائیں یا اسے بیچ کر اس رقم سے کہیں اور مکان بنائیں یا حالات کے مطابق اس کا کوئی مصرف نکالیں، تین سوالات جو غور طلب ہیں وہ عرض کررہا ہوں۔

۱۔جو پلاٹ بچوں کے نام پر ہی خریدے ہوئے ہیں اور ان کے نام پر ہی سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہیں، کیا مجھے یا بچوں کو ان پر زکوٰۃ دینا پڑے گی؟۔

۲۔جو پلاٹ میں نے اپنے نام پر خریدے تھے، لیکن بچوں کے لئے ہی خریدے تھے اور سرکاری طور پر ان کو ان کے نام رجسٹری کروادی گئی ہے، کیا اس پر مجھے یا بچوں کو ماضی یا مستقبل میں زکوٰۃ دینا ہے؟۔

۳۔جو پلاٹ ابھی تک میرے نام ہی ہیں لیکن مناسب وقت پر بچوں کے نام کردیئے

جائیں گے،تو کیاان پر ماضی یا مستقبل میں زکوۃ لازم ہے؟۔(پروفیسر مبشر کریم کورا،E-131 فیز 1 ڈیفنس،لاہور)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل جو پلاٹ آپ نے بچوں کے نام کردیئے ہیں اورانہیں کے نام پر رجسٹرڈ ہیں اورنیت یہی ہے کہ وہ اس پر اپنا رہائشی مکان بنائیں،تو ان پر زکوۃ نہیں ہے،کیونکہ آپ کی ملکیت سے یہ خارج ہو چکے ہیں اوربچوں کی ملکیت ہیں۔بچوں کے بالغ ہونے کے بعد بھی ان کی نیت یہی ہے کہ وہ ان پر مکان بنائیں گے،تو ان پر ان کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی،البتہ اگران کی نیت تبدیل ہوگئی اورارادہ یہ ہوا کہ اسے بیچ دیں گے یا سرمایہ کاری کے طور پر رکھیں گے،تواس کے بعدانہیں ان پلاٹوں کی مروجہ مارکیٹ قیمت کے مطابق زکوۃ دینی ہوگی ۔جن مزید پلاٹوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے،جوخود آپ کے نام ہیں،اورجن کے بارے میں خود آپ نے لکھا ہے کہ مستقبل میں ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا ،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نیت ان پلاٹوں کے بارے میں فی الحال سرمایہ کاری کی نہیں ہے،لہٰذا اس صورت میں ان پلاٹوں کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فلایصیرللتجارہ مع التردد الا بالنیۃ۔

ترجمہ:''کوئی مال نیت قطعیہ کے بغیر تجارت کے لئے نہیں ہوگا،(فتاوی شامی، جلد:2،ص:10،مکتبہ داراحیاءالتراث العربی،بیروت)،واللہ اعلم بالصواب۔

زکوۃ کا استحقاق

سوال: 63

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلے کی ذیل میں، کیا خالہ خالو، ماموں ممانی کو زکوۃ دی جاسکتی ہے؟، (محمد رمیز، نارتھ کراچی)۔

جواب:

قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی، یہی حکم صدقۂ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے۔خالہ، خالو، ماموں، ممانی، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر کی اولاد (اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں) کو زکوۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوۃ نہیں دے سکتے۔البتہ بہن بھائی بشرطِ استحقاق ایک دوسرے کو زکوۃ دے سکتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتاب الصوم﴾

دودھ پلانے والی ماں کے لئے روزے کا حکم

سوال : 64

میری بہو کی بچی کی عمر 3 ماہ ہے، پہلی بچی ہے، روزہ رکھنے سے بچی کی خوراک پوری نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی دوسرا دودھ پیتی ہے ماں کی صحت پہلے ہی کمزور ہے BP(100/60/80/60) رہتا ہے۔ رمضان المبارک کے بعد بھی روزوں کی قضا رکھنا مریضہ کے لئے مشکل ہے ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟، (حاجی سید محمد، مرشد آباد ڈھیریاں شریف آزاد کشمیر)۔

جواب:

عن انس بن مالك، قال: رخص رسول الله ﷺ للحبلى التى تخاف على نفسها، أن تفطر وللمرضع التى تخاف على ولدها۔

ترجمہ: ’’حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے، ایسی حاملہ عورت کو، جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنی جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو اور ایسی دودھ پلانے والی عورت کو کہ جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنے بچے (کی جان) کا خوف ہو، (عذرِ شرعی کی بنا پر رمضان المبارک کا) روزہ چھوڑنے کی رخصت عطا فرمائی ہے، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1668)‘‘۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(أو حامل أو مرضع) أمّاً كانت أو ظئراً على الظاهر (خافت بغلبة الظن على نفسها أو ولدها)

ترجمہ: ''یا حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت ہو، خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا دودھ پلانے والی دائی، اسے اپنی یا بچے کی صحت کو نقصان پہنچنے کا غالب گمان ہو، ظاہر الروایہ کی رو سے، رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 359 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(ومنها حبل المرأة وارضاعها) الحامل والمرضع اذا خافتا على أنفسهما أو ولدهما أفطرتا وقضتا ولا كفارة عليهما كذا في الخلاصة۔

ترجمہ: ''(اوران بعض معذوروں میں سے ایک حمل والی اور دوسری دودھ پلانے والی عورت ہے) حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو رمضان کا روزہ عذر کی بنا پر چھوڑنے کی رخصت ہے، جب کہ ان دونوں کو خوف ہو اپنی جان یا بچے کا تو وہ افطار کریں گی یعنی روزہ نہیں رکھیں گی اور (بعد میں) اس کی قضا کریں گی اور ان دونوں پر کفارہ نہیں ہے جیسا کہ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے، (فتاوی عالمگیری، جلد 1، ص: 207 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

پس مرضعہ کو چاہئے کہ اگر اس وقت روزے نہیں رکھ سکتی تو بعد میں اگر صحت درست رہے تو ان کی قضا کرے اور اگر بعد کو بھی نہیں رکھ سکتی تو ان روزوں کا فدیہ ادا کرے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

بغلبة الظن بامارة او تجربة او باخبار طبيب حاذق مسلم مستور ۔

ترجمہ: ''غلبہ ظن، علامات، تجربہ یا مسلمان ماہر مستور الحال طبیب کے بتانے سے ثابت ہوگا، (ردالمحتار علی المختار، ج 3، ص: 360-359، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اگر تندرست شخص کو روزہ رکھنے سے بیمار پڑنے کا خدشہ ہو تو ان کے لئے (رمضان میں) روزہ نہ رکھنا جائز ہے، اور جب وہ روزہ رکھنے پر قادر ہو تو اس کی لازماً قضا کریں، جو بہت عمر رسیدہ ہو یا جس کو ایسا مرض لاحق ہو جس سے شفا کی امید نہیں ہے (جیسے ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر) اور اس وجہ سے اس کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو اس کے لئے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور اس پر ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کے طعام کا (تقریباً دو کلو گندم) فدیہ دینا لازم ہے، قرآن مجید میں ہے: وعلی الذین یطیقونہ فدیة طعامُ مسکین ط

ترجمہ: "اور جو لوگ روزہ کی بمشکل طاقت رکھتے ہوں، ان پر ایک مسکین کے طعام کا فدیہ لازم ہے، (البقرۃ: 184)"۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قولہ العاجز عن الصوم) ای عجزا مستمرا کمایأتی اما لولم یقدر علیہ لشدة الحر کان لہ ان یفطر ویقضیہ فی الشتاء۔

ترجمہ: "اور جس شخص کو ایسا مرض لاحق ہو کہ جس سے شفا کی امید نہ ہو، جیسا کہ آگے آئے گا وہ (اس رخصت میں داخل ہے (اور) اگر کوئی شخص گرمی کی شدت کی وجہ سے روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو اسے گرمیوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور سردیوں میں ان کی قضا رکھ لے گا، (رد المحتار علی الدر المختار، ج 3، ص: 359، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

عذر کی بنا پر روزے چھوڑنا

سوال: 65

سانس کے مریضوں کو وینٹولین کے پمپ استعمال کرنا پڑتے ہیں، ایسی

صورت میں روزہ رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟، (محمد اکبر، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر مریض اس اسٹیج پر ہے کہ پمپ کے استعمال کے بغیر مریض کا دن گزارنا مشکل ہے تو وہ معذور ہے، یہ آلہ استعمال کرے، روزہ چھوڑ دے، اور روزے کے بدلے میں فدیہ دے، کیونکہ اس آلے کے ذریعے ایک کیمیکل گیس یا سیال شکل میں انسان کے حلق سے اندر جاتا ہے، جس سے سکڑے ہوئے پھیپھڑے کھل جاتے ہیں اور تنفس یعنی سانس لینا آسان ہو جاتا ہے۔

غسل واجب ہو اور صبح صادق

سوال: 66

ماہِ رمضان میں ایک شخص ایسے وقت بیدار ہوا کہ سحری کا وقت ختم ہونے میں انتہائی قلیل وقت باقی ہے، اور اس پر غسلِ جنابت واجب ہے تو ایسے میں وہ شخص کیا کرے؟ پہلے سحری کرے یا غسل؟ آیا حالتِ جنابت میں روزہ درست ہوگا یا نہیں؟

-

جواب:

قرآن مجید میں (ماہ رمضان میں) طلوع فجر تک کھانے پینے اور عملِ ازدواج کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فالٰئن باشروھنّ وابتغوا ما کتب اللّٰہ لکم وکلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔

ترجمہ: ’’پس اب (چاہو تو) اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، اور طلب کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھا ہو، اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ (ممتاز ہو کر) ظاہر ہو جائے

تمہارے لئے صبح کا سفید دھاگہ (رات کے) سیاہ دھاگے سے (یعنی صبح صادق شروع ہوجائے)، (البقرہ: 187)''۔

جب طلوع فجر تک ازدواجی فعل میں مشغول رہنا جائز ہوا، تو حالتِ جنابت میں روزے کی نیت کرنا بھی جائز ہوگیا۔ صحیحین میں ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: انّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یدرکہ الفجر، وھو جنب من أھلہ، ثم یغتسل و یصوم۔ ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات سے قربت فرماتے اور (کبھی) حالتِ جنابت میں صبح صادق ہوجاتی، پھر آپ غسل فرماتے، اور روزہ رکھتے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث :1926)''۔

عن عائشۃ زوج النبی ﷺ قالت قد کان رسول اللّٰہ ﷺ یدرکہ الفجر فی رمضان وھو جنب من غیر حلم فیغتسل و یصوم ۔

ترجمہ: ''ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ماہِ رمضان میں کبھی رسول اللہ ﷺ پر احتلام کے بغیر حالتِ جنابت میں صبح صادق آجاتی آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2486)''۔

عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا انّ رجلاً جآء الی النبی ﷺ یستفتیہ وھی تسمع من ورآء الباب فقال یا رسول اللّٰہ ﷺ تدرکنی الصلوٰۃ و انا جنب فاصوم فقال رسول اللّٰہ ﷺ وانا تدرکنی الصلوٰۃ وانا جنب فاصوم فقال لست مثلنا یا رسول اللّٰہ قد غفر اللّٰہ لک ماتقدم من ذنبک و ماتأخّر فقال واللّٰہ انّی لارجوا ان اکون اخشاکم للّٰہ و اعلمکم بما اتّقی۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک

شخص مسئلہ معلوم کرنے آیا دراں حالیکہ وہ بھی دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھیں، اس نے عرض کیا : یارسول اللہ ﷺ! (کبھی) حالتِ جنابت میں نماز فجر کا وقت آجاتا ہے،تو میں (اس وقت غسل کرکے پاک ہوتا ہوں)اور روزہ رکھتا ہوں،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:کبھی حالت، جنابت میں مجھ پر بھی نماز فجر کاوقت آجاتا ہے،میں (غسل کرکے نماز پڑھتا ہوں) اور میں روزہ رکھ لیتا ہوں ،اس نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم آپ کی مثل کب ہیں!اللہ تعالیٰ نےتو آپ کے اگلے پچھلے ذنب کی قطعی مغفرت فرمادی ہے! آپ ﷺ نے فرمایا:بخدا مجھے یہ یقین ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خشیت رکھنے والا ہوں اور جن چیزوں سے بچنا چاہئے ان کا میں تم سب سے زیادہ عالم ہوں، (صحیح مسلم،رقم الحدیث:2489)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن اصبح جنباً أو احتلم فی النهار لم يضره كذا فی محيط السرخسی ۔

ترجمہ:"اور جس نے حالتِ جنابت میں صبح کی،یا دن میں احتلام ہوگیا تو یہ اس کے (روزے) کے لئے نقصان دہ نہیں ،محیط سرخسی میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:200،مکتبہ رشیدیہ ،کوئٹہ)"۔مذکورہ صورت میں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح ہاتھ دھوکر،کلی وغیرہ کرکے سحری کرے اور بعد میں غسل کرے، پھر نماز پڑھے اوراس صورت میں اس کا روزہ درست ہوگا،لیکن لازم یہ ہے کہ غسل کرنے میں اتنی تاخیر نہ کرے کہ فرض نماز کا وقت جاتا رہے،اگر نماز قضا ہوگئی تو گناہگار ہوگا۔

﴿کتاب الحج﴾

فلسفہ وروح حج

اسلام کی کامل روح تو یہ ہے کہ بندہ مومن کی زندگی مجسم عبادت بن جائے، اس کی چال ڈھال، رفتار وگفتار، نشست وبرخاست، انفرادی واجتماعی معاملات، حتی کہ ہر شعبہ زندگی اور ہر لمحہ حیات میں اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت کی جھلک نظر آئے۔ہم نے جو زندگی کو دین اور دنیا کے نام سے دوخانوں میں تقسیم کردیا ہے اس دورنگی اور دوئی کا خاتمہ ہو جائے ۔اگر انسان زندگی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء اور اطاعت کے قالب میں ڈھال لے اور اس کا وجود اللہ کے بندوں کے لئے فیض رساں اور وسیلہ رحمت بن جائے تو اس کی معیشت ،تجارت اور سیاست سب کچھ عبادت بن جائے گی ۔اور خوف خدا اور اخلاقی گرفت سے عاری زندگی جو انسانیت کے لئے باعث آزار بن گئی ہے،اس سے نجات مل جائے گی۔

لیکن اس عمومی اور جامع (Comprehensive) اور کامل (Perfect) تصورِ عبادت کے ساتھ اسلام نے رسمی عبادات (Rituals) کا ایک حکیمانہ اور مربوط نظام بھی عطا کیا ہے، جن کا حقیقی اور اعلیٰ مقصد بندہ مومن کے قلب میں اس جامع وکامل تصورِ عبادت کو ابھارنا ہے، یہ عبادات تین قسم پر مشتمل ہیں۔

(1) خالص بدنی عبادات: جیسے نماز اور روزہ، یہ بہر صورت ہر بندے کو خود ادا کرنی ہوتی ہیں اور ان میں نیابت (Assistance) کا کوئی تصور نہیں۔

(2) خالص مالی عبادت: جیسے زکوٰۃ فطرہ وغیرہ، ان میں نیابت چل جاتی ہے یعنی کوئی شخص دوسرے کا وکیل اور نمائندہ بن کر بھی ادا کرسکتا ہے۔

(3) مخلوط عبادت: یعنی جو بدنی بھی ہو اور مالی بھی، اس میں بھی اصل روح تو یہی ہے کہ بندہ خود ادا کرے لیکن اگر بربنائے معذوری ومجبوری خود نہ ادا کرسکتا ہو تو اس کی نیابت میں اس کی خواہش اور مصارف پر دوسرا قابل اعتماد آدمی بھی کرسکتا ہے، اسے "حج بدل" کہتے ہیں۔

حج کا معنی ومفہوم: لغت میں حج کے معنی ہیں، کسی قابل تعظیم چیز کا قصد کرنا، اور اصطلاح شریعت میں عبادت کی غرض سے بیت اللہ کے قصد کو حج کہتے ہیں، بشرطیکہ اس میں مقررہ ارکان، شرائط، فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کی ادائیگی کا پورا اہتمام کیا گیا ہو اور محرمات ومکروہات سے اجتناب کیا گیا ہو۔

حج کی اہمیت: حج کا سبب بیت اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیت اللہ کا حج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے، جو بھی وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، جامع ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سفر کے خرچ اور سواری پر قادر ہو، جس کے ذریعے وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے، تو عملاً اس سے کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے؟۔

امام بیہقیؒ (Imam Baihaqi) نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص حج کے لئے زادراہ اور سواری کی استطاعت رکھتا ہو، کوئی شدید مجبوری، معذوری، بیماری یا کوئی ظالم بادشاہ رکاوٹ نہ بنے اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا غرض کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ قرآن وحدیث کی یہ وعید شدید (Strong Threats of Punishment) پر شکوہ اور بے نیازانہ انداز تخاطب یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک حج کی اہمیت کیا ہے اور بلا عذر کسی تارک حج کا

مقام اسلام کیا ہے؟اور یہ کہ اس کا عمل یہود ونصاریٰ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

اسلام دین فطرت ہے: اسلام دین فطرت ہے اس کی تعلیمات عقل سلیم (Sance) کے عین مطابق ہیں،اسلام کی کوئی بھی تعلیم عقل ودانش سے متصادم نہیں ہے،لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی کوتاہ بینی، عقل نارسا اور فہم کی کمی کی بنا ء پر کسی امر الٰہی کی حکمت کو سمجھ نہیں پاتا لہٰذا اسے ہم ماورائے عقل (Beyond the Reach of Rationality)تو کہہ سکتے ہیں کہ خلاف عقل (Contrary to the Rationality)ہرگز نہیں۔

حج ایک کیفیت اور جذب وجنون کا نام ہے: حج میں بھی انسان کو سوچ اور فکر وآگہی کے ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، انسان سوچتا ہے کہ طویل مسافتیں طے کر کے اور مشقتیں برداشت کر کے اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک مقام پر جمع کرنے میں آخر کیا راز پنہاں ہے؟ سب لوگوں کا اپنا روایتی لباس اتار کر دو چادریں پہنا دینے میں کیا مصلحت ہے؟،آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ لاکھوں انسان دیوانہ وار پتھر کی ایک عمارت کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں، دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑ رہے ہیں، ایک خا ص دن اور تاریخ کو ایک خاص مقام پر پورا شہر آباد ہوتا ہے اور شام کو اجڑ جاتا ہے لاکھو ں لوگ پتھروں کے علامتی ستون پر کنکریاں برسا رہے ہیں، ایک خاص مقام پر ایک ہی دن لاکھوں لوگ جمع ہو کر لاکھوں جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں، آخر کیوں؟۔ یہ سارے انداز یہ بتاتے ہیں کہ حج معمول کے شب وروز کا نام نہیں بلکہ معمول کی زندگی کو ترک کر کے مجاہدانہ انداز سے (Camp Life) گزارنے کا نام ہے، ایک محدود عرصے کے لئے لباس، رنگ، علاقیت، زبان اور نسب ونسل کے تمام امتیازات کو کلی طور پر ترک کر دینے کا نام ہے، یہ سب کچھ دراصل امام انبیاء، ابو الانبیاء، مرکز

المسلمین، اولوالعزم رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کے صاحبزادے حضرت اسما عیل علیہ السلام اوران کی اہلیہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنھا کی اداؤں کواپنانے کا نام ہے، عالمی اسلامی اخوت، وحدت واتحاد اور نظریاتی ہم آہنگی کے بھرپور مظاہرے کا نام ہے، اوراس عزم کے عملی اظہار کا نام ہے کہ اگر اللہ تعالٰی کے دین کا تقاضا ہوا تو ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا نے کا عزم رکھتے ہیں اور حج اسی عزم مصمم کے اظہار کا نام ہے، اوراگر یہ ''روح حج ہما رے قلب وقالب میں صحیح معنوں میں اتر گئی تو ہم نے مقصد حیات پالیا، ورنہ محض مشقت سفر کے سوااور حکم الٰہی کی ظاہری تعمیل کے سوا ہمارے ہاتھ کچھ نہ آیا۔۔۔ایک دفعہ ایک حاجی، حج کر کے واپسی پر اللہ کے ایک محبوب ومقرب ولی سے ملنے چلا گیا۔ اللہ کے اس ولی نے اس سے سفر حج کی تفصیلات پوچھیں تو اس نے ایک ایک کر کے منا سک حج بیان کرنے شروع کئے، اللہ کے ولی نے کہا کہ دوست یہ بتاؤ جب پورے جذبے اور جوش وخروش کے ساتھ تم شیطان کو کنکریاں مار رہے تھے تو کیا تم نے اس شیطان کو بھی سنگسار کیا تھا جو ''نفس امارہ' کی شکل میں تمہارے وجود کے اندر آسن جما ئے بیٹھا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ''جب تم قربانی کے جانور کے گلے پر چھری چلا رہے تھے تو اس مرحلے پر کبھی تم نے یہ بھی سو چا تھا کہ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح، میرے خالق ومالک کو میری جان کا نذرانہ بھی مطلوب ہوا تو میں اپنی جان ومال کی ہر قربانی دین اسلام کے لئے پیش کردو ں گا؟ اس نے کہا: ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا'' تو یہ سن کر اللہ کے نیک بندے نے کہا: ''پھر دوبارہ حج کرو تم نے درحقیقت حج کیا ہی نہیں۔ تو حج دراصل اس کیفیت عشق اور اللہ کی راہ میں اس وارفتگی اور جذب وجنوں کا نام ہے، جس کی روایت حضرت

ابرہیم واسماعیل علیہما السلام نے ڈالی ہے۔

کعبہ معبود نہیں، جہت عبادت ہے: جب ہم عین بیت اللہ کی چوکھٹ کے سامنے سجدہ کررہے ہوں تب بھی بیت اللہ ہمارا مسجود ومعبود نہیں ہوتا، مسجود ومعبود تو صرف اور صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے، بیت اللہ تو صرف ''جہت سجدہ'' ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے غالباً اس میں حکمت یہ مستور رکھی ہے کہ کعبے کو اپنے انوار وتجلیات کا مرکز ومہبط (Focusing Point) بنا کر ہمیں اس کی جانب رخ کرکے نماز پڑھنے اور اس کے گرد طواف کرنے کا حکم دیا تاکہ ہم پر کعبہ کی برکات کے طفیل اس کی رحمتوں، برکتوں اور انوار وتجلیات کا نزول ہو، دوسری حکمت یہ ہے کہ ہماری عبادت کے لئے مرکزیت، ایک نقطہ ارتکاز توجہ (Point of concentration) ہوتا کہ ہم مختلف سمتوں کی جانب بھٹکنے سے محفوظ رہیں، اطراف عالم کے مسلمانوں میں ایک مثالی وحدت اور یک رنگی پیدا ہوجائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی قبلے کو مومن کی شناخت اور پہچان کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلے کی جانب عبادت میں رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ ظاہری علامات کے اعتبار سے مسلم ہے''۔

حج زندگی میں تبدیلی کا فیصلہ کن موڑ اور نقطہ آغاز: اسلام یہ چاہتا ہے کہ حج مومن کی زندگی میں تبدیلی لائے بلکہ چاہئے کہ یہ ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) بن جائے، گناہوں کو ترک کرکے پاکیزہ زندگی گزارنے کا نقطہ آغاز ہو، بندہ اپنے رب سے شعوری طور پر ایک عہد وپیمان اور تجدید وفا کا عزم کرکے، صرف سلا ہوا لباس ہی نہ اتارے بلکہ وہ لباس معصیت جس میں سرتاپا جکڑا ہوا ہے اسے بھی اتار پھینکے، صرف دو سفید چادروں پر مشتمل اجلا لباس ہی نہ پہنے بلکہ ایمان وایقان اور کر

دار کو بھی اتنا ہی مُصفّٰی ،مزکی اور مُنوّر بنا دے، جس طرح اس نے وہ لباس پہنا ہے جو فطرت سے قریب تر، زیب وزینت اور بناؤ سنگھار کے تکلفات سے آزاد ہے، خود اپنے آپ، اپنی روح اور جسم کو بھی اسی فطرت سلیم کے سانچے میں ڈھال لے، جس پر خالق نے اسے پہلے روز تخلیق فرمایا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی (Adgerent of Mazdaism) بنا دیتے ہیں''۔ یعنی حج کا لباس بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہوں کی ان آلودگیوں سے دور کر کے جو معاشرے نے اس پر تھوپ دی ہیں اور فطرت سے قریب تر بلکہ عین مطابق ہو جائے اسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا: ''جس نے خالص اللہ کی رضا کے لئے حج کیا اور اس کے دوران نہ تو شہوت رانی (Abscentity) کی اور نہ ہی گناہ کیا تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر لوٹے گا جیسے اپنی پیدائش کے دن گناہوں سے پاک تھا''۔ ایسے ہی کامل ومکمل حج کو رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور (Accept into the Grace of Allah) قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''حج مبرور کی جزا جنت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی''۔ اور اگر ہم نے حج سے یہ مقصد حاصل نہ کیا تو گویا ہم نے حج کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں، ایسی بے رخ عبادات صرف صورتاً عبادات ہوتی ہیں، حقیقتاً نہیں جیسا کہ فرمان رسول ﷺ ہے: ''بہت سے روزے دار ایسے ہیں، جنہیں ان کے رزوں سے بھوک کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے قائم اللیل (راتوں کو اٹھ کر عبادت کرنے والے) ایسے ہیں، جنہیں اپنی عبادتوں سے بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔

حج بنیادی طور پر مشقت کی عبادت ہے: حج بنیادی طور پر مشقت وکلفت

(Hardship) کی عبادت ہے، حج کی یہ کیفیت آج سے ہزار سال پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، ماضی میں سفر کی صعوبتیں، زادراہ کی دشواریاں، موسم کی نا گواریاں، سنگر یزوں، نوکیلے پتھروں اور کانٹوں پر چلنا، پانی کی عدم دستیابی، وسائل کی کمی وغیرہ، آج مادی لحاظ سے تصورات وتوقعات سے زیادہ راحتیں، آسائشیں بلکہ تعیّشات موجود ہیں ،لیکن مشقت کی روح آج بھی موجود ہے اس مشقت کا سب سے بڑا سبب انسانوں کا ہجوم، انسان کا آسائشوں اور تعیّشات کا دلدادہ ہونا، محنت ومشقت کا عادی نہ ہونا، جذبہ ایثار وقربانی کا فقدان، صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کا اسیر ہونا وغیرہ، چنانچہ آج طواف، سعی اور رمی جمرات اور منیٰ میں حادثات پہلے سے بدرجہا زائد ہوتے ہیں ۔حاجی جب حج سے واپس آتا ہے تو اس کے تجربات میں طرح طرح کے شکوہ، شکایات، معلمین کے ناروا سلوک کی حکایات اور اپنی اور سعودی حکومت کے عمال کی بد سلوکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا یہ طرز فکر وعمل اس لئے ہے کہ ہم ذہنی طور پر اس عمل کے لئے تیار ہوکر نہیں جاتے کہ ہم ایک سپاہی کی طرح ''کیمپ لائف'' میں جارہے ہیں ہمیں ایک بڑی مشقت کے عمل سے گزرنا ہے ۔راحت وآرام اور تعیّش ہمارا مقصود ومطلوب نہیں ہے اگر ہم ایسی سوچ لیکر جائیں تو پھر ہر بڑی تکلیف ہمیں چھوٹی نظر آئے ،اور ہمیں یہ احساس ہو کہ اتنا بڑا اجر اسی تکلیف ومشقت کا صلہ وانعام ہے ۔پھر ہم معلم وغیرہ کی شکایات پر وقت صرف کرنے کے بجائے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر وفکر میں گزاریں گے،اور کلفت کو اجر کا وسیلہ سمجھ کر اسے دل سے قبول کریں گے۔

قرعہ اندازی اسکیم پر حج

سوال: 67

عرض یہ ہے کہ سوئی سدرن گیس کمپنی کے افسران اپنی مرضی سے ہر ماہ ایک مقررہ رقم حج کنٹری بیوشن کے نام پر اپنی تنخواہ سے کٹواتے ہیں۔ ہر سال حج کی قرعہ اندازی ہوتی ہے، اور جس خوش نصیب کا نام قرعہ میں نکل آئے، اسے حج فنڈ سے حج پر بھیجا جاتا ہے۔اس مرتبہ ایک ایسے افسر کا نام نکل آیا ہے، جو قادیانی ہے اور ہر ماہ ایک مقررہ رقم حج کنٹری بیوشن کے لئے اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے (اور اس بارے میں ہمیں پہلے علم نہ تھا)۔اس بارے میں شریعت اور قانون کیا کہتا ہے؟ کیا اس شخص کو حج کے لئے بھیج سکتے ہیں؟۔

کیا سعودی یا پاکستانی حکومت کی طرف سے ان کے حج کرنے پر کوئی قانونی پابندی ہے؟۔

کیا اس شخص کی رقم حج فنڈ میں شامل کی جاسکتی ہے۔برائے مہربانی مسئلے کے حل کے جانب رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، (اشفاق احمد، سوئی سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ، گلشن اقبال روڈ، کراچی)۔

جواب:

اگر یہ کنٹری بیوشن سب شرکاء کی طرف سے رضا کارانہ ہے، کسی افسر کے دباؤ یا کسی اور سبب سے نہیں ہے۔اور سب شرکاء کی اجازت ہے کہ ان کی جمع شدہ رقم سے جس ترتیب سے قرعہ اندازی میں لوگوں کا نام نکلتا ہے، انہیں حج پر بھیج دیا جائے ،تو کوئی حرج نہیں اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ایسے امور، جن میں تمام شرکاء کا استحقاق برابر ہو، کا فیصلہ ازروئے قرآن وحدیث قرعہ اندازی سے ہوسکتا

ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وما کنت لدیھم اذ یلقون اقلامھم ایّھم یکفل مریم۔

ترجمہ: ''اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے لئے) اپنے قلموں کو ڈالتے تھے کہ مریم کی کفالت ان میں سے کون کرے، (آل عمران: 44)''۔

البتہ قادیانی کو اس اسکیم میں شامل کرنا درست نہیں ہے، اگر ایسا کوئی شخص ہے تو اسے اسکیم سے الگ کردیا جائے اور اس کی رقم اسے واپس کردی جائے، کیونکہ قادیانی پاکستان میں آئینی طور پر اور شرعاً باجماعِ امت مرتد ہیں۔ وہ اگر سچ بول کر اپنے آپ کو غیر مسلم اور قادیانی لکھیں تو انہیں حج یا عمرے کا ویزا ہی نہیں مل سکتا، کیونکہ یہ سب مسلمانوں کے لئے ہے، اور اگر وہ کتمانِ حق کرکے، دھوکہ دہی اور فریب سے پاسپورٹ اور حج کی درخواست فارم میں اپنے آپ کو مسلم لکھیں تو یہ کذب صریح اور دھوکہ دہی ہے۔ حج فارم، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ فارم سمیت تمام دستاویزات میں مسلمان کیلئے ختم نبوت کا اقرار اور قادیانی ولاہوری گروپ سے براءت کا حلفیہ اقرار نامہ لازمی ہے اور قادیانی اگر اپنے غیر مسلم ہونے کا اقرار کرکے پاسپورٹ بنائے، حج فارم بھرے، شناختی کارڈ فارم بھرے تو وہ شرعاً و قانوناً کسی بھی طریقے سے حج پر نہیں جاسکتا ہے اور اگر جھوٹا مسلم ہونے کا حلف نامہ بھرتا ہے تو صریح دغاباز ہے۔

اسقاطِ فرض کے لئے حج بدل سے متعلق ایک اہم مسئلہ

سوال: 68

ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہو، کیا وہ صرف حج افراد کا احرام باندھے گا یا کہ حج تمتع اور قران بھی کرسکتا ہے؟، حج اور عمرہ کے موضوع پر ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے: ''بیان مناسکِ حج وعمرہ''، اس کے صفحہ نمبر 39 پر لکھا ہوا ہے: ''جو

حضرات حج بدل کے لئے جا رہے ہیں، وہ صرف حج افراد کا احرام باندھیں، دوسرا احرام نہ باندھیں، (یاسر رحمان، نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

حج بدل کی مجملہ شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ حج کرنے والا، جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، اگر اس نے صرف حج افراد کرنے کا کہا ہے، تو اس پر ضروری ہے کہ وہ حج قران یا تمتع کا احرام نہ باندھے، اگر باندھے گا تو بھیجنے والے کا حج ادا نہ ہوگا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

الرابع عشر: عدم المخالفة فلو أمره بالافراد فقرن أو تمتع ولو للميت لم يقع عنه ويضمن النفقة۔

ترجمہ: ''حج بدل کی چودھویں شرط یہ ہے کہ جو شخص حج بدل پر مامور ہے، وہ اپنے آمر یعنی بھیجنے والے کے حکم کی مخالفت نہ کرے، اگر اس نے اسے حج اِفراد کا حکم دیا ہے اور حج بدل پر مامور شخص نے ''حج قران'' کیا یا ''حج تمتّع'' کیا، خواہ وہ میت کی جانب سے ہو، تو وہ حج بھیجنے والے کی طرف سے واقع نہیں ہوگا، اور وہ حج بدل کرنے والا اس حج کے اخراجات کا خود ضامن ہوگا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 4، ص: 18، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

البتہ اگر ایک شخص نے کسی کو اپنی طرف سے عمرہ کرنے کے لئے بھیجا یا حج کے لئے بھیجا اور اس نے بھیجنے والے کی طرف سے پہلے عمرہ کر کے پھر اپنی طرف سے حج کیا یا بھیجنے والے کی طرف سے حج کرنے کے بعد پھر اپنی طرف سے عمرہ کیا، تو یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، جیسا کہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

ولو أمره بالعمرة فاعتمرثم حج عن نفسه اوبالحج فحج ثم اعتمر عن نفسه جاز الخ۔۔۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 4، ص: 18، داراحیاءالتراث العربی، بیروت)"۔

لہٰذا اگر بھیجنے والا خود اجازت دے کہ میری طرف سے "حج تمتُّع" کرو یا "حج قران" کرو تو پھر وہ مامور شخص اس کے حکم کی تعمیل میں حج تمتُّع یا حج قران کرسکتا ہے، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

حج قران میں جنایت پر صورت مسئلہ کے مطابق ایک دم یا ایک صدقہ لازم آئے گا یا دو دو

سوال: 69

کیا قارن یعنی جو شخص اپنے میقات سے بیک وقت حج اور عمرے کا احرام باندھتا ہے اور پھر وہ احرام کے اندر رہتے ہوئے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے دم لازم آتا ہے تو کیا اس پر دو احرام کی وجہ سے دو دم لازم آئیں گے یا ایک ہی دم کافی ہوگا؟، اسی طرح ان امور میں جہاں بُدنہ یا صدقہ لازم آتا ہے، ایک ہی بُدنہ یا صدقہ کافی ہوگا یا دو دو لازم آئیں گے؟، (پروفیسر رضی الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاءالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویجب دمان علی قارن حلق قبل ذبحہ) دم للقران ودم للتاخیرعلی "المذهب" کما حرره المصنّف قال: وبه اندفع ما توهّمهٗ بعضهم من جعل الثّمين للجناية۔

ترجمہ: ''حج قران کا احرام باندھنے والے نے اگر قربانی سے پہلے حلق کرلیا (یعنی بال منڈھا دیئے) تو اس پر مذہب صحیح کے مطابق دو دَم لازم آئیں گے، ایک دمِ قِران اور ایک ذبح کو حلق سے مؤخر کرنے کے باعث دم لازم آئے گا، جیسا کہ مصنف (علامہ تمرتاشی) نے لکھا ہے، انہوں نے فرمایا: اور اس سے بعض لوگوں کا یہ وہم دور ہوگیا، جنہوں نے دونوں دَم جنایت کے باعث لازم قرار دیئے ہیں''۔

اس کی تشریح میں کلام کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وعن الثانی بأن التضاعف علی القارن انما یکون فیما اذا ادخل نقصا فی احرام عمرتہ، والا فلا یجب الا دم واحد، ولھذا اذا افاض القارن قبل الامام اوطاف للزیارۃ جنبا اومحدثا لایلزمہ الا دم واحد لانہ لاتعلق للعمرۃ بالوقوف وطواف الزیارۃ۔

''قارن پر دودم تب لازم آتے ہیں، جب اس کے عمرے کے احرام میں نقص لازم آیا ہو، ورنہ (عمرے کے بعد قارن پر بھی) صرف ایک ہی دم لازم آئے گا، لہٰذا جب قارن نے امام سے پہلے طوافِ افاضہ کیا یا بے وضو یا حالتِ جنابت میں طواف زیارت کیا، تو اس پر صرف ایک دم لازم آئے گا، کیونکہ عمرہ کا وقوف عرفہ اور طواف زیارت سے کوئی تعلق نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3، ص:521، باب الجنایات، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

مسئلہ: ''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے قارن پر دو ہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 762، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں، (عامۂ کتب)، (بہارِ شریعت، جلد

ششم،ص:499مکتبہ رضویہ)''۔

علامہ شامی نے البحرالرائق کے حوالے سے جو تفصیلی بحث کی ہے،اس کی روشنی میں قارن نے اگرعمرے کی ادائیگی کے دوران یااس سے پہلے کسی جنایت کاارتکاب کیاہو تو اس پرصورت مسئلہ کی نوعیت کے مطابق دو دم یا دوصدقے لازم آئیں گے، اور اگرعمرے کی ادائیگی کے بعداس نے جنایت کاارتکاب کیاہوتوصرف ایک دم یاایک صدقہ لازم آئے گا، جہاں تک دمِ قران کاتعلق ہے، وہ اپنی جگہ ہے، اعلٰیحضرت اورصدرالشریعہ رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارات سے اگرچہ بظاہر یہ تاثر ملتاہے کہ قارن پرعلی الاطلاق دودم یادوصدقے لازم آئیں گے،خواہ جنایت کاارتکاب عمرے سے پہلے کیا ہو یابعد میں،لیکن علامہ شامی کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں ان دونوں اکابر کے اقوال کومطلق نہ سمجھاجائے بلکہ اس پرمحمول کیاجائے کہ اگرجنایت کاارتکاب عمرے کی ادائیگی سے پہلے یاعمرے کی ادائیگی کے دوران کیاہوتو دودم یادوصدقے لازم آئیں گے،اورعمرے کی ادائیگی کے بعدایک ہی دم یاایک ہی صدقہ کافی ہوگا۔

دم کی ادائیگی حدودِحرم میں

سوال: 70

ہم لوگ ابھی عمرہ کرکے آئے ہیں، وہاں میرے شوہر نے عمرہ مکمل کرنے سے پہلے احرام اتاردیاتھا۔وہ فالج کے مریض ہیں، کچھ رہائش کا مسئلہ ہوگیاتھا،اس لئے ہم انہیں فوراً سعی نہیں کرواسکے،انہوں نے گرمی کی وجہ سے احرام اتار دیا تھا، دوسرے دن دوبارہ مسجد عائشہ سے احرام باندھ کردوبارہ عمرہ مکمل کروایا،اب ہمیں اس کا کتنادم دیناہوگا،اور یہ دم حدودِحرم ہی میں دیناہوگایایہاں بھی اداہوسکتاہے،(ہدایت اللہ،النورسوسائٹی،کراچی)۔

جواب:

عمرے کی ادائیگی میں سعی کرنا واجب ہے اور واجب کے ترک پر دم دینا واجب ہو جاتا ہے اور دم میں ایک بکری یا بھیڑ دی جائے گی۔

جنایت کا دم زمین حرم پر دینا ضروری ہے، دوسری جگہ ادا نہیں ہوگا۔ اور اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، جب چاہے دے سکتا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ نے الدر المختار میں لکھا:

ویتعین یوم النحر ای وقته وهو الایام الثلاثة لذبح المتعة والقران فقط فلم یجز قبله بل بعده وعلیه دم ویتعین الحرم لا منیٰ للکل۔

یعنی (قربانی کے لئے) متعین ہے یوم نحر اور اس کے لئے وقت صرف تین دن ہیں، واسطے تمتع اور قرآن والے کی قربانی کے۔ پس اس سے پہلے اور بعد جائز نہیں اور اگر کسی نے اس کے خلاف کیا تو اس پر ''دم'' ہے۔ اور دم زمین حرم میں کسی جگہ بھی دیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے ''منیٰ'' مخصوص نہیں۔

درمختار کی درج بالا عبارت کے لفظ ''فقط'' پر علامہ شامی نے لکھا: لا یتعین غیرهما فیها۔

ترجمہ: ''ان دونوں (متمتع وقارن) کے علاوہ ان اوقات میں ذبح کرنا ضروری نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 36-35 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

احرام کی حالت میں دانت سے خون آنا یا بواسیر کا خون اور اس کا حکم

سوال: 71

احرام کی حالت میں دانت سے اور بواسیر کے مسّے سے خون آنے پر کیا دم

دینا پڑتا ہے یا نہیں؟۔
2۔حج کی ادائیگی کے بعد خاندان اور برادری کے افراد کو مدعو کر کے انہیں کھانا کھلایا جاتا ہے کیا حج کا یہ کھانا کھلانا ضروری ہے؟۔
3۔حج کے دن والد اور والدہ نے کمزور ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے فرد کو رقم دیکر یہ فریضہ ادا کیا یہ صحیح یا اس پر دم دینا پڑے گا؟۔
4۔والدہ صاحبہ نے حج کے دن قربانی کی ادائیگی کے بعد اپنے بالوں کی ایک پور کاٹی تھی اور احرام کھول دیا ان پر کم بال کاٹنے پر دم ہو گا یا نہیں ؟۔(سید محمد علی D/3ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

احرام کی حالت میں خون نکلنے سے دم واجب نہیں ہوتا، منہ یا دانتوں سے خون نکلا اگر تھوک پر غالب ہے تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں، غلبے کی شناخت یہ ہے کہ اگر تھوک کا رنگ سرخ ہو جائے تو خون غالب سمجھا جائے اور اگر زرد ہو تو مغلوب۔خون، پیپ یا زرد پانی جسم کے کسی بھی حصے سے نکل کر بہا اور بہنے میں ایسی جگہ پہنچنے کی صلاحیت تھی جس کا وضو یا غسل میں دھونا فرض ہے تو وضو جاتا رہا، مگر صرف چمکا یا ابھرا اور بہنے کی صلاحیت اس میں نہیں تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اسی طرح مسواک یا انگلی سے دانت صاف کرتے ہوئے یا دانتوں سے کوئی چیز کاٹی اور اس پر خون کا اثر پایا گیا یا ناک میں انگلی ڈالی اور اس پر خون کی سرخی آ گئی مگر وہ بہنے کے قابل نہیں تو وضو نہیں ٹوٹا، ان تمام صورتوں کے باوجود محرم پر احرام کی حالت میں خون آنے پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔

2۔حاجی صاحبان کا خاندان اور برادری کے افراد کو مدعو کر کے کھانا کھلانا شرعاً ضروری

نہیں ہے، اگر کوئی شخص حج کے بعد تشکرِ نعمت کے طور پر احباب کی دعوت کرتا ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں ہے بلکہ عند اللہ اجر پائے گا، اگر محض نمود و نمائش مقصود ہے تو اجر آخرت سے محروم رہے گا، بہتر یہ ہے کہ دعوتوں میں امراء کے ساتھ نادار لوگوں کو بھی شریک کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ولیمہ کے بارے میں فرمان ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ انہ کان یقول :شر الطعام طعام الولیمۃ ،یدعی لھا الا غنیاء ویترك الفقراء ،ومن ترك الدعوۃ فقد عصی اللہ تعالیٰ ورسولہ ﷺ.

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ بُرا کھانا ولیمہ کا کھانا ہے جس میں مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں اور فقراء چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور جس نے دعوت کو ترک (یعنی بلا سبب انکار کر دیا) اس نے اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5177)''۔

3۔رمی میں نائب مقرر نہیں کر سکتے ضعف اور کمزوری اس کے لئے مانع نہیں، لہٰذا بوڑھے اور عورتیں آخری وقت میں جائیں رات میں رمی کرنا اگر چہ مکروہ ہے مگر عذر کی وجہ سے یہ کراہت باقی نہیں رہتی، رمی کسی وجہ سے نہ کر سکے تو دم دینا واجب ہے مگر ایک دن کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور صرف ایک جمرہ کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور تینوں دنوں کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم لازم آئے گا، لہٰذا جب اگر ایسا عذر ہو جس کی وجہ سے رمی نہیں کر سکتا تو تیسرے دن دم دے گا اور یہ دم حدود حرم میں دینا ضروری ہے۔

4۔عورتیں اپنے بالوں میں سے ایک پور کے برابر بال لے کر کاٹ دیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والتقصیر ان یاخذ الرجل والمرأۃ من رؤس الشعر ربع الر

أس مقدار الانمله كذا في التبيين۔

ترجمہ: ''اور تقصیر یہ ہے کہ مرد اور عورت اپنے سر کے بال چوتھائی سر سے ایک پور کے برابر لے لیں'' ''تبیین'' میں اسی طرح سے ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص : 231 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

دورانِ حج ناپاکی

سوال: 72

اگر کسی عورت کو دورانِ حج حیض آجائے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟،(عادل،پشاور)۔

جواب:

اگر خاتون نے حج کا احرام باندھ لیا ہے تو وہ مُحرِمہ ہے،یعنی احرام میں داخل ہوچکی ہے۔اب اگر دوران حج اسے حیض آجائے تو وہ تمام مناسکِ حج معمول کے مطابق جاری رکھے گی،یعنی وقوفِ منیٰ،وقوفِ عرفات،وقوف مزدلفہ،رمیِ جمار(یعنی شیطانوں کو کنکریاں مارنا)،قربانی اوراحرام سے باہر آنے کا عمل دیگر حجاج کرام کے ساتھ جاری رکھے گی۔اس دوران وہ دعائیں کرسکتی ہے،مگر تلاوت نہیں کرسکتی اور نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔اسی طرح حیض سے فراغت تک طوافِ زیارت کو مؤخر کرے گی،حرم میں بھی نہیں جائے گی۔اور چونکہ ''طوافِ زیارت'' میں تاخیر اس کی اپنی کسی بشری کوتاہی کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ یہ مانع یا ''عذرِ تاخیر'' اسے اللہ کی جانب سے پیش آیا ہے،اس لئے اس تاخیر کی بنا پر اس پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا،لہٰذا جب وہ حیض سے پاک ہوجائے تو غسل کرکے پاک ہوجائے اور ''طوافِ زیارت'' کرلے۔

حج وعمرہ کے مسائل

حج وعمرہ اورزیارتِ روضہء رسول ﷺ کے متعلق چند اشکالات کے جواب قرآن وسنت وفقہ حنفی کی روشنی میں عطافرما کرعنداللہ ماجورہوں۔جزاک اللہ،(سید محمد طاہر الحسن،مکان نمبر R-48 3-C-11 ناتھ کراچی)۔

سوال: 73

حرم کے رہنے والے عمرے کے لئے احرام کہاں سے باندھیں؟۔

جواب:

حدثنا همام وقال : اعتمر أربع عمر في ذی القعدة ،الّا الّتی اعتمر مع حجّته: عمرته من الحديبية ،ومن العام المقبل ،ومن الجعرانة حيث قسم غنائم حنين،وعمرة مع حجته۔

ترجمہ:’’ہمام سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے چار عمرے کئے ،سارے ذی القعدہ میں سوائے اس ایک کے جو اپنے حج کے ساتھ کیا۔ایک عمرہ حدیبیہ والا،ایک اگلے سال تیسرا جعرانہ سے جبکہ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کیا اور چوتھا عمرہ اپنے حج کے ساتھ،(صحیح بخاری رقم الحدیث: 1780)‘‘۔

أنّ عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنهما أخبره: أنّ النبی ﷺ أمره أن يردف عائشة ويعمرها من التنعيم۔

ترجمہ:’’عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ عائشہ کو سواری کے پیچھے بٹھا کر تنعیم سے عمرہ کروالاؤ،(صحیح بخاری رقم الحدیث:1784)‘‘۔

ردالمحتار میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:(والتنعيم افضله)

هو موضع قريب من مكة عند مسجد عائشه، وهو اقرب موضع من الحل اى الاحرام منه للعمرة افضل من الاحرام لها من الجعرانة وغيرها من الحل عندنا، وان كان ﷺ احرم منها، لأمره عليه الصلاة والسلام عبدالرحمن بان يذهب باخته عائشة الى التنعيم لتحرم منه۔

ترجمہ: "(تنعیم سے احرام باندھنا افضل ہے) یہ وہ جگہ ہے، جو مکہ سے انتہائی قریب مسجد عائشہ کے نزدیک ہے اور حل سے قریب ترین جگہ ہے۔ یعنی عمرہ کے لئے تنعیم سے احرام باندھنا جعرانہ اور حل کے دیگر مقامات سے ہمارے نزدیک افضل ہے ،اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے جعرانہ سے بھی احرام باندھا ہے اور ہمارے اس موقف پر حجت نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو حکم دیا کہ وہ اپنی بہن (ام المؤمنین) عائشہ کو تنعیم لے جائیں تاکہ وہ وہاں احرام باندھیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3 ص: 429 مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں اگرچہ مسجدِ عائشہ (تنعیم) اور جعرانہ دونوں جگہ سے عمرے کا احرام باندھا جاسکتا ہے، لیکن مقامِ تنعیم (مسجد عائشہ) سے باندھنا افضل ہے۔

سوال: 74

کیا احرام کے لئے دو رکعت نفل ادا کرنا حدیث مبارک سے ثابت نہیں؟۔

جواب:

احرام کے لئے دو رکعت نفل پڑھنا سنت ہے اور حدیث مبارک سے ثابت ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

حدثني خصيف بن عبدالرحمن الجزري، عن سعيد بن جبير، قال:قلت لعبدالله بن عباس :يا أبا العباس ،عجبت لاختلاف أصحاب رسول الله ﷺ في اهلال رسول الله ﷺ حين أوجب؟! فقال اني لأعلم الناس بذالك،انها انما كانت من رسول الله ﷺ حجة واحدة،فمن هناك اختلفوا۔خرج رسول الله ﷺ حاجاً،فلماصلی في مسجده بذي الحليفة ركعتين أوجب في مجلسه،فأهلّ بالحج حين فرغ من ركعتين،فسمع ذالك منه اقوام فحفظته عنه،ثم ركب فلما استقلّت به ناقته أهلّ،وأدرك ذالك منه أقوام، وذالك أنّ الناس انما كانوا يأتون أرسالاً،فسمعوه حين استقلّت به ناقته يهلّ،فقالوا:انما أهلّ[رسول اللّٰه]حين استقلّت به ناقته،ثم مضی رسول الله ﷺ فلماعلا علی شرف البيداء أهلّ،وادرك ذالك منه أقوام فقالوا:انماأهلّ حين علا شرف البيداء۔[قال سعيد:] وايم الله لقد أوجب في مصلاه،وأهلّ حين استقلّت به ناقته،وأهلّ حين علا شرف البيداء۔[قال سعيد:]فمن أخذ بقول عبدالله بن عباس أهلّ في مصلّاه اذا فرغ من ركعتين۔

ترجمہ:''خصیف بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما سے کہا کہ:ابوالعباس مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس جگہ سے احرام باندھا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما نے فرمایا: میں اس مسئلے کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی حج کیا ہے اور اسی وجہ سے اختلاف ہوا۔جب رسول اللہ ﷺ حج کے لئے تشریف لے گئے تو آپ نے مسجد

ذوالحلیفہ میں دورکعت نماز پڑھی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسی مجلس میں آپ نے تلبیہ کہہ کر احرام باندھ لیا اور کچھ لوگوں نے آپ سے یہ تلبیہ سنا اور اس کو یاد رکھا، پھر آپ اونٹنی پر سوار ہوئے، جب آپ اونٹنی پر صحیح طریقے سے بیٹھ گئے تو آپ نے تلبیہ کہا اور کچھ لوگوں نے اس موقع پر آپ سے سنا، اور اس (اختلاف یا غلط فہمی) کا سبب یہ ہے کہ لوگ گروہ در گروہ آرہے تھے، اور (کچھ لوگوں نے) اس وقت آپ سے تلبیہ سنا، جب آپ اونٹنی پر بیٹھ گئے تو انہوں نے (اپنے مشاہدے کے بنا پر) یہ کہا: رسول اللہ ﷺ جب اونٹنی پر بیٹھ گئے، تو آپ نے اس وقت تلبیہ پڑھی (یعنی احرام باندھا)، پھر جب آپ شرف البیداء پر پہنچے تو آپ نے تلبیہ پڑھی، اور کچھ لوگوں نے (پہلی بار) آپ سے اسی موقع پر تلبیہ سنی تو انہوں نے یہ کہا کہ آپ نے شرف البیداء پر احرام کی نیت کی ہے اور (سعید نے کہا:) اللہ کی قسم آپ نے احرام کی نیت اس جگہ کی تھی جہاں آپ نے (دو رکعت) نماز پڑھی تھی اور پھر آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر بھی تلبیہ پڑھی اور شرف البیداء پر پہنچ کر بھی تلبیہ پڑھی۔ (سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ) جو شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما کے قول پر عمل کرتا ہے وہ مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھے (اور تلبیہ پڑھے)، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 1768)''، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وصلّی ندباً) بعد ذالك (شفعاً) یعنی رکعتین فی غیر وقت مکروہ وتجزیہ المکتوبۃ۔

ترجمہ: اور لباسِ احرام پہننے کے بعد نماز پڑھنا مستحب ہے یعنی دو رکعت وقتِ غیر مکروہ میں، اور (اگر وہ فرض کا وقت ہے تو) فرض بھی اس مقصد کے لئے کافی ہے۔

علامہ شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

(ندبا)وفي الغاية انها سنة ۔"نهر"۔وبه جزم في "البحر"و"السراج"۔قوله:(بعد ذالك)اى بعد اللبس والتطيب ۔"بحر"قوله:(يعني ركعتين)يشير الى ان الاولى التعبير بهما كمافعل في "الكنز"۔لان الشفع يشمل الاربع۔قوله:"وتجزيه المكتوبة" كذا في "الزيلعي"و"الفتح"و"النهر"و"اللباب"وغيرها وشبهوهابتحية المسجد۔۔وفي "شرح اللباب"انه قياس مع الفارق لان صلاة الاحرام سنة مستقلة كصلاة الاستخارة وغيرهامما لا تنوب الفريضة منابها،بخلاف تحية المسجد وشكر الوضوء،فانه ليس لهما صلاة على حدة كما حققه في "فتاوى الحجة"۔فتتأدى في ضمن غيرها ايضاً اه۔

ترجمہ:''(بطور نفل پڑھے)اور''الغایۃ'' میں ہے کہ (بوقت احرام)دورکعت پڑھنا سنت ہے،اور''البحرالرائق''اور''السراج'' میں اسی قول کوقطعی قرار دیا ہے،علامہ حصکفی کےقول:(اس کےبعد) کا مطلب یہ ہے کہ لباسِ احرام پہننےاورخوشبو لگانے کےبعد،''البحرالرائق'' میں ہے کہ علامہ حصکفی کےقول (یعنی دورکعت پڑھے) سے مراد یہ ہے کہ نمازِاحرام کوکم ازکم دورکعت سےتعبیر کرنا اولیٰ (بہتر) ہے،جیسا کہ ''کنزالدقائق''میں کیا ہے،کیونکہ دورکعت چارکوبھی شامل ہے(یعنی اگراس وقت چار رکعات پڑھ لیں) تو ان کے ضمن میں دورکعات بطریقِ اولیٰ آجائیں گی(اورچاریا زیادہ سے ممانعت مقصودنہیں ہے)،اورعلامہ حصکفی کا یہ کہنا کہ ''اورفرض نماز کےضمن میں بھی یہ دوگانہ احرام اداہوجائیں گی،جیسا کہ الزیلعی،فتح القدیر،النھر ،اللباب میں ہےاورانہوں نے اس (دوگانۂ احرام) کو(دوگانہ)تحیۃ المسجد سےتشبیہ دی ہے(جوتنگیٔ وقت یا قیامِ جماعت کی صورت میں فرض کے ضمن میں

بھی ادا ہو جاتی ہے)،اور ''شرح اللباب'' میں ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ نمازِ استخارہ وغیرہ کی طرح نمازِ احرام مستقل سنت ہے تو فرض نماز اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتی ، بخلاف تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء کہ ان کے لئے مستقل بالذات نمازِ مسنون نہیں ہے، جیسا کہ ''فتاوی الحجۃ'' میں اس کی (خوب) تحقیق کی ہے کہ یہ نمازیں (تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء) دوسری نمازوں (فرض وغیرہ) کے ضمن میں بھی ادا ہو جاتی ہیں، (رد المحتار علی در المختار جلد 3 ص 432: دار احیاء التراث العربی بیروت)''۔

سوال: 75

کیا حجرِ اسود کو بوسہ دینے یا چھونے کے وقت حصولِ برکت کی نیت کرنا بدعت ہے؟۔

جواب:

استلامِ حجرِ اسود یعنی حجرِ اسود کو بوسہ دیتے وقت حصولِ خیر و برکت اور ثواب کی نیت کرنا بدعت نہیں بلکہ عین عبادت ہے کیونکہ حج و عمرہ کے ایک اہم رکن طوافِ بیت اللہ کے موقع پر حجرِ اسود کو بوسہ دینا سنت ہے۔علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

من الاستلام فهو سنة بين كل شوطين كما في "غاية البيان" وذكر في "المحيط" و "الولوالجية" ـ أنه في الابتداء والانتهاء سنة ،وفيما بين ذلك أدب ـ "بحر" ـ ووفق في "شرح اللباب" بانه في الطرفين اكد مما بينهما ـ

ترجمہ: ''استلامِ حجر ہر دو چکروں کے درمیان سنت ہے، جیسا کہ ''غایۃ البیان'' میں ہے اور ''المحیط'' اور ''والوالجیۃ'' میں ہے کہ طوافِ بیت اللہ کی ابتدا اور انتہا کے موقع پر سنت اور درمیان کے چکروں میں آداب میں سے یعنی مستحب ہے، ''البحر الرائق'' (میں بھی اسی طرح ہے)،اور ''شرح اللباب'' میں بھی اسی کے موافق کہا کہ طواف کی

ابتدا وانتہا میں حجراسود کا استلام زیادہ مؤکد ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:453 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

تو جب حجرِ اسود کو بوسہ دینا عبادتِ حج وعمرہ کے ایک اہم رکن طوافِ بیت اللہ کے دوران ہر چکر کے موقع پر سنت یا کم ازکم مستحب ہے، عبادت تو ثواب اور خیر برکت کے لئے ہوتی ہے، عبادت مشروع اور بدعت دو متضاد چیزیں ہیں، بعض لوگوں کو شاید اس حدیثِ مبارک سے غلط فہمی ہوئی ہے:

عن عبداللہ بن سرجس قال: رأیت الأصلع (یعنی عمر بن الخطاب) یقبل الحجر ویقول: واللہ انی لأقبلك، وانی اعلم انك حجر، وانك لا تضر ولا تنفع۔ ولو لا انی رأیت رسول اللہ ﷺ قبلك ما قبلتك۔

ترجمہ: "عبداللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے بخدا میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں، حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نفع دیتا ہے نہ نقصان، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا، (صحیح مسلم رقم الحدیث: 3016)"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حجرِ اسود کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ: میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نفع دیتا ہے نہ نقصان، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حجرِ اسود یا کوئی بھی مخلوق اپنی ذات سے نفع یا ضرر رساں نہیں ہے، جس مخلوق میں جو بھی کمال ہے اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور یہ بات انہوں نے اس تناظر میں فرمائی کہ عہدِ جاہلیت میں لوگ پتھر کے بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انہیں بالذات نفع دینے

والا اور نقصان پہنچانے والا سمجھتے تھے، مزید یہ کہ وہ عقیدۂ توحید کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنا چاہتے تھے اور اعمالِ خیر وعبادات میں اتباعِ رسول کو اصلِ مقصود سمجھنے کے تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے اور یہ بات عیاں ہے کہ جب حجرِ اسود کو بوسہ دینا، اتباعِ رسول ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں ثواب بھی ہے، خیر و برکت بھی ہے اور اتباعِ سنت اسی نیت سے کرنی چاہئے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات سنے تو انہوں نے فرمایا: نہیں! یہ نفع بھی دیتا ہے اور نقصان بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے پوچھا! اس کا ثبوت کس سے ہے، حضرت علی نے کہا! قرآن مجید سے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واذاخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلیٰ۔

ترجمہ: ''اور جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا، کیوں نہیں!''۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان سے اقرار کرایا ، اللہ ان کا رب ہے اور وہ اس کے بندے ہیں، اور ان سے اس کا عہد وپیمان لیا اور اس کو ایک کاغذ میں لکھ دیا اور پتھر کی دو آنکھیں اور ایک زبان تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: منہ کھول، اس نے منہ کھولا، اللہ تعالیٰ نے وہ کاغذ اس کے منہ میں ڈال دیا اور فرمایا: جو تجھ سے وفا کرے قیامت کے دن اس کی گواہی دینا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا: قیامت کے دن حجرِ اسود کو لایا جائے گا اور جو شخص اس کی تعظیم کرے گا یہ قیامت کے دن اس کی گواہی دے

گا، پس اے امیر المؤمنین یہ ضرر بھی دیتا ہے اور نفع بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے کہا: میں اس بات سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں اس قوم میں رہوں، جس میں اے ابوالحسن تم نہ ہو، (شرح المؤطا جلد 2 ص: 287 مطبوعہ مطبع خیریہ مصر بحوالہ شرح صحیح مسلم جلد 3 ص: 499-498 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)"۔

سوال: 76

رمی جمرات کیلئے حجاج کرام مزدلفہ سے کنکریاں اپنے ہمراہ چن کر منیٰ لے جاتے ہیں کیا یہ مشروع ہے؟ یا حدودِ حرمِ پاک میں کہیں سے بھی چنی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے تینوں دن جمرات پر مارنے کے لئے کنکریاں یہیں سے لے لی جائیں یا کسی اور جگہ سے لی جائیں مگر نہ نجس جگہ کی ہوں اور نہ مسجد کی نہ جمرہ کے پاس کی۔ جمرہ کے پاس کی کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے کہ وہاں وہی کنکریاں رہتی ہیں جو مقبول نہیں ہوتیں اور مردود ہو جاتی ہیں، اور جو مقبول ہو جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویکرہ) أخذھا(من عند الجمرة) لأنّھا مردود لحدیث" من قبلت حجته رفعت جمرته (و) یکرہ (أن یلتقط حجراً واحداً فیکسرہ سبعین حجراً صغیراً)۔

ترجمہ: اور جمرے کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے، اس لئے کہ وہ مردود ہوتی ہیں حدیث شریف میں ہے کہ "جس کا حج قبول ہو جاتا ہے اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں"، اس کی تشریح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

وما هي الّا كراهة تنزيه۔ "فتح"۔ أشار الىٰ أنه يجوز أخذه من أى موضع سواه۔ وفي "اللباب": يستحب أن يرفع من مزدلفة سبع حصيات ويرمي بها جمرة العقبة وان رفع من المزدلفة سبعين أو من الطريق فهو جائز، وقيل مستحب اه۔

ترجمہ: "جمرہ کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ تنزیہی ہے" "فتح القدیر" میں اسی طرح ہے۔ اور اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے مقام سے اٹھانا جائز ہے۔ اور "اللباب" میں ہے: مستحب ہے کہ جمرہ سے سات کنکریاں اٹھائی جائیں اور جمرۂ عقبہ پر رمی کی جائے، اور اگر مزدلفہ ہی سے یا کسی اور راستے سے 70 کنکریاں اٹھالی جائیں تو یہ جائز ہے اور بعض علماء نے مستحب فرمایا ہے۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 473، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

سوال: 77

کیا تیسری رات بھی منیٰ میں گزارنا افضل ہے یا تیسرے دن (۱۲ ذی الحجہ) کو غروبِ آفتاب سے قبل منیٰ سے روانہ ہونا افضل ہے؟۔

جواب:

بارہویں کی رمی کر کے غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے اختیار ہے کہ مکہ روانہ ہوجائے یعنی اس کی رخصت ہے، یہ افضل نہیں ہے، مگر غروب کے بعد جانا معیوب ہے اب ایک دن اور ٹھہرے اور تیرہویں کو دوپہر ڈھلے رمی کر کے روانہ ہو یہی افضل ہے۔ تیرہویں کی صبح ہوگئی تو بغیر رمی کئے جانا جائز نہیں اگر جائے گا تو دم واجب ہوگا۔

سوال: 78

اگر کوئی محرم بھول کر یا عدمِ علم کے سبب حالتِ احرام میں سلا ہوا کپڑا چند

لمحوں کے لئے پہن لے یا سر کو ڈھانک لے یا خوشبو استعمال کر لے یا بال وناخن تراش لے تو کیا دم واجب ہوگا؟۔

جواب:

جی ہاں! دم واجب ہوگا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(الواجب دم علی محرم بالغ ولو ناسیاً) او جاهلاً او مکرهاً فیجب علی نائم غطی راسه(إن طیب عضواً)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(أو لبس مخیطاً)۔

او ستر راسه بمعتاد، اما بحمل اجانة او عدل فلا شئ علیه یوما کاملا او لیلة کاملة ، وفی الاقل صدقة ۔

ترجمہ: ''ہر محرم بالغ پر (اگر اس نے ترکِ واجب کیا ہوتو) دم واجب ہوتا ہے، خواہ اس نے وہ عمل بھول کر کیا ہو یا لاعلمی میں کیا ہو، یا حالتِ مجبوری میں کیا ہو،تو اگر نیند کی حالت میں محرم نے سر ڈھانپ لیا، (یا کسی پورے عضو پر خوشبو لگائی)۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: یا ایسا سلا ہوا کپڑا پہنا، جیسے عادتاً پہنا جاتا ہے، لیکن اگر اسے چادر کے طور پر اوڑھ لیا یا اپنے کندھے پر رکھا تو کوئی حرج نہیں، پورا دن یا پوری رات سر ڈھانپ لیا، جیسے عام طور پر ڈھانپا جاتا ہے، (تمام سر یا چوتھائی حصہ)تو دم لازم ہوگا، لیکن اگر پورے دن یا پوری رات سے کم وقت ڈھانپا تو صدقہ دینا ہوگا، (رد المحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 507 ,511,508 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

سوال: 79

کیا طوافِ افاضہ، طوافِ زیارت دونوں ایک ہیں؟

جواب:

جی ہاں! دونوں ایک ہیں، علامہ شامی لکھتے ہیں:

(ثم طاف للزیارۃ) أی لفعل طواف الزیارۃ الذی ھو ثانی رکنی الحج۔ قال فی "السراج" ویسمی الافاضۃ وطواف یوم النحر وطواف المفروض۔

ترجمہ: "(پھر طواف زیارت کرنا) یعنی طوافِ زیارت کرنا حج کا دوسرا اہم رکن ہے اور "السراج" میں فرمایا: اس کا نام طوافِ افاضہ، طوافِ یوم النحر اور طوافِ فرض بھی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد 3 ص: 476 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

سوال: 80

دس ذی الحجہ کے اعمال (رمی جمرۂ عقبہ، قربانی، حلق، طوافِ زیارت) میں ترتیب قائم نہ رہ سکے تو کیا کفارہ لازم آئے گا یا شریعت کی طرف سے تقدیم وتاخیر جائز ہے؟ نیز حج بیت اللہ ناقص تو نہ ہوگا؟۔

جواب:

دس ذی الحجہ کے اعمالِ حج میں ترتیب لازم ہے، خلافِ ترتیب کرنے سے (یعنی تقدیم وتاخیر سے) دم لازم آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید ہے کہ دم ادا کرنے سے حج ناقص نہیں رہے گا، علامہ ابوالحسن مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

"افعالِ حج کو ایک دوسرے پر مقدم کرنے کے حکم میں اختلاف ہے، جیسے سر منڈانے کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا قربانی کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا سر منڈانے کو قربانی سے پہلے کیا جائے، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک یہ جائز ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جو چیز فوت ہوگئی ہے اس کی تلافی قضا سے ہو جاتی ہے اور قضا کیساتھ کوئی اور

چیز لازم نہیں ہوتی، امام ابوحنیفہ کے نزدیک ترتیب کے خلاف کرنے سے دم لازم آتا ہے،ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "من قدم نسکا علی نسك فعلیه دم" جس شخص نے حج کے ایک فعل کو دوسرے پر مقدم کر دیا اس پر دم لازم ہے"۔

علامہ ابن ھمام لکھتے ہیں کہ:

"امام ابو یوسف اور امام محمد کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ حجۃ الوداع میں کھڑے ہوئے تھے،ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ میں نے لاعلمی میں سر منڈالیا،آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں،اب ذبح کر لو،ایک اور شخص نے کہا: میں نے لاعلمی میں کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر دی،آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں،اب کنکریاں مار لو اور اس دن جس چیز کے بھی مقدم یا مؤخر کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے یہی فرمایا کہ اب کرلو کوئی حرج نہیں ہے،اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ حرج نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس سے گناہ نہیں ہوگا اور حج فاسد نہیں ہوگا، یہ معنی نہیں ہے کہ اس پر کوئی جزا یا فدیہ نہیں ہے، کیونکہ کہنے والے نے یہ کہا کہ میں نے لاعلمی میں یہ کام کیا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ کام کرنے کے بعد اس پر منکشف ہوا کہ یہ تقدیم یا تاخیر ممنوع تھی،اسی وجہ سے اس نے سوال کرنے سے پہلے اپنا عذر بیان کیا کہ میں نے لاعلمی کی بنا پر اس کو مقدم یا مؤخر کیا ہے،امام ابو یوسف اور امام محمد کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سائل نے جب یہ دیکھا کہ اس کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی ترتیب کے مخالف ہے اور اس نے یہ گمان کیا کہ یہ ترتیب معین ہے تو اس نے عذر پیش کر کے یہ سوال کیا اور نبی ﷺ نے جواب میں حرج کی نفی کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ یہ ترتیب کرنا اس پر معین نہیں ہے بلکہ یہ ترتیب مسنون ہے نہ کہ واجب،

حق یہ ہے کہ جس طرح یہ احتمال ہے اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ترتیب واجب ہو اور نبی ﷺ نے اس کو جہل کی وجہ سے معذور قرار دیا ہو۔ آپ نے صحابہ کو افعال حج سیکھنے کا حکم دیا اور جہل کی وجہ سے ان کو معذور قرار دیا، کیونکہ یہ فرضیت حج کا ابتدائی دور تھا، اور جب اس معاملے میں یہ دونوں احتمال موجود ہیں تو احتیاطاً ترتیب کے وجوب کے قول پر عمل کرنا چاہئے اور اس سے امام ابو حنیفہ کی دلیل مضبوط ہوتی ہے اور ان کی تائید حضرت ابن مسعود کے اس قول سے ہوتی ہے: من قدم نسکا علی نسك فعلیه دم۔ (جس نے حج کی ایک عبادت کو دوسری پر مقدم کر دیا اس پر دم ہے) بلکہ یہ ایک مستقل دلیل ہے، ہدایہ کے بعض نسخوں میں حضرت ابن مسعود کی جگہ حضرت ابن عباس کا ذکر ہے اور یہ زیادہ معروف ہے۔ امام ابن ابی شیبہ نے یہ روایت ذکر کی ہے، ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: من قدم شیئا من حجه او اخره فلیهرق دماً۔ ترجمہ: ''جو شخص اپنے حج میں کسی عبادت کو مقدم یا مؤخر کر دے وہ ایک قربانی دے''۔ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جس کو ضعیف کہا گیا ہے۔ امام طحاوی نے یہ روایت ایک اور سند سے بیان کی ہے جس میں یہ ضعیف راوی نہیں ہے وہ سند یہ ہے: حدثنا ابن مرزوق حدثنا الخصیب حدثنا وھیب عن ایوب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس مثله۔ امام طحاوی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان راویوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ''کوئی حرج نہیں اب کر لو'' اور یہ حدیث ان کے نزدیک اجازت اور اباحت پر محمول نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اس پر محمول ہے کہ انھوں نے جہل اور لاعلمی کی وجہ سے بعض عبادات کو مقدم یا مؤخر کر دیا تھا، آپ نے ان کو معذور قرار دیا اور حج کی عبادات سیکھنے کا حکم دیا، علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ: امام ابو حنیفہ کے نظریہ پر اس آیت سے بھی

استدلال ہے: فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ ففدیۃ ۔ ''تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو وہ فدیہ دے''۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص بیماری کے عذر کی بناء پر اپنے وقت سے پہلے سر منڈا دے تو وہ فدیہ دے تو جب عذر کے باوجود وقت سے پہلے سر منڈانے پر فدیہ لازم آتا ہے، تو وقت سے پہلے بلا عذر سر منڈانے پر تو بطریقِ اولیٰ فدیہ لازم آئے گا، (فتح القدیر جلد 3 ص: 55 مطبوعہ مرکزِ اہلِ سنت برکاتِ رضا، گجرات، انڈیا)''۔ الغرض امام اعظم کے نزدیک رمی، قربانی (متمتع اور قارن کے لئے) اور حلق میں ترتیب واجب ہے، حجِ اِفراد والے پر چونکہ قربانی واجب نہیں ہے لہٰذا اس پر صرف دو امور (رمی اور حلق) میں ترتیب واجب ہے، البتہ طوافِ زیارت میں ترتیب واجب نہیں ہے، یہ خلافِ ترتیب (یعنی رمی، قربانی اور حلق سے پہلے) بھی کیا جاسکتا ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

فیجب فی یوم النحر اربعۃ اشیاء :الرّمی ،ثمّ الذبح لغیر المفرد ،ثمّ الحلق ،ثمّ الطّواف ،لکن لا شئی علی من طاف قبل الرّمی و الحلق ،نعم یکرہ ۔

ترجمہ: ''پس نحر (قربانی) کے دن (یعنی دس ذی الحجہ کو) چار امور واجب ہیں: (1) رمی (یعنی بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا)، (2) غیرِ مُفرِد (یعنی حجِ قران اور حجِ تمتُّع کرنے والے کے لئے) ذبح یعنی قربانی کرنا، (3) اور حلق کرنا (یعنی سَر منڈانا یا بال کاٹنا، (4) طوافِ زیارت کرنا (اسے طوافِ اِفاضہ بھی کہتے ہیں)، لیکن کسی نے رمی اور حلق سے پہلے طواف کرلیا تو اس پر کوئی چیز (یعنی دَم یا صدقہ) واجب نہیں ہے، ہاں! اس طرح کرنا مکروہ ہے۔۔۔۔۔ اس کی شرح میں علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

والحاصل أن الطواف لا يجب ترتيبه على شئی من الثلاثة ،وانما يجب ترتيب الثلاثة : الرّمی ثمّ الذبح ثمّ الحلق ،لكن المفرد لا ذبح عليه فيجب عليه الترتيب بين الرمی والحلق فقط ۔

ترجمہ: ''اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ طوافِ زیارت کی ترتیب ان تینوں چیزوں میں سے کسی چیز پر بھی واجب نہیں ہے، ترتیب فقط ان تین چیزوں کے درمیان واجب ہے ،یعنی پہلے
''رمی'' کرے، پھر ''قربانی'' کرے اور پھر ''حلق یا قصر'' کرے ،لیکن مُفرِد (یعنی جس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو) پر چونکہ قربانی نہیں ہے، لہٰذا اس کے لئے صرف دو چیزوں یعنی رمی اور حلق کے درمیان ترتیب واجب ہے ،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 3،ص: 520، 521، دارا حیاءالتراث العربی، بیروت)''۔

سوال: 81

بعض احباب حج وعمرہ کی نیت سے وطن سے حجاز مقدس روانہ ہوتے ہیں، مگر احرام کے بغیر میقات سے گزرتے ہیں، پہلے چند دن جدہ یا ریاض یا وہاں کے دیگر شہروں میں اپنے عزیز واقارب کے گھر قیام کرکے پھر ان کے ہمراہ احرام باندھ کر عمرہ یا حج کی ادائیگی کے لئے جاتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل مناسک حج وعمرہ میں نقائص کا سبب تو نہیں بنتا ،اس تناظر میں کیا ان پر دم واجب ہوگا؟۔

جواب:

مکہ معظمہ جانے کا ارادہ نہ ہو بلکہ میقات کے اندر(یعنی حِل میں، جو حدودِحرم کے اختتام اور میقات کے درمیان کا علاقہ ہے) کسی اور جگہ مثلاً جدہ جانا چاہتا ہے تو اسے احرام کی ضرورت نہیں پھر وہاں سے اگر مکہ معظّمہ جانا چاہے تو بغیر

احرام جاسکتا ہے لہٰذا جو شخص حرم میں بغیر احرام جانا چاہتا ہے وہ یہ حیلہ کرسکتا ہے بشر طیکہ واقعی اس کا ارادہ پہلے مثلاً جدہ یا کسی اور مقام حل میں جانے کا ہو، نیز مکہ معظّمہ حج اور عمرہ کے ارادے سے نہ جانا ہو مثلاً تجارت کے لئے جدہ جاتا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر مکہ معظّمہ جانے کا ارادہ ہے اور اگر پہلے ہی سے مکہ معظّمہ کا ارادہ ہے تو پھر بغیر احرام نہیں جانا چاہئے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(قصد دخول مكة) يعني الحرم (ولو لحاجة)غير الحج ،أما لو قصد موضعاً من الحل كخليص و جدة حل له مجاوزته بلا احرام،فاذا حل به التحق بأهله فله دخول مكة بلا احرام۔

ترجمہ:''حج کے علاوہ اپنی کسی ضرورت کے لئے مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا پھر ارادہ کیا، یا اگر حدودِ حِل میں کسی مقام پر جانے کا ارادہ کیا، جیسے خلیص یا جدّہ تو پھر اس کے لئے میقات سے احرام کے بغیر گذرنا جائز ہے، جب وہاں اتر کر اپنے گھر والوں سے مل جائے تو اب وہ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہوسکتا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 427 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

بہت سے آفاقی لوگ، جیسے اہل پاکستان، جن کے عزیز و اقارب سعودی عرب میں جدّہ یا کسی اور مقامِ حِل میں رہتے ہیں، جب حج یا عمرہ کیلئے جانا چاہتے ہیں تو سہولت پسندی کی وجہ سے یہاں سے احرام باندھ کر نہیں جاتے ہیں، بلکہ پہلے جدّہ یا کسی دوسرے مقام پر جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ احرام باندھ کر جا کر عمرہ کر لیتے ہیں۔ایسا کرنا ان کے لئے جائز ہے، افضل ہرگز نہیں ہے اور یقیناً اجر و ثواب میں کمی کا بھی باعث ہوگا۔کیونکہ اگر وہ یہاں سے عمرے کی نیت سے سفر کر رہے ہیں تو بغیر احرام کے ان کا میقات سے گذرنا درست نہیں ہے۔

اوراگر وہ یہاں سے دوستوں عزیزوں کی ملاقات کی نیت سے جدّہ یاکسی اور مقامِ حل کا سفر کرتے ہیں،تو یہاں سے ان کا یہ سفر عبادات میں شمار نہیں ہوگا،تا ہم اس سے ان پر دم واجب نہیں ہوگا،البتہ یہ اجر میں کمی کا باعث ہوگا۔اس لئے ہمارے نزدیک افضل یہ ہے کہ وہ یہاں سے احرام باندھ کرروانہ ہوں تو ان کا یہ پورا سفر اور کل مصارف سفر عبادت میں شمار ہوں گے،اورخدانخواستہ کسی حادثۂ ناگہانی کا شکار ہوگئے تو روزِحشر حالتِ احرام میں اٹھیں گے،جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنهما قال: بینما رجل واقف مع رسول اللّٰہ ﷺ بعرفة،اذ وقع عن راحلته فوقصته ،أو قال فأقعصته ،فقال رسول اللّٰہ ﷺ: "اغسلوه بماءٍ وسدرٍ، و كفّنوه فی ثوبین ،ولا تحنّطوه ،ولا تخمّروا رأسه ،فانّ اللّٰہ یبعثه یوم القیامة ملبیا"۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما نے فرمایا:ایک آدمی عرفات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھڑا تھا کہ سواری سے گر پڑا جس نے اس کی گردن کچل دی یا وہ کچلا گیا ،نبی کریم ﷺ نے فرمایا:اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور دو کپڑوں کا کفن دو،اسے خوشبو نہ لگانا اور نہ اس کا سر چھپانا۔اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے اس حال میں اٹھائے گا کہ تلبیہ کہہ رہا ہوگا،(صحیح بخاری رقم الحدیث:1449)''۔

مزید یہ کہ اگر یہاں سے احرام باندھ کر عمرے یا حج کی نیت سے روانہ ہوئے ہیں اور درمیان میں ایک یا دو دن انہیں جدّہ میں ٹھہرنا پڑے تو یہ سارا وقت بھی عبادت میں شمار ہوگا،احرام میں کوئی وزن تو نہیں اٹھانا،بس صرف احرام کی پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔

سوال: 82

بعض حج گروپ اپنے گروپ کے افراد کو ۷، ذی الحجہ کو منٰی اور ۸، ذی الحجہ کی شب کو عرفات میں قیام کراتے ہیں، بعض احباب کے استفسار پر یہ جواز پیش کرتے ہیں، اس عجلت سے ہم ٹریفک کے اژدھام اور سفر کے دیگر مصائب و مشکلات سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور ہر دو مقام پر جگہ بھی مناسب مل جاتی ہے، کیا از روئے شرع ان کا یہ عمل حج کے اعمال میں نقائص کا سبب تو نہ بنے گا؟۔

جواب:

۷، ذی الحجہ کو بعد نمازِ ظہر امام خطبہ پڑھتا ہے اس خطبے کو سنے، یوم الترویہ (۸، ذی الحجہ) کو آفتاب نکل آئے تو منٰی کو روانہ ہو آفتاب نکلنے سے پہلے گیا تو بھی جائز مگر بعد میں جانا بہتر ہے زوال کے وقت بھی جا سکتا ہے مگر ظہر کی نماز منٰی میں پڑھے، رات منٰی میں ٹھہرے فجر پڑھ کر عرفات روانہ ہو۔

(و خطب الامام اولیٰ خطب الحج الثلاث سابع ذی الحجۃ بعد الزّوال و) بعد(صلاۃ الظهر)و کره قبله (وعلم فيها المناسك فاذا صلّى بمكّة الفجر) يو م التروية (ثامن الشهر الى منى ومكث بها الى فجر عرفة ثمّ)بعد طلوع الشمس (راح الىٰ عرفات)علىٰ طريق ضب(و) عرفات (كلها موقف الّا بطن عرنة) (فبعد الزوال قبل) صلاة (الظهر خطب الامام)۔

ترجمہ: (اور امام خطبہ پڑھے گا ۷، ذی الحجہ کو بعد زوال اور بعد نمازِ ظہر) اس سے پہلے مکروہ ہے (اور مناسک حج سکھے پھر نمازِ فجر مکہ میں پڑھے، ۸ ذی الحجہ کو منٰی روانہ ہو اور فجر تک عرفہ میں ٹھہرے پھر بعد طلوع آفتاب عرفات کو چلے پورا عرفات موقف ہے سوائے بطن عرنہ کے پھر بعد زوال نمازِ ظہر سے پہلے امام خطبہ پڑھے گا، (ردالمحتار علی

الدرالمختار جلد 3 ص: 458 459 , مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''،علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

''آج کل بعض مطوفوں نے یہ نکالی ہے کہ آٹھویں کو منیٰ میں نہیں ٹھہرتے سیدھے عرفات پہنچتے ہیں ان کی نہ مانے اوراس سنت عظیمہ کو ہرگز نہ چھوڑے۔(بہارِ شریعت جلد اول،ص:478مکتبۂ رضویہ آرام باغ،کراچی)''۔ایک تو یہ ہے کہ کاہلی،سہل پسندی اور سنت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے قیامِ منیٰ کو ترک کردیا جائے،یہ سوچ اور طرزِ عمل بلاشبہ اجروثواب میں کمی کا باعث بنے گا اور عبادت حج کے کامل واکمل ہونے میں مانع اور حارج ہوگا،اگرچہ ادائے فرض ہوجائے گا،لیکن عبادت کا اجرِ کامل اور مرتبۂ کمال کسی عبادت کے اندر فرض وواجب کے ساتھ سنن ومستحبات اور آداب کی کامل رعایت اور محرمات اور ممنوعات اور مکروہات سے اجتناب سے نصیب ہوتا ہے، تاہم اگر بندہ اپنی طرف سے پوری جدوجہد کرے مگر ٹریفک میں پھنس جانے یا منیٰ میں جگہ نہ ملنے کے باعث قیام منیٰ نہ کرسکا ہو تو اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال جاننے والا ہے، لیکن چونکہ یہ سبب ترک سنت اللہ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ بندوں کی اپنی طرف سے ہے اسی لئے احتیاط پسند اور تقویٰ شعار علماء یہ کہتے ہیں کہ بندے کو حج کے اختتام پر حسب توفیق دم یا صدقہ دے دینا چاہئے تاکہ دانستہ یا نادانستہ یا مجبوری ومشکلات کے باعث عبادت میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو اس کی تلافی ہوجائے''۔

سوال: 83

ایک کلمہ گو حضور ﷺ کی ذات مقدسہ کے بارے میں شفیع المذنبین کا عقیدہ رکھتے ہوئے،حضور ﷺ کی بارگاہ میں درخواست شفاعت پیش کرتا ہے،زید یہ کہتا ہے کہ اگر درخواست شفاعت پیش کی اوراس پر بھروسہ کیا تو باجماع امت کافر ہوگیا،نیز

حضورﷺ سے کس طرح کا سوال کرنا شرک ہے؟

جواب:

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ماذونین کی شفاعت کا قرآن مجید میں خود ذکر فرمایا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام ورُسل عظام علیھم الصلاۃ والتسلیم ،اولیاء کرام، مقرّبین ومکرّمین ومحبوبین رضی اللہ عنہم اجمعین حتیٰ کہ ازروئے حدیث حافظ وعاملِ قرآن اور ناتمام پیدا شدہ بچے کی شفاعت بھی ازروئے حدیث ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

من ذالذی یشفع عندہٗ الا باذنہ۔

ترجمہ:''کس کی مجال ہے کہ اس کی بارگاہ میں شفاعت کرے، مگر جسے وہ خود اذنِ شفاعت دے دے، (البقرہ:255)''۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور اکرمﷺ ماذون الشفاعت ہیں اور احادیثِ مشہورہ سے آپ کی شفاعتِ کبریٰ ثابت ہے، اسی طرح سے بچے کی نمازِ جنازہ میں اسی ترتیب کے بعد جو بھی دعا پڑھی جاتی ہے، اس میں ہم سب پڑھتے ہیں:

اللھم اجعلہ لنا شافعا و مشفعا۔

ترجمہ:''اے اللہ اس بچے کو ہمارے لئے شفاعت کرنے والا اور مقبولِ شفاعت بنادے''۔

عن جابر؛ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: "ان شفاعتی یوم القیامۃ لاھل الکبائر من امتی۔

ترجمہ:''حضرت جابر فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: میری شفاعت قیامت

کے دن میری امت کے گناہِ کبیرہ والوں کے لئے ہے،(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:4310)''۔

اسی طرح حدیث پاک میں ناتمام بچوں کے بارے میں آیا ہے کہ جب ان کے ماں باپ کو جہنمی قرار دیا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے عطا کردہ اذن سے بطورِ خاص احتجاج کرے گا،تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: أیّها السقط المراغم ربّه! أدخل أبویك الجنّة۔

ترجمہ:''اے اپنے رب سے جھگڑنے والے ناتمام بچے،جا اپنے ماں باپ کو جنت میں لے جا،(سنن ابنِ ماجہ رقم الحدیث:1608 مطبوعہ دارالفکر بیروت)''۔

حافظِ قرآن کے بارے میں حدیث ہے:

عن علی قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: من قرأ القرآن واستظهره فاحلّ حلاله وحرّم حرامه ادخله اللّٰہ به الجنّة وشفّعه فی عشرة من اهل بیته کلهم قد وجبت له النار۔

ترجمہ:حضرت علی سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:جس نے قرآن پڑھا اس کو یاد(حفظ) کیا،پس حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا،تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کی شفاعت سے اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد جن پر جہنم لازم ہوگئی ہو جنت میں داخل فرمائے گا،(سنن ترمذی رقم الحدیث:2905)''۔

عن عثمان ابن عفان قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ:''یشفع یوم القیامة ثلاثة: الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء''۔

ترجمہ:''حضرت عثمان ابن عفان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی، انبیاء پھر علماء پھر شہید لوگ، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4313"۔

سوال: 84

زید یہ کہتا ہے کہ زیارت روضۃ النبی ﷺ مشروع نہیں، جن احادیث سے دلائل پیش کئے جاتے ہیں، وہ ضعیف یا موضوع ہیں ونیز زائرین کے لئے مسجد نبوی ﷺ کی زیارت مسنون ہے، خواہ قبل از حج ہو یا بعد از حج؟۔

جواب:

زیارتِ روضۃ النبی ﷺ کے ثبوت میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ پیشِ خدمت ہیں:

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من حج فزار قبری بعد وفاتی کانما زارنی فی حیاتی ۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہے، (سنن دارقطنی جلد 2 ص: 378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)"۔

اس حدیث کو امام بیہقی نے (السنن الکبریٰ جلد 2 ص: 246 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)، حافظ الہیثمی نے (مجمع الزوائد جلد 4 ص: 2 دار الکتب العربیہ بیروت)، علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص: 135 مؤسسۃ الرسالۃ بیروت)، اور حافظ دیلمی (فردوس الاخبار جلد 4 ص: 72 دار الکتب العربیہ بیروت) نے بھی ذکر کیا ہے۔

عن حاطب قال: قال رسول اللہ ﷺ :من زار نی بعد موتی،فکانما زار نی فی حیاتی و من مات باحد الحرمین بعث من الامنین یوم القیامۃ۔

ترجمہ:''حاطب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میرے وصال کے بعد میری زیارت کی اس نے گویا کہ میری زندگی میں میری زیارت کی اور جو شخص حرمین میں سے کسی جگہ فوت ہوا، وہ قیامت کے دن امن والوں میں سے اٹھے گا، (سنن دار قطنی جلد 2 ص: 378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)''۔

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص:136 مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ من زار قبری و جبت لہ شفاعتی۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی، (سنن دار قطنی جلد 2 ص: 378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)''۔

حافظ الہیثمی نے (کشف الاستار عن زوائد البزار ج 2 ص: 57، مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ، بیروت) اس کو امام بزار کے حوالے سے ذکر کیا ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم من حج البیت ولم یزرنی فقد جفانی۔

ترجمہ:''حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت کے لئے نہیں آیا، اس نے مجھ سے بے وفائی کی، (فردوس الاخبار ج: 4 ص: 1 7 مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)''۔

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص: 136 مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے۔

نوٹ: مندرجہ بالا حوالہ جات شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 3 صفحات 766 سے نقل کیے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ان روایات کے ضعف کا قول تو کیا گیا ہے، لیکن شیخ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین کے سوا کسی نے انہیں موضوع قرار نہیں دیا، حج وعمرے کے موقع پر زیارت روضۂ رسول اکرم ﷺ کو کسی نے واجب نہیں قرار دیا، بلکہ یہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں مسنون و مستحب امر ہے، اور چونکہ بعض روایات میں ترکِ زیارت پر وعید بھی آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے ساتھ جفا قرار دیا ہے تو اس کا سنت ہونا زیادہ موکد قریب بہ واجب ہو جاتا ہے۔

کسی حدیث کو اگر ماہرینِ اسماء الرجال نے ضعیف قرار دیا ہو تو یہ ایک علمی اور فنی بحث ہے، اسے حدیث پر ترکِ عمل کا سہارا نہیں بنانا چاہئے، اور ویسے بھی علماء کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ "فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں"، اور کسی ایک موضوع پر متعدد ضعیف احادیث ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتی ہیں، اس کی ایک عملی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص آپ کو آکر ایک خبر سناتا ہے، آپ اسے زیادہ ثقہ اور معتمد نہیں سمجھتے، لیکن پھر مختلف جہات سے اس جیسے کئی افراد اپنے مشاہدے کی بناء پر وہی خبر سناتے ہیں تو آپ یقین کرلیں گے کہ یہ واقعہ ضرور ہوا ہوگا۔ اور ویسے بھی یہ بڑی جفا، شقاوت اور احسان فراموشی کی بات ہوگی کہ جس ذاتِ والا صفات، خاتم النبیّن رحمۃ للعلمین ﷺ کے وسیلے سے بیت اللہ کا عرفان ملا، عبادات حج وعمرہ نصیب

ہوئیں، دولتِ ایمان ملی، نعمتِ قرآن ملی، ان کے قریب جا کر، سلام عرض کئے اور زیارت وحاضری کا شرف حاصل کئے بغیر بندہ واپس آجائے۔

ہم لوگ تو ویسے ہی گنہگار ہیں، عصیاں شعار ہیں، اپنی بداعمالیوں کے سبب خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور عبادت حج کا ایک مقصدِ جلیل تعمیلِ حکمِ باری تعالیٰ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہمارے گناہوں کی عفوومغفرت کی کوئی صورت نکل آئے اور اس کی صورت اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمائی ہے:

ولو انھم اذظلموآ انفسھم جآءُ وك فاستغفروا اللّٰہ واستغفرلھم الرسول لوجدوا اللّٰہ توابا رحیماً o

ترجمہ:اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے،تو یہ آپ کے پاس آجاتے ،پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرتے،تو یہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم فرمانے والا پاتے ،(سورۃ النسآء: 64)"۔

بیشتر مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کی رو سے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ ظاہری میں گنہگارانِ امت کے لئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعاءِ مغفرت کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا ان کے لئے استغفار کرنا وسیلۂ مغفرت تھا، اسی طرح آپ کے وصال فرمانے کے بعد آپ کے روضۂ اقدس پر حاضری بھی وسیلۂ مغفرت ہے، چنانچہ حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی 774ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عاصیوں اور گنہگاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب ان سے خطا اور گناہ ہوجائے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آکر استغفار کریں، پھر رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کریں کہ آپ بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کریں اور جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ

ان کی توبہ قبول فرمائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت مہربان پائیں گے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے ان میں الشیخ ابومنصور الصباغ بھی ہیں، انہوں نے اپنی کتاب الشامل میں عتبی کی یہ مشہور حکایت لکھی ہے کہ میں (رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد) نبی ﷺ کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی نے آ کر کہا السلام علیک یا رسول اللہ، میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد سنا ہے: ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاؤك الآيه اور میں آپ کے پاس آ گیا ہوں اور اپنے گناہ پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ سے شفاعت طلب کرنے والا ہوں، پھر اس نے عربی کے دو شعر پڑھے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

اے وہ جو زمین کے مدفونین میں سب سے بہتر ہیں

جن کی خوشبو سے زمین اور ٹیلے خوشبودار ہو گئے

میری جان اس قبر پر فدا ہو جس میں آپ ساکن ہیں اس میں عفو ہے اس میں سخاوت ہے اور لطف و کرم ہے

پھر وہ اعرابی چلا گیا، عتبی بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر نیند غالب آ گئی، میں نے خواب میں نبی ﷺ کی زیارت کی اور آپ نے فرمایا اے عتبی! اس اعرابی کے پاس جا کر اس کو خوشخبری دو کہ اللہ نے اس کی مغفرت کر دی ہے، (تفسیر ابن کثیر ج 2 ص: 329-328، الجامع لاحکام القرآن ج 5 ص: 265، البحر المحیط ج 3 ص: 694، مدارک التنزیل علی ہامش الخازن ج 1 ص: 399)۔

مفتی محمد شفیع متوفی 1396ھ لکھتے ہیں:

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ

سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعاءِ مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیاوی حیات کے زمانہ میں ہوسکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے، اس کے بعد مفتی صاحب نے بھی عتبی کی مذکورالصدر حکایت بیان کی ہے، (معارف القرآن ج2 ص:460-459، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی)۔

معروف دیوبندی عالم شیخ محمد سرفراز گکھڑوی لکھتے ہیں:

عتبی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے، اسی طرح دیگر متعدد علماء کرام نے قدیماً وحدیثاً اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ مواہب میں بہ سند امام ابو منصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی رحمہم اللہ تعالیٰ نے محمد بن حرب ہلالی سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل، اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد ہے: ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جآءُ وك فاستغفروا الله واستغفرلهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيماً o اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں پھر دو شعر پڑھے۔ اور اس محمد بن حرب کی وفات 228ھ میں ہوئی ہے، غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں، پس حجت ہو گیا (نشر الطیب ص 254) اور حضرت مولانا نانوتوی یہ آیت کریمہ لکھ کر فرماتے ہیں: ''کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں، آپ

کے ہم عصر ہوں یا بعد کے امتی ہوں، اور تخصیص ہوتو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام امت کے لئے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں (آب حیات ص:40) اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں: پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے، (اعلاء السنن ج10 ص:330)۔

ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت ومغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے، بلکہ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے (شفاء السقام ص:128) اور خیر القرون میں یہ کاروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے، (تسکین الصدور ص:365-366، ملخصاً، مطبوعہ ادارہ نصرت العلوم گوجرانوالہ)۔

نوٹ: یہ تمام حوالہ جات تفسیر تبیان القرآن مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 2 صفحات 714 تا 716 سے نقل کیے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ باری تعالی سے طلب مغفرت کے لئے اور رسول اللہ ﷺ سے طلبِ شفاعت کے لئے روضۂ رسول اور ختم المرسلین کی بارگاہِ اقدس میں حاضری ازسلف تا خلف متفق علیہ امر ہے اور رسول اللہ ﷺ اپنی حیاتِ ظاہری کی طرح اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی ہمارے احوال واعمال کا مشاہدہ فرماتے ہیں، اذنِ باری تعالیٰ سے ہماری نصرت اور دستگیری فرماتے ہیں اور بارگاہِ رب العلی میں ہمارے لئے عفو ومغفرت اور شفاعت کا وسیلۂ کاملہ قطعیہ ہیں۔

عمرے کی ادائیگی کے لئے محرم

سوال: 85

کوئی شخص اپنی ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ساتھ حج یا عمرے کی ادیگی کے لئے جا سکتا ہے؟، (حافظ سلیم محمود، R-772 سیکٹر 7-D/3 نارتھ کراچی)۔

جواب:

خواتین کیلئے حج وعمرے کی وہی شرائط ہیں، جو مردوں کیلئے، ہاں! ایک شرط زائد ہے کہ اسے سفرِ حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔ محرم سے مراد نسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہرت کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہو، جیسے باپ، چچا، ماموں، بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر اور دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔

امام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

واما الذی یخص النساء فشرطان: احدھما: ان یکون معھا زوجھا او محرم لھا فان لم یوجد احدھما لا یجب علیھا الحج۔

ترجمہ: اور عورتوں کے لئے دو شرطیں خاص ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا شوہر یا اس کا محرم اسکے ساتھ ہو، پس اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو نہ پائے تو اس پر حج واجب نہیں، دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ثم صفة المحرم أن یکون ممن لا یجوز له نکاحھا علی التابید اما بالقرابة أو الرضاع أو الصھریة لأن الحرمة المؤبدة تزیل التھمة فی الخلوة، ولھذا قالوا: ان المحرم اذا لم یکن مأموناً علیه لم یجز أن تسافر معه۔

ترجمہ: ''محرم وہ شخص ہے جس سے ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہو، خواہ حرمتِ نکاح رشتۂ قرابت کی وجہ سے ہو یا رشتہء رضاعت کی وجہ سے ہو یا رشتہء سسرالی کی وجہ سے (مثلاً داماد)، کیونکہ دائمی حرمت سے خلوت میں تہمت کا اندیشہ زائل ہو جاتا ہے، اسی لئے فقہاء کرام نے کہا ہے کہ اگر محرم بھی قابلِ اعتماد نہ ہو (یعنی اس سے آبرو محفوظ نہ ہو) تو اس کے ساتھ بھی عورت کا سفر پر جانا جائز نہیں ہے، (بدائع الصنائع، جز ثانی، صفحہ 87، 188 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات ہند)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(القسم الثانی المحرمات بالصهرية) وهی اربع فرق (الاولیٰ) امهات الزوجات وجداتهن من قبل الاب والام وان علون ۔

ترجمہ: ''(دوسری قسم سسرالی رشتے سے محرمات کے بیان میں) اور وہ چار قسموں پر ہیں (ان میں سے ایک) بیوی یا بیویوں کی مائیں اور دادیاں، نانیاں، (خواہ وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے) اگرچہ اوپر تک ہوں، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص 274 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

لہٰذا داماد ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ہمراہ حج یا عمرے کے سفر پر جاسکتا ہے، کیونکہ وہ سسرالی رشتے کی بناء پر اس کا محرم ہے، واللہ اعلم بالصواب ۔

حج سے تمام گناہوں کا معاف ہوجانا

سوال : 86

آپ سے ایک مسئلہ یہ میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہوجاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے

لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضاء وغیرہ بھی ادا کر لیتی ہوں، (عذرا جہاں، کورنگی)۔

جواب:

آپ نے جو لکھا ہے کہ "حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں"، ادائیگیٔ حج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے، فرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا ادائیگی کا عزم، زکوٰۃ کی ادائیگی، حق العبد یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے، تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔ حدیث مبارک میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے حج کیا اور فحش کلام نہ کیا اور فسق نہ کیا تو گناہوں سے ایسا پاک ہو کر لوٹا جیسے اس دن پاک تھا جس دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، (صحیح بخاری و مسلم)۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمرہ سے عمرہ تک ان گناہوں کا کفارہ ہے جو درمیان میں ہوئے اور حج مبرور کا ثواب جنت ہی ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بندے سے جو صغیرہ گناہ نادانستہ طور پر سرزد ہو جاتے ہیں اعمال صالحہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دیتا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں (ایک نماز سے دوسری نماز تک) اور جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک کفارہ ہے ان گناہوں کے لئے جو اس درمیان ہوئے جب کہ وہ گناہِ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو، (صحیح مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بتاؤ تو کسی

دروازے پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ بار غسل کرے، کیا اس کے بعد بدن پر میل رہ جائے گا عرض کی نہیں اس کے بدن پر کوئی میل باقی نہیں رہے گا فرمایا: یہی مثال پانچو ں نمازوں کی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سبب خطاؤں کومحو (مٹا) فرمادیتا ہے، (صحیح بخاری ومسلم)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: ایک صاحب آئے عرض کی یارسول اللہ ﷺ مجھ پر حد قائم فرمایئے آپ نے اس سے کوئی سوال نہ فرمایا اور نماز کا وقت آگیا پھر اس شخص نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ شخص پھر کھڑا ہوگیا اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ میں نے ایسا فعل کیا ہے کہ جس کے باعث مجھ پر حد واجب ہوگئی ہے تو مجھ پر حد قائم فرمایئے جو کتاب اللہ میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی اس عرض کی جی ہاں! آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے تیرے گناہ کو جو تیرے نزدیک موجب حد تھا معاف فرمادیا، (بخاری ومسلم)۔

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے مروی ہے کہ ایک صاحب سے ایک گناہ صادر ہوا حاضر ہوکر عرض کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ترجمہ: ''نماز قائم کرو دن کے دونوں کنا روں اور رات کے کچھ حصے میں بیشک نیکیاں گناہوں کو دور کرتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے، (سورۃ ہود: 114)''۔

انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ خاص میرے لئے ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری تمام امت کے لئے، ایک روایت میں یہ بھی آیا آپ نے فرمایا: کہ میر ی امت سے جو بھی نیک عمل کرے، (صحیح بخاری ومسلم)۔

ان احادیث مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عبادات کی برکت سے صغیرہ اور غیر

ارادی گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے کسی عذر شرعی کی بناء پر فرض ترک ہو گیا ہے تو وہ معذور ہے عذر اٹھ جانے کے بعد اسے ادا کرے۔ اگر بلا عذر شرعی محض کوتاہی یا سرکشی کی بناء پر مثلاً فرض نماز وقت پر نہیں پڑھی، یا رمضان میں روزہ بلا عذر شرعی ترک کر دیا تو یہ عمل بجائے خود فسق اور کبیرہ گناہ ہے، ان قضاء شدہ نمازوں اور روزوں کی قضاء کرے اور بلا عذر قضاء کا جو گناہ کیا ہے، اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے اور توبہ کرے، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتاب النکاح﴾

حرمتِ رضاعت

سوال: 87

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین علماءِ کرام قرآن وسنت کی روشنی میں ازراہِ کرم جواب سے جلد از جلد مرحمت فرمائیں، کہ میرے ایک دوست کے بھائی محمد صالح شاہ اوراس کی کزن چچا کی بیٹی فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی ان کے والدین طے کرنا چاہتے ہیں، مگر دونوں کے والدین یہ جانتے ہیں کہ محمد صالح شاہ نے اپنی چچی فاطمہ کی والدہ کا شیرخوارگی کی عمر میں دودھ پیا تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہے کہ ان دونوں کا نکاح نہیں ہوسکتا جو کہ میں نے اپنے دوست کو بتایا تھا مگر اس نے کہا کہ کوئی شرعی فتویٰ ثبوت کے طور پر ہو، جو وہ والدین اور اپنے چچا کو دکھائے تا کہ کسی بھی غلطی اور گناہ سے بچا جا سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا محمد صالح شاہ کے کسی بھی بھائی سے نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟، (محمد عباس ہاشمی اختر القادری رضوی، ڈاکخانہ ٹنڈو مٹھا خان تحصیل وضلع سانگھڑ)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وامھتکم الّتی ارضعنکم واخوٰتکم من الرضاعۃ۔

ترجمہ: ''اور تمہاری مائیں، جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں (تم پر حرام کی گئیں)، (النساء، آیت 23)''۔

ا۔عن عائشۃ قالت : قال لی رسول اللہ ﷺ:"یحرم من الرضاعۃ ما یحرم

من الولادة"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3505، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکۃ المکرّمۃ)''۔

۲۔عن ابن عباس قال: قیل للنبی ﷺ: الا تتزوّج ابنة حمزة؟، قال: "انها ابنة اخی من الرضاعة۔"

ترجمہ: ''ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟، ارشاد فرمایا: ''وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5100، مکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ فتاوی عالمگیری میں لکھتے ہیں:

"یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع واصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعاً حتیٰ ان المرضعة لو ولدت من هذاالرجل او غیرہ قبل هذاالارضاع اوبعدہ اوارضعت رضیعاًاو ولد لهذاالرجل من غیرهذہ المرأة قبل هذاالارضاع اوبعدہ اوْ ارضعت امراة من لبنه رضیعا فالکل اخوة الرضیع واخواته واولادهم اولاداخوته واخواته واخوالرجل عمه واخته عمته واخوالمرضعة خاله واختها خالته وکذا فی الجد والجدة

ترجمہ: ''دودھ پینے والے پر اس کے رضائی ماں باپ اور ان کے تمام اصول اور فروع حرام ہوجاتے ہیں، خواہ وہ نسباً اصول وفروع ہوں یا رضاعاً حتی کہ اگر دودھ پلانے والی کے ہاں اس کے موجودہ شوہر سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد ہو، خواہ دودھ پلانے سے پہلے ہوں یا دودھ پلانے کے بعد ہو یا وہ کسی اور بچے کو دودھ پلائے

یا دودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو، خواہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے یا بعد ہو تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اور ان کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں، دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اور اس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اور دودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے، اسی طرح دادا، دادی اور نانا، نانی کے رشتے ہیں"، (فتاویٰ عالمگیری ،جلداول،ص:343 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

رضاعت (دودھ شریک) رشتہ دوطرفہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ جانبِ واحد سے متعدی ہوتا ہے، یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے، اس پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد حرام ہے، جبکہ رضاعی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے، اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہے (بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو)۔لہٰذا فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی محمد صالح شاہ کے دوسرے بھائیوں سے ہوسکتی ہے، رضاعت کا رشتہ صرف محمد صالح کے ساتھ قائم ہوا ہے، دوسرے بھائیوں کے ساتھ نہیں۔

ثبوتِ رضاعت

سوال: 88

میری بیٹی آمنہ کا رشتہ میرے چچا زاد بھائی کے بیٹے عامر شہزاد سے ہو رہا تھا، عامر شہزاد نے اپنی خالہ مریداں کا دودھ پیا ہے، جب میری بیٹی آمنہ چھ ماہ کی تھی تو میں اسے گاؤں لے گئی، وہاں ایک روز میں گھر میں کام کاج میں مصروف تھی کہ آمنہ رونے لگی مریداں نے اسے دودھ دینے کی غرض سے گود میں ڈال لیا اور کپڑا اٹھا ہی رہی تھی کہ میں وہاں آگئی اور اس پر غصہ کرنے لگی کہ میرے شوہر کی اجازت نہیں

ہے،اس نے آمنہ کو میری گود میں دے دیا، جب میں نے اسے گود میں لیا تو خدا گواہ ہے کہ اس کا منہ سوکھا ہوا تھا،اس وقت آمنہ کی عمر ایک سال تھی اور مریداں کی بیٹی کی ساڑھے تین سال تھی ،پھر تین سال قبل جب میں نے مریداں سے پوچھا کہ کیا تم نے میری بیٹی آمنہ کو دودھ پلایا ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے ۔اب جب رشتے کی بات چلی تو وہ کہتی ہے کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے اور اس بات پر کوئی گواہ بھی نہیں ہے ،ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ کیا عامر شہزاد اور آمنہ اقبال کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟ ،(غلام سکینہ،فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

رضاعت کا ثبوت دودھ پلانے والی کے اقرار سے ہوگا یا گواہانِ شرعیہ سے ہوگا۔عالمگیری میں ہے:

الرضاع یظھر باحد أمرین أحدھما الاقرار والثانی البینة کذا فی البدائع ۔ ولا یقبل فی الرضاع الا شھادة رجلین اورجل وامراتین عدول کذا فی المحیط ۔

ترجمہ:" رضاعت دوطریقوں سے ثابت ہوگی ،ایک یہ ہے کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی)خود اقرار کرے، دوسرا یہ کہ اس پر شرعی گواہ ہوں،اورشہادت قبول نہیں کی جائے گی مگر یہ کہ دو عادل مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عادل عورتیں ہوں "محیط" میں اس طرح سے ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 347 ،مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

صورت مسئولہ میں شہادت شرعیہ موجودنہیں ہے ،مدعیہ کے بیان میں اضطراب پایا جاتا ہے،جس سے صورت حال مشکوک ہوگئی ہے،فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لا تثبت الحرمة بالشك۔ ترجمہ: ''شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 344 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں عامر شہزاد اور آمنہ کا آپس میں نکاح جائز ہے، فقط واللہ اعلم الصواب۔

خالہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بھانجی سے نکاح حرام ہے

سوال: 89

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ فاطمہ کی خالہ زید کے نکاح میں ہے۔کیا فاطمہ بھی زید کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے؟اگر کر سکتی ہے تو کیسے اور نہیں کر سکتی تو کیسے، مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلاً وضاحت فرمائیں، (محمد جان نعیمی ہزاروی، ضلع وتحصیل مانسہرہ)۔

جواب:

محرماتِ نکاح کی نو اقسام میں سے تیسری قسم ''جمع بین المحارم'' ہے، یعنی وہ عورتیں کہ ان میں اگر ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری اس کے لئے حرام ہو، مثلاً ''دو بہنیں'' کہ ایک کو مرد فرض کریں تو بھائی بہن کا رشتہ ہوا یا ''پھوپھی بھتیجی'' کہ پھوپھی کو مرد فرض کریں تو ''چچا اور بھتیجی'' کا رشتہ ہوا اور بھتیجی کو مرد فرض کریں، تو ''پھوپھی اور بھتیجے'' کا رشتہ یا ''خالہ بھانجی'' کہ خالہ کو مرد فرض کریں تو ''ماموں اور بھانجی'' کا رشتہ ہوا اور بھانجی کو مرد فرض کریں تو بھانجے اور خالہ کا رشتہ ہوا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والاصل ان كل امرأتين لو صورنا احداهما من أى جانب ذكرا لم يجز النكاح بينهما برضاع أو نسب لم يجز الجمع بينهما هكذا في المحيط۔

ترجمہ: ''اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان کا آپس میں نکاح جائز نہ ہو، نسب کے رشتے سے ہی خاص نہیں بلکہ رضاعی رشتے میں بھی دونوں کا جمع کرنا حرام ہے، ''محیط'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اللہ جل شانہٗ نے محرمات نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشاد فرمایا: وان تجمعوا بین الاختین۔ (ترجمہ) ''اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کا جمع کرنا بھی حرام ہے، (النساء)''۔ آیت میں اگرچہ صراحت کے ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن مفسرین کرام اور فقہاءِ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ ایسی ہر دو عورتوں کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان دونوں میں حرمت کا رشتہ قائم ہو جائے۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه: انّ رسول الله ﷺ قال: "لایُجمع بین المرأة وعمّتها، ولا بین المرأة وخالتها"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' کو اور ''بھانجی اور اس کی خالہ'' کو نکاح میں ایک ساتھ جمع نہ کیا جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5109)''۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه: انّ رسول الله ﷺ نهیٰ عن اربع نسوة ان یُجمع بینهن "المرأة وعمّتها" "والمرأة وخالتها"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے، ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' اور'' بھانجی اور اس کی خالہ''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3333)''۔

عن الزهری قال : حدثنی قبیصة بن ذؤیب :أنّه سمع أبا هریرة یقول : نھیٰ النبی ﷺ أن تنکح المرأة علی عمّتھا ، والمرأة علی خالتھا ۔ فنری خالة أبیھا بتلك المنزلة ۔

ترجمہ:''زہری فرماتے ہیں کہ قبیصہ بن ذویب نے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے ابو ہریرہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ''عورت اور اس کی پھوپھی'' کو ایک نکاح میں (جمع) کرنے سے منع فرمایا، اور اسی طرح ''عورت پر اس کی خالہ'' کو (جمع کرنے سے منع فرمایا) ۔ (زہری کہتے ہیں) ہمارا خیال یہ ہے بیوی کے باپ کی خالہ کا بھی یہی حکم ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5110)'' ۔

عن ابی ھریرة، عن رسول اللّٰہ ﷺ :"أنّہ نھیٰ أن تنکح المرأةعلی عمّتھا،أ وخالتھا "۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ پھوپھی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھتیجی سے نکاح کیا جائے یا بھتیجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی پھوپھی کے ساتھ یا خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھانجی کے ساتھ یا بھانجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی خالہ سے نکاح کیا جائے، (سنن نسائی، رقم الحدیث:3290)'' ۔

علامہ نظام الدین مزید لکھتے ہیں:فان تزوج الاختین فی عقدة واحدة یفرق بینھما وبینہ فان کان قبل الدخول فلا شئی لھما وان کان بعد الدخول یجب لکل واحدة منھما الاقل من مھر مثلھاو من المُسمّٰی کذا فی المضمرات ۔وان تزوجھما فی عقدتین فنکاح الاخیرة فاسد ویجب علیہ أن یفارقھا ولو علم القاضی بذلك یفرق بینھما فان فارقھا قبل الدخول

لایثبت شئی من الاحکام وان فارقھا بعد الدخول فلھا المھر ویجب الاقل من المسمی ومن مھر المثل وعلیھا العِدّۃُ ویثبت النسب ویعتزل عن امرأتہ حتی تنقضی عدۃ أختھا کذا فی محیط السرخسی ۔

ترجمہ: ’’اگر دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیا تو کسی سے بھی نکاح نہیں ہوا ،فوراً دونوں کے درمیان علیحدگی کردی جائے گی ،اگر ازدواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے ہی علیحدگی کی گئی تو کوئی مہر واجب نہ ہوا اور اگر اس کے بعد علیحدگی ہوئی ہوتو ان میں سے ہر ایک کو (اگر دونوں سے دخول ہوا ہوتو) ’’مہرِ مثل‘‘ اور ’’مقرر مہر‘‘ میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، ’’مضمرات‘‘ میں اسی طرح ہے ۔اور اگر دونوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہو تو جس سے بعد میں نکاح کیا، وہ فاسد ہوگا اور شوہر پر واجب ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کرلے، (اگر قاضی کو علم ہوجائے)تو وہ تفریق کردے پس اگر مباشرت سے پہلے تفریق کی تو اس کے لئے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، اور اگر مباشرت کے بعد تفریق ہوئی ہو تو اس کے لئے مہر مثل یا مقرر مہر میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، اور اس پر عدت لازم ہوگی، (بچہ پیدا ہوتو) ثابت النسب ہوگا، اور اپنی بیوی سے دور رہے گا جب تک اس کی بہن کی عدّت پوری نہ ہوجائے ، ’’محیط سرخسی ‘‘میں اسی طرح ہے ، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 277، 278، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)‘‘۔

صورتِ مذکورہ میں فاطمہ اور اس کی خالہ زید کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں ،اور یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قائم کردہ حدیں ہیں جن کی پابندی ازحد ضروری ہے ۔

سوال: 90

محترم مفتی صاحب !، یہ سوال میری چھوٹی ہمشیرہ کا ہے، جو میں ان کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ اپنی علمی قابلیت کو بروئے کارلاتے ہوئے شریعت محمدی کی روشنی میں اس کا جواب مرحمت فرمائیں گے۔میری شادی میرے تایازادکزن سے فروری 2002 میں آج سے تقریباً چار سال پہلے ہوئی، سن 1994 میں ہماری منگنی ہوئی شادی سے تقریباً دوسال پہلے کی بات ہے، میں اورمیرابڑا بھائی اپنے تایا کے گھر میں رہ رہے تھے(پڑھائی کے سلسلے میں کیونکہ والدین سعودیہ میں رہتے تھے)میرے تایا مجھ سےاورمیرے بڑے بھائی سے کافی پیار کرتے تھے،اکثر مجھ سے اپنی ٹانگیں دبواتے تھے،ایک دن وہ اخبار پڑھ رہے تھے،اورانہوں نے کہا کہ میری ٹانگیں دباؤ، جب میں ان کی ٹانگیں دبارہی تھی، توانہوں نے پوچھاتمہارا پیٹ خراب ہےتواپنی زبان دکھاؤتھوڑی دیر کے بعدانہوں نے کہا کہ اپنی زبان باہر نکالواورہاتھ لگا کرکہا کہ تمہاری زبان تو کافی نرم ہے،اورپھر انہوں نے زبان چوس لی، یہ عمل انہوں نے دوبارہ کیا،اللہ گواہ ہے کہ اس میں لکھاسب سچ ہے،اس بات سے میں بہت روئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد گھرمیں کافی جھگڑاہوا،تایااس بات سے سرے سے ہی منکر ہوگئے، خاندان کےلوگ میری بات کومانتے بھی تھے،لیکن تایا کے سامنے کہنے کی جرات نہ کرسکے، نہ ہی کسی نے اس بابت شریعت سے رجوع کرنے کے بات کی یا کوشش کی، تایا کیونکہ خاندان میں سب سے بڑے ہیں،اوران کاخاندان میں کافی رعب ودبدبہ ہے، جس کی وجہ سے کوئی ان سے بحث نہیں کرتا، میرے باربار منع کرنے کے

باوجود خاندان کے بڑوں نے میری شادی تایا کے بیٹے کے ساتھ کردی، منگنی کے تقریباً 8 سال گزرنے کے بعد میرے دل میں تایازاد کے لئے پسندیدگی کے جذبات بھی تھے۔ ہماری شادی ہوئی، اس واقعہ کے بعد جو کہ بڑی مشکل سے ہوئی، شادی کے بعد اس گھر میں، مجھ پر ہروقت ایک خوف طاری رہتا تھا، شادی سے پہلے کا واقعہ میرے دماغ پر ہروقت سوار رہتا ہے اور مجھے انتہائی خوف محسوس ہوتا ہے، مختلف جھگڑے ہوئے۔

تایا کا بیان ہے کہ: "بلکہ وہ لڑکی آئس کریم کھارہی تھی، میں نے اس سے مانگی تو اس نے کہا کہ ختم ہوگئی ہے اور صرف میرے منہ میں باقی ہے، جو کہ میں نے (یعنی تایا نے) اپنے زبان کے ساتھ اٹھالی، اس وقت اس کی زبان بھی میرے منہ میں آگئی تھی، اور کہ اس میں کسی قسم کی شہوت نہ تھی اور میں اس پر قرآن اٹھانے کو تیار ہوں"۔

اب اصل صورتحال (جو کہ میں نے سوال میں بیان کی ہے) کی روشنی میں، میں حلفاً کہتی ہوں کہ تایا کا یہ بیان مکمل طور پر جھوٹ ہے۔

میں اور میرے گھر والے اس مسئلہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، اور ہم نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تحریری فتوی نہیں لیا، اس لئے جناب سے گذارش ہے کہ شریعت کی روشنی میں تفصیل سے بتائیں کہ میری ہمشیرہ کے لئے کیا حکم ہے؟ تحریر فرمائیں، (حماد آصف، رجسٹرار آفس، نیشنل الیکٹرک پاور ریگولیٹری اتھارٹی، سیکٹر G-5/2، اسلام آباد)۔

جواب:

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا

ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں،تو عورت کے اصول وفروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔اور مرد کے اصول وفروع عورت پر حرام ہو جائیں گے۔اس کو حرمتِ مصاہرۃ کہتے ہیں۔

اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:و کما تثبت ھذہ الحرمۃ بالوطء تثبت بالمس والتقبیل والنظرالی الفرج بشھوۃ کذافی الذخیرہ۔۔۔

ترجمہ:''حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے،اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے،بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے،جیسا کہ''ذخیرہ''میں ہے،آگے چل کر لکھتے ہیں:

و کذا لوعضھا بشھوۃ ھکذا فی الخلاصہ۔

ترجمہ:''اوراسی طرح اگر شہوت کے ساتھ دانت سے کاٹا ہوتو اس سے بھی حرمت ثابت ہو جائے گی،''خلاصہ''میں بھی اسی طرح ہے۔(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1 ص: 275,274-،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قال فی "الذخیرۃ" : واذا قبلھا اولمسھا اونظرالی فرجھا ثم قال: لم ی کن عن شھوۃ، ذکر الصدر الشھید انہ فی القبلۃ یفتی بالحرمۃ مالم یتبین انہ بلا شھوۃ ، وفی المس والنظر لا، الا ان تبین انہ بشھوۃ لان الاصل فی التقبیل الشھوۃ ، بخلاف المس والنظر،.................................ومنھم من فصل فی القبلۃ فقال: ان کانت علی الفم یفتی بالحرمۃ ، ولا یصدق انہ بلاشھوۃ، وان کانت علی الرأس اوالذقن اوالخد فلا الا اذا تبین انہ بشھوۃ و کان الامام ظھیر الدین یفتی بالحرمۃ فی القبلۃ مطلقا، ویقول: لایصدق فی انہ لم یکن بشھوۃ۔

ترجمہ: ""ذخیرہ" میں فرمایا: جب (کسی عورت کو) بوسہ دیا یا چھوا یا اس کی شرمگاہ (فرج) کی طرف نظر کی، پھر کہتا ہے کہ یہ عمل شہوت سے نہیں تھا، صدر الشہید ذکر کرتے ہیں کہ بوسہ لینے میں حرمت کا فتویٰ دیا جائے گا، جب تک کہ یہ بالکل واضح نہ ہو کہ یہ بوسہ لینا شہوت کے بغیر تھا اور چھونے اور (شرمگاہ کی طرف) نظر کرنے پر حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا، سوائے اس صورت کے کہ (ان دونوں امور کا) شہوت کے ساتھ ہونا بالکل واضح ہو، کیونکہ بوسہ لینے میں اصل شہوت ہے اور دیکھنے میں ایسا نہیں ہے (یعنی اصل شہوت نہیں ہے)، بعض فقہاء نے بوسہ لینے میں بھی تفصیل بیان کی ہے اور فرمایا ہے کہ: اگر بوسہ منہ پر لیا ہو تو فتویٰ حرمتِ مصاہرت پر ہے اور اس کا شہوت کے بغیر ہونا سچا نہیں جانا جائے گا، اور اگر بوسہ پیشانی پر لیا ہو یا ٹھوڑی پر یا رخسار پر تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی، جب تک کہ شہوت سے نہ ہو۔ اور امام ظہیر الدین بوسہ لینے میں مطلقاً حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں: کہ اس کا بلا شہوت ہونے کا دعویٰ سچا نہیں مانا جائے گا۔

علامہ شامی آگے چل کر لکھتے ہیں:

وقال فی "الفیض": ولو قام الیها وعانقها منتشرا او قبلها وقال لم یکن عن شهوة لا یصدق، ولو قبل ولم تنتشر آلته وقال کان عن غیر شهوة یصدق، وقیل لا یصدق لو قبلها علی الفم، وبه یفتی اه۔

ترجمہ: "اور "فیض" میں فرمایا: کہ اگر اٹھ کر اس عورت کی طرف بڑھا اور اس کو گلے لگایا، اس حال میں کہ انتشارِ آلہ تھا یا بوسہ لیا اور کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا، تو اس کے قول کو نہیں مانا جائے گا۔ اور اگر اس نے بوسہ لیا اور انتشارِ آلہ نہیں ہوا اور وہ کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا تو اس کا قول معتبر مانا جائے گا اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر منہ پر

بوسہ لیا ہے،تو اس کے بلاشہوت ہونے کے دعویٰ کی تصدیق نہیں کی جائے گی،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 4 ص:90 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:ویشترط أن تکون المرأۃ مشتھاۃ کذا فی التبیین، والفتوی علی أن بنت تسع محل الشھوۃ لا مادونھا کذا فی معراج الدرایۃ وقال الفقیہ ابو اللیث مادون تسع سنین لاتکون مشتھاۃ وعلیہ الفتوی کذا فی فتاوی قاضی خان۔

ترجمہ:"اور حرمت مصاہرت کے لئے شرط ہے کہ عورت مشتھاۃ ہو(یعنی وہ عمر اور جسمانی وضع کے اعتبار سے ایسی ہو کہ اسے دیکھ کر مرد کو جنسی شہوت آئے)، "تبیین"، میں اسی طرح ہے،اور فتویٰ اس پر ہے کہ نو سال کی عمر والی لڑکی محل شہوت ہے،اگر اس کی عمر اس سے کم ہو تو وہ محل شہوت نہیں ہے،"معراج الدرایہ" میں بھی اسی طرح ہے، اور فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں کہ جو لڑکی نو سال سے کم عمر کی ہو،، وہ مشتھاۃ نہیں ہے،(یعنی اس پر شہوت کی نظر ڈالنے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی)،اسی پر فتویٰ ہے،فتاویٰ قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1 ص:274-275،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

اب صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائل لڑکی کے تایا اور خسر نے اس کی زبان چوسی اور خسر اس بات کا اقرار بھی کرتا ہے،اور منہ کا بوسہ لینے کی صورت میں مرد کا دعوائے عدمِ شہوت غیر معتبر ہے، جب کہ یہاں اس سے بھی بڑھ کر زبان بھی چوسی گئی ہے،جبکہ قرائن بھی اس حقیقت کے مؤید ہیں کہ اس شخص نے یہ عمل شہوت سے کیا ہے، اس لئے مذکورہ بالا لڑکی اور اس کے شوہر کے درمیان حرمت مصاہرت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور دونوں کا آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا،اس لئے دونوں کو فوراً

علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے۔

حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں

سوال: 91

ایک گھر میں تقریباً 14 سال سے Joint Faimly رہتی ہے، ابھی پچھلے جمعہ اچانک بھابھی نے اپنے دیور (سائل) پر الزام لگایا کہ اس نے ان کے کمرے میں آکر (جہاں وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سورہی تھی) اُن کے رخسار پر بوسہ دیا ہے یہ بھابھی کا قول ہے، جبکہ دیور (سائل) کا قول یہ ہے کہ یہ سب ڈرائنگ روم میں سو رہے تھے، میں اپنے کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ بھابھی کی قمیص حد سے زائد پیچھے سے اٹھی ہوئی ہے، میں اس کو ڈھانپنے کے لئے گیا، ان کا بیٹا بھی ساتھ سو رہا تھا ڈھانپتے ہوئے اچانک میرا ہاتھ بھابھی کے چہرے پر لگ گیا جس سے وہ اٹھ گئیں اور انہوں نے غلط بات سمجھی۔

جواب طلب بات یہ ہے کہ آیا بھابھی کا قول معتبر ہوگا یا دیور کا؟ میری بیوی کے بقول بھابھی نے مجھ کو معاف کر دیا ہے لیکن بھائی اور بھابھی نے ترکِ کلام کیا ہوا ہے میرے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟۔(خالد احمد، بلاک 6 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وان ادعت الشهوة)فی تقبیله أو تقبیلها ابنه (وأنكرها الرجل فهو مصدق)۔

ترجمہ: ''اور اگر عورت نے دعویٰ کیا کہ مرد نے اس کو بشہوت چھوا، یا اس عورت نے اس کے بیٹے کو بشہوت چھوا اور مرد نے اس کا انکار کیا تو مرد کا قول معتبر مانا جائے

گا،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد: 4 ص: 92 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ،بیروت)۔"

حدیث میں ہے:عن عقبۃ بن عامر أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: "ایاکم والدخول علی النساء" فقال رجل من الانصار:یا رسول اللّٰہ افرأیت الحموقال الحمو الموت، "(اجنبی)عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو،انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ !دیور کا کیا حکم ہے؟،فرمایا کہ دیور موت ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث 5570 ،جلد 9،مکتبہ نزار مصطفی الباز مکۃ المکرمۃ)

عن علی بن الحسین :کان النبی ﷺ فی المسجد، وعندہ ازواجہ، فرحن،فقال لصفیۃ بنت حیی:"لاتعجلی حتیٰ أنصرف معک"۔ و کان بیتھا فی دار أُسامۃ،فخرج النبی ﷺ معھا،فلقیہ رجلان من الانصار،فنظرا الی النبی ﷺ ثم أجازا، وقال لھما النبی ﷺ: "تعالیا،انھا صفیۃ بنت حیی"۔قالا:سبحان اللہ یارسول اللہ ﷺ،قال :"انّ الشیطان یجری من الانسان مجری الدم،وانّی خشیت أن یلقی فی أنفسکما شیئاً"۔

ترجمہ:"علی بن حسین سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تھے اور آپ کی زوجہء مطہرہ آپ کے پاس تھیں،وہ جانے لگیں تو آپ نے حضرت صفیہ سے فرمایا:ٹھہرو تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں اور ان کا حجرہ حضرت اسامہ کے مکان میں تھا۔نبی کریم ﷺ انکے ساتھ نکلے تو آپ کو انصار کے دو شخص ملے،انھوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آگے نکل گئے۔نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا:ادھر آؤ،یہ صفیہ بنت حیّ ہے(یعنی میری بیوی ہے)۔دونوں نے عرض کیا:یارسول اللہ ﷺ : سبحان

اللہ! (یعنی آپ کی ذات کے بارے میں مومن کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا) آپ نے فرمایا کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے تو مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا وہ تمہارے دل میں کوئی وسوسہ ڈال دے، (صحیح بخاری، جلد 2 رقم الحدیث 2038، مطبوعہ مکتبۃ العصریۃ، بیروت)۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ مواضع تہمت اور مواقع تہمت سے ہمیشہ اجتناب کرے، اپنی عزت وآبرو کا تحفظ مومن کی شرعی ذمہ داری ہے، کسی ایسے مقام پر جانا یا ٹھہرنا، جہاں دوسرے لوگ بدگمانی کی بنا پر ہدفِ تہمت بنا سکتے ہوں۔ ایک روایت میں ہے: من سلك مسالك الظن اتهم، ورواه الخرائطي في مكارم الاخلاق مرفوعاً بلفظ: من اقام نفسه مقام التهم فلايلومن من اساء الظن به۔

ترجمہ: جو بدگمانیوں کی راہوں پر چلے گا، وہ ہدفِ تہمت بنے گا، اور مکارم اخلاق میں خرائطی نے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا کہ "جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)، علامہ اسماعیل بن محمد العملونی الجراحی نے مندرجہ بالا روایات کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: اگرچہ "اتقوا مواضع التھمة" ترجمہ: (مقامات تہمت سے بچو!) کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایات کی بنا پر معنًی ثابت ہے، (کشف الخفاء ومزیل الالباس، جز الاوّل، صفحہ 44، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی، دمشق)۔

صورتِ مسئولہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوئی، آپ کی بھابھی نے آپ کو معاف کر کے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے اور چاہئے کہ ترکِ کلام نہ کریں اور دیور کے لئے لازم ہے کہ آئندہ محتاط رہے۔

شادی اور تقریبات پر فائرنگ اور آتش بازی

سوال: 92

شادی کے موقع پر فائرنگ کرنا کیسا ہے ،قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مدلل ارشاد فرمائیں، (سلمان حسین ،لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

زمانۂ قدیم سے ہی حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں میں طرزِ بود وباش ، معاشرتی میل جول اور خوشی وغم کے جذبات واحساسات کے پیرائیہ اظہار کے طور طریقے بدلتے چلے آرہے ہیں، اس حوالے سے مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے، جو اس قوم کی شناخت بھی ہوتی ہے اور ہر قوم خوشی کا اظہار زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ثقافت کے مطابق کرتی رہی ہے، مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رسوم ورواج اور ثقافتیں بھی بدلتی رہتی ہیں، کہیں سادگی کا عنصر نمایاں ہو تو کہیں اظہارِ ثقافت کی زیادہ سے زیادہ نمود ونمائش پائی جاتی ہے، اور وہ رسومات جب تک شریعت سے متصادم نہ ہوں ،شرعاً ان پر طعن نہیں کیا جا سکتا، اور ان رسومات کے مذموم ومحمود ہونے کا مدار نیت پر ہے جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: فی الواقع نکاح میں بغرضِ اعلان بندوقیں چھوڑنے کی ممانعت شرع میں کہیں ثابت نہیں ۔ ہلالِ عید اور رمضان میں صدھا سال سے توپوں کے فائر کئے جاتے ہیں اس سے بھی اعلان ہی مقصود ہوتا ہے اس اعلان پر شرعاً عمل کا جزئیہ ردالمحتار میں مذکور ہے ۔نیتِ ریا وتفاخر نہ فقط شادی کی بندوقوں بلکہ نماز کو حرام کر دیتی ہے، رسم کا اعتبار جب تک کسی فساد عقیدہ پر مشتمل نہ ہو اصل رسم کے حکم میں رہتا ہے اگر رسم محمود ہے محمود ہے، مذموم ہو مذموم ہے، مباح ہو مباح ہے، واللہ

تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص: 119، رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے شادیوں میں کی جانے والی مختلف رسومات مثلاً آتش بازی، بندوق اور گانا بجانا، لکڑی کھیلنا، نوشہ (دولہا) کو پالکی میں سوار کرنے سے متعلق سوال ہوا، آپ نے جواب میں فرمایا: نوشہ کو پالکی میں سوار کرنا مباح وجائز ہے لان من الرسوم العامة التی لا مضر فیھا من الشرع۔ (اس لئے کہ یہ اُن عادی رسموں میں سے ہے شریعت میں جن پر کوئی طعن نہیں) اور لکڑی پھینکنا، بندوقیں چھوڑنا اور اس قسم کے سب کھیل جائز ہیں جبکہ اپنے اور دوسرے کی مضرت کا اندیشہ نہ ہو، ایک اور سوال کہ ''اعلان کے لئے شادی میں بندوقیں چھوڑنا جائز ہے یا نہیں؟'' کے جواب میں لکھتے ہیں: جائز ہے۔ اخرج الترمذی عن ام المؤمنین الصدیقة رضی اللہ تعالیٰ عنھا قالت قال رسول اللہ ﷺ اعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوہ علیہ بالدفوف وروٰی احمد بسند صحیح وابن حبان فی صحیحہ والطبرانی فی الکبیر وابو نعیم فی الحلیة والحاکم فی المستدرک عن عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنھما عن النبی ﷺ قال اعلنوا النکاح، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: ''امام ترمذی نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تخریج فرمائی کہ آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو۔ امام احمد نے سند صحیح سے ابن حبان نے اپنی صحیح میں، طبرانی نے الکبیر میں، اور ابو نعیم نے الحلیہ میں اور حاکم نے المستدرک میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے روایت فرمائی کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نکاح کا

اعلان کیا کرو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 277، 289، 290، رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)''۔آج کل آتش بازی کی ممانعت کا قانون موجود ہے اور تقریبات کے موقع پر فائرنگ سے بعض اوقات حادثات بھی رونما ہو جاتے ہیں ،اس لئے قانون کی پابندی بھی ضروری ہے اور فی نفسہ از روئے شرع پابندی کے جواز کے باوجود احتیاط پر عمل کرنا افضل ہے،اور اس حد تک آتش بازی اور فائرنگ جو اسراف کی حد میں داخل ہو جائے ،بہر حال ممنوع ہے۔آگ کا کھیل تو ویسے بھی مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔

جبری نکاح کا حکم

سوال: 93

میری بیٹی رضوانہ جس کی شادی میری سالی کے بیٹے کے ساتھ ہوئی۔دوسری طرف میری بیوی گردوں کی خرابی کی وجہ سے 2005ءکو اس دنیا سے رخصت ہوئی ،اس پر میری بیٹی کراچی آئی ہوئی تھی۔چونکہ میری بیٹی امید سے تھی، میری بیٹی نے بڑے آپریشن سے بچے کو جنم دیا۔اس کے تین ماہ بعد اس کے شوہر نے کہا کہ میری ماں نے بمع بیوی اور بچے اپنے پاس سیہون بلانے کو کہا ہے،اس پر میں نے اجازت دی کہ اپنے گھر سیہون جاؤ۔اجازت دینے کے بعد چونکہ میری بیٹی آپریشن کی وجہ سے کمزور تھی۔اس کے ساتھ اس سے تیسرے نمبر پر میری بیٹی ارم کو ساتھ روانہ کیا تا کہ بچے کو سنبھال سکے۔واضح ہو کہ اس سے قبل میری بیٹی کی ساس نے میری دوسری بیٹی ارم کا رشتہ اپنے دوسرے بیٹے کے لئے مانگا تھا۔لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میری پہلی بیٹی مشکلات میں تھی ۔اس کا شوہر کچھ بھی نہیں کماتا۔اور کچھ بھی جو تھوڑا بہت کماتا ہے۔وہ ماں کو دے دیتا ہے۔بجائے اپنی

بیوی کو دینے کے۔ جو کہ از روئے شریعت محمدی ﷺ بیوی کا حق ہے۔ اور شوہر کا فرض ہے۔ اس کا شوہر کوئی اخراجات میری بیٹی کے برداشت نہیں کرسکتا۔ اسی وجہ سے دوسرے رشتے کے لئے میں نے انکار کردیا۔ اور اپنے تیسرے نمبر والی بیٹی کی منگنی کہیں اور کردی۔ جس میں میرے داماد کی مرضی بھی شامل تھی۔ بہرحال پہلی شادی شدہ بیٹی کے ساتھ بچے کی دیکھ بھال کے لئے اپنی تیسرے نمبر والی بیٹی کو بھیجا۔ اس کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد جب ارم کراچی آئی۔ تو اس نے بتایا کہ میرا زبردستی نکاح کروادیا اپنے بیٹے کے ساتھ اور ان کو معلوم تھا۔ کہ ارم کسی اور کی امانت ہے۔ حالانکہ میں اس رشتے کے لئے دو دفعہ منع کرچکا تھا۔ ارم کے نکاح میں نہ میں شریک ہوا اور نہ ہی ہمارے رشتے داروں میں سے کوئی یہاں تک کہ میری شادی شدہ بیٹی جو کہ اسی گھر میں رہتی ہے۔ اسے بھی پتہ نہ تھا۔ اس پر میری تیسرے نمبر والی بیٹی نے کہا کہ مجھ سے زبردستی نکاح کروایا ہے۔ میں اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔ مجھ پر جادو ہوا تھا۔ اور میں اس رشتے سے خوش نہیں ہوں، جہاں میرے ماں باپ نے میری منگنی طے کی ہے، میں وہیں خوش ہوں۔ میں وہاں خوش نہیں رہوں گی۔ اسباب یہ ہے کہ میری پہلی بیٹی وہاں بھوک سے مر رہی ہے۔ اسی کے اخراجات پورے نہیں کرسکتا۔ اس بنا پر اپنی دوسری بیٹی نہیں دینا چاہتا۔ آپ سے گذارش ہے کہ شریعتِ محمدی ﷺ کے مطابق فتویٰ صادر فرمائیں کہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟، (محمد نواز، ڈیفنس ویو، فیز II بنگلہ نمبر G-199 مدینہ اسٹاپ نزد ارم مسجد کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق جبر کی حالت میں نکاح ہوجاتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ لکھتے ہیں:

اقول وبتقریری هذا اندفع ماعسیٰ ان یتوهم من ان النکاح مما یستوی فیه الهزلِ والجدفلا یحتاج الی نیة وقصد متی لو تکلما بالایجاب و القبول هازلین اومکرهین ینعقد۔

ترجمہ: ''اقول (میں کہتا ہوں) میری اس تقریر سے اس شبہ کا ازالہ ہوگیا، جس میں کہا گیا کہ نکاح تو ان امور میں سے ہے، جن میں مذاق اور قصد برابر ہیں، لہٰذا اس میں قصد اور ارادہ کی ضرورت نہیں حتی کہ جب مرد وعورت نے ایجاب وقبول کے کلمات بول دیئے اگرچہ مذاق یا جبر سے کہے ہوں، تو نکاح ہوجائے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ص:128)''۔

مزید لکھتے ہیں:

نکاح اگرچہ جبرواکراہ سے بھی ہوجاتا ہے، فی الھندیة الاصل ان تصرفات المکرہ کلھا قولا منعقدة عندنا الا ان مایحتمل الفسخ منه کالبیع والاجارة یفسخ ومالا یحتمل الفسخ منه کالطلاق والعتاق والنکاح والتدبیر والاستیلاد والنذورفهو لازم کذا فی الکافی اھ

ترجمہ: ''ہندیہ میں ہے قاعدہ یہ ہے کہ جس پر جبر کیا گیا ہو اس کے اس حالت کے تمام تصرفات نافذ العمل ہونگے، ہاں وہ تصرفات جو فسخ کا احتمال رکھتے ہوں جیسے بیع اور اجارہ کہ یہ فسخ قرار پائیں گے، اور جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے ،مثلاً طلاق، عتاق، نکاح، مدبّر بنانا، ام ولد بنانا اور نذر تو یہ امور لازم ہوجائیں گے، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ص:202-203)''۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں نکاح منعقد ہوگیا۔

جعلی نکاح نامے کی حیثیت

سوال: 94

ایک شخص نے کسی لڑکی سے جھوٹا اور جعلی نکاح نامہ تیار کرلیا ہے۔لڑکی اور اس کے والدین کواس نکاح کا کوئی علم نہیں ۔ازراہِ کرم یہ ارشادفرمائیں کہ اس جھوٹے نکاح نامہ کی بنیاد پر شرعی نکاح ثابت ہوگا یا نہیں ہوگا؟یعنی اس صورت میں ہمیں لڑکے سے طلاق لینا ضروری ہے؟نکاح نامہ میں جو وکیل اور گواہان رکھے گئے ہیں۔وہ سب کے سب فرضی ہیں اور ہم لڑکی والے ان کو پہچانتے بھی نہیں ۔
واضح رہے کہ لڑکی نے نکاح نامہ پر نہ دستخط کئے ہیں اور نہ ایجاب وقبول ہوا ہے ،(پروفیسر میر محمد سومرو،ساکن ہنگورجہ تحصیل سوبھودیرو ضلع،خیر پور میرس)۔

جواب:

استفتاء میں مستفتی نے چند دعوے کئے ہیں:

(1)لڑکی کے ساتھ نکاح کے ثبوت کے لئے نکاح نامہ تو موجود ہے،لیکن جعلی ہے۔

(2)نکاح نامے میں دلہاودلہن کے دستخط اور گواہوں کے نام اوردستخط موجود ہیں،لیکن مستفتی کا دعویٰ ہے کہ لڑکی کے دستخط فرضی اور جعلی ہیں اور گواہان بھی فرضی ہیں۔

(3)ایجاب وقبول ہوا ہی نہیں ہے۔

ہمارا منصب افتاء ہے،قضا نہیں ہے، ہمارا جواب اس مفروضے پر مبنی ہوتا ہے کہ استفتاء میں بیان کردہ بیان اورحقائق اگر درست ہیں،تو صورتِ مسئولہ کا شرعی جواب یہ ہے ،باقی رہا یہ سوال کہ استفتاء میں بیان کردہ صورتِ مسئلہ آیا حقیقت پر مبنی ہے اور واقعہ کے مطابق ہے؟قطعیت کے ساتھ اس کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔پس اگر استفتاء میں بیان کردہ صورتِ مسئلہ درست ہےتو شرعاً نکاح منعقد ہی نہیں ہوا ،لہٰذا

طلاق کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ طلاق، اس نکاح کی قید سے آزاد کرنے کا نام ہے، جو شرعاً منعقد ہو چکا ہو۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔

غیر رجسٹرڈ نکاح کی شرعی حیثیت

سوال: 95

نیاز بی بی بنت شیر اکبر کا نکاح محمد حنیف ولد محمد اسلم خان کے ساتھ 4، اپریل 1997ء کو مصری خان ولد فضل الرحمٰن کی وکالت پر گواہان حاجی محمد نور ولد نواب اور محمد ایوب ولد نواب کے روبرو قاضی نکاح خواں نے پڑھایا۔جس میں نیاز بی بی کے والد شیر اکبر اوران کے ساتھ کئی قریبی رشتے دار بھی موجود تھے، اس نکاح کا اندراج رجسٹر میں نہیں کرایا، جو کہ ہمارے ہاں اکثر رخصتی پر یہ نکاح رجسٹرڈ کیا جاتا ہے۔لہٰذا اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے۔بغیر رجسٹریشن نکاح ہوا یا نہیں؟ محمد حنیف کے طلاق دیئے بغیر نیاز بی بی دوسرے فریق سے نکاح کرسکتی ہے؟، (نصیر احمد الحسنی ، اسلامک سینٹر، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے، نکاح کے شرعی طور پر منعقد ہونے کے لئے فارم پر کرنا یا رجسٹریشن کرانا شرط نہیں، البتہ یہ قانونی ضرورت بھی ہے اور دستاویزی ثبوت کی وجہ سے تنازعات کے حل میں مدد ملتی ہے، لہٰذا یہ مستحسن امر ہے اور ایسا کرنا بہتر ہے ۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:"قاضی کا رجسٹر شرعاً کوئی شرطِ نکاح نہیں، رجسٹر آج سے نکلے ہیں، پہلے نکاح کیونکر ہوتے تھے، ہاں یادداشت کے لئے درج ہونا بہتر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم ، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 21،ص:169 جلد: 23،ص:193 ، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن ،)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: النکاح ینعقد بالایجاب و القبول ۔ ترجمہ: ''نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوجاتا ہے ، (فتاویٰ عالمگیری ، جلد 1 ، ص: 270 ، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لہٰذا مذکورہ بالا گواہوں کی موجودگی میں محمد حنیف کا نکاح نیاز بی بی سے منعقد ہوگیا اور چونکہ نیاز بی بی کے والد بھی نکاح کے وقت موجود تھے، اس لئے بجا طور پر ولی کی رضا بھی اس میں شامل ہے ۔ اور اب وہ اس کی پابند ہے، بغیر اس کے طلاق دیئے ، یا اس کی زندگی میں اس کے نکاح میں رہتے ہوئے کسی اور شخص سے نکاح کرنا حرام ہے اور اگر نکاح کیا تو منعقد ہی نہیں ہوگا اور زنا کی مرتکب ہوگی ۔

میاں بیوی کے ایک دوسرے پر الزامات لگانے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا

سوال: 96

ایک دفعہ T.V پر میں نے کسی وکیل سے سنا کہ اگر میاں بیوی ایک دوسرے پر الزامات لگائیں اور اگر چہ وہ غلط ہوں یا صحیح تو شرعی حیثیت سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے ۔ مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا یہ درست ہے ؟، (اسامہ بن سہیل، گلشن اقبال اصفہانی روڈ، کراچی)۔

جواب:

وکیل کا یہ بیان شرعاً غلط اور باطل ہے کہ اگر زوجین (میاں بیوی) ایک دوسرے پر زنا کی تہمت لگائیں، تو اس امر سے قطع نظر کہ تہمت زنا فی الواقع صحیح ہے یا غلط ، ان دونوں کا نکاح از خود (Automaticaly) ٹوٹ جائے گا، ایسا ہرگز نہیں ہے ، وکیل صاحب کو شریعت کا علم نہیں ہے اور شرعی علم کے بغیر ایسے فتوے جاری نہیں کرنے چاہئیں ۔ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے ، یا اس کے نکاح میں رہتے

ہوئے اس عورت کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے، اسے ولدالزنا کہے اور اسے اپنی صحیح النسب اولاد ماننے سے انکار کردے، اور پھر معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچ جائے تو قاضی عورت سے شوہر کے دعوے (یعنی الزامِ زنا) کی صداقت کے بارے میں پوچھے گا، اگر وہ اقرار کرے تو اس پر حدِّ زنا جاری ہوگی، لیکن اگر وہ شوہر کے دعوے اور الزام کو رد کردیتی ہے اور اپنی عفت اور پاک دامنی کا دعویٰ کرتی ہے (ظاہر ہے کہ یہ اس صورت حال کی بابت ہے، جب شوہر کے پاس اپنی بیوی پر ثبوتِ زنا کے گواہ نہیں ہیں اور بیوی اعترافِ جرم سے انکاری ہے)، تو قاضی ان دونوں کے درمیان ''لِعان'' کرائے گا، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

والذین یرمون ازواجھم ولم یکن لھم شھدآء الّا انفسھم فشھادۃ احدھم اربع شھادات ؑ باللہ انّہ لمن الصّٰدقین o والخامسۃ انّ لعنت اللہ علیہ ان کان من الکٰذبین o ویدرٔا عنھا العذاب ان تشھد اربع شھادات ؑ باللہ انّہ لمن الکٰذبین والخامسۃ انّ غضب اللہ علیھآان کان من الصّٰدقین o

ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں، اور ان کے پاس خود ان کے سوا اور کوئی گواہ نہ ہوں، تو ان میں سے کسی ایک شخص کی گواہی یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ بے شک وہ (اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگانے میں) سچوں میں سے ہے o اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو o اور عورت سے حدِّ زنا اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ (یعنی اس کا خاوند) ضرور جھوٹوں میں سے ہے o اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہو اگر وہ (خاوند) سچوں میں سے ہو o (النور: 6 تا 9)''۔ حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهما: أن هلال بن امية قذف امرأته عندالنبي ﷺ بشريك بن سحماء، فقال النبي ﷺ: "البينة أو حدٌ في ظهرك" فقال: يارسول الله، اذا رأى احدنا على امرأته رجلا، ينطلق يلتمس البينة؟ فجعل يقول: "البينة والا ؟حد في ظهرك"۔ فذكر حديث اللعان۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی (اور نبی ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا) تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد قذف کے کوڑے لگائے جائیں گے، اس نے کہا: یا رسول ﷺ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کیساتھ کسی اجنبی شخص کو حالتِ گناہ میں دیکھے تو کیا وہ گواہوں کو تلاش کرنے چل پڑے گا؟، آپ نے پھر یہی فرمایا کہ تم گواہوں کو پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدِ قذف لگائی جائے گی، پھر''لعان'' کے احکام نازل ہوئے، (صحیح بخاری، جلد نمبر 2، رقم الحدیث: 2671، مطبوعہ مکتبہ عصریہ، بیروت)''۔

امام مسلم حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعان جاری کرنے سے پہلے شوہر کو (ان الفاظ کے ساتھ) نصیحت وتذکیر فرمائی: انّ عذاب الدنیا اھون من عذاب الآخرۃ، قال :لا والّذی بعثك بالحق ما کذبت علیھا، ثم دعاھا فوعظھا و ذکّرھا واخبرھا انّ عذاب الدنیا اھون من عذاب الآخرۃ۔

ترجمہ:''دنیا کی سزا (حد قذف) آخرت کے عذاب کے مقابلے میں معمولی ہے، اس شخص نے کہا: قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے اس پر جھوٹی تہمت نہیں لگائی۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلایا اور اس کو وعظ ونصیحت کی (یعنی عذاب آخرت سے ڈرایا) اور فرمایا: دنیا کی سزا (حد زنا) آخرت کے عذاب کے

مقابلے میں بہت معمولی ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3676)"۔

لِعان کا طریقہ: شوہر قاضی کے سامنے چار بار اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہے گا کہ وہ (اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے میں) سچا ہے، اور پانچویں بار کہے گا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، پھر بیوی چار مرتبہ قاضی کے سامنے قسم کھا کر یہ کہے گی کہ میرا شوہر مجھ پر زنا کا الزام لگانے میں جھوٹا ہے اور پانچویں بار کہے گی کہ اگر اس کا شوہر اس پر زنا کا الزام لگانے میں سچا ہو تو اس (عورت) پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو۔

لِعان کی چند شرطیں ہیں، ان کی بابت علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

لِعان کے لئے چند شرطیں ہیں: "(1) نکاح صحیح ہو، اگر اس عورت سے اس کا نکاح فاسد ہوا اور تہمت لگائی، تو لعان نہیں (2) زوجیت قائم ہو، خواہ دخول ہوا ہو یا نہیں لہٰذا اگر تہمت لگانے کے بعد طلاق بائن دینے کے بعد تہمت لگائی یا زوجہ کے مرجانے کے بعد، تو لعان نہیں اور اگر تہمت کے بعد رجعی طلاق دی یا رجعی طلاق کے بعد تہمت لگائی، تو لِعان ساقط نہیں (3) دونوں آزاد ہوں (4) دونوں عاقل ہوں (5) دونوں بالغ ہوں (6) دونوں مسلمان ہوں (7) دونوں ناطق ہوں یعنی ان میں کوئی گونگا نہ ہو (8) ان میں کسی پر حد قذف نہ لگائی گئی ہو (9) مرد نے اپنے اس قول پر گواہ نہ پیش کئے ہوں (10) عورت زنا سے انکار کرتی ہو اور اپنے کو پارسا کہتی ہو اِصطلاحِ شریعت میں پارسا اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ وطی حرام نہ ہوئی ہو نہ وہ اس کے ساتھ مُتّہم ہو لہٰذا طلاق بائن کی عدت میں اگر شوہر نے اس سے وطی کی اگرچہ وہ اپنی نادانی سے یہ سمجھتا تھا کہ اس سے حلال ہے تو عورت عفیفہ نہیں یوں ہی اگر نکاح فاسد کر کے اس سے وطی کی تو عفت جاتی رہی یا عورت کی اولاد ہے جس کے باپ کو یہاں کے

لوگ نہ جانتے ہوں اگر چہ حقیقتاً وہ ولد الزنا نہیں ہے یہ صورت مُتّہم ہونے کی ہے اس سے بھی عفت جاتی رہتی ہے اور اگر وطی عارضی سبب سے حرام ہو، مثلاً حیض ونفاس وغیرہ میں (جن میں وطی حرام ہے) وطی کی، تو اس سے عفت نہیں جاتی (11) صریح زنا کی تہمت لگائی ہو یا اس کی جو اولاد اس کے نکاح میں پیدا ہوئی اس کو یہ کہتا ہو کہ یہ میری نہیں یا جو بچہ عورت کا دوسرے شوہر سے ہے اس کو کہتا ہو کہ یہ اس کا نہیں (12) دارالاسلام میں یہ تہمت لگائی ہو (13) عورت قاضی کے پاس اس کا مطالبہ کرے (14) شوہر تہمت لگانے کا اقرار کرتا ہو یا دو مرد گواہوں سے ثابت ہو۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: اگر مسلمان مرد کی بیوی اہلِ کتاب میں سے ہے، تو اس پر لعان جاری نہیں ہو سکتا، (بہار شریعت جلد: 1، ص: 943,944، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز)"۔

عن نافع: ان ابن عمر رضی اللہ عنهما أخبره: ان رسول الله ﷺ فرق بين رجل وامراة قذفها وأحلفهما۔

ترجمہ: "نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے والے مرد اور عورت دونوں کو قسم دلائی اور پھر ان کے درمیان تفریق فرما دی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5313)"۔

لعان کے بعد زوجین کے درمیان از خود تفریق نہیں ہوتی بلکہ لعان کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن نکاح سے خارج نہیں ہو گی بلکہ لعان کے بعد حاکمِ اسلام یا قاضی ان کے درمیان تفریق کرے گا۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں: مذهب مالك والشافعی ومن تبعهما الى ان الفرقة تقع بنفس اللعان قال مالك وغالب اصحابه بعد فراغ المراة وقال

الشافعی واتباعہ وسحنون من المالکیۃ بعدفراغ الزوج وقال الثوری وابوحنیفۃ واتباعھما لا تقع الفرقۃ حتیٰ یوقعھا علیھما الحاکم وعن احمد روایتان۔

ترجمہ:''امام مالک، امام شافعی اوران کے موافقین کا یہ نظریہ ہے کہ نفسِ لعان سے لعان کرنے والوں کے درمیان ازخود تفریق واقع ہوجاتی ہے، امام مالک اور ان کے اکثر اصحاب کا قول یہ ہے کہ عورت کے لعان سے فارغ ہونے کے بعد تفریق ہو جاتی ہے اورامام شافعی، اوران کے پیروکارں اورامام مالک کے مقلدین میں سے سحنون کا قول یہ ہے کہ شوہر کے قسم سے فارغ ہونے کے بعد زوجین کے درمیان فرقت لازم ہوجاتی ہے، امام سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اوران دونوں کے متبعین کا قول ہے کہ نفسِ لعان سے تفریق نہیں ہوتی تاوقتیکہ (لعان کے بعد) قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کرے، اورامام احمد بن حنبل کے اس مسئلے میں دوقول ہیں، (یعنی ایک قول کے مطابق احناف کے ساتھ ہیں اوردوسرے کے مطابق شوافع کے ساتھ)، (عمدۃ القاری جلد 20 ص: 295 ادارۃ الطباعۃ المنیر، مصر)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وحُرم وطءھا بعد اللعان قبل التفریق۔

ترجمہ:''اورلعان کے بعد اگر ابھی (دونوں کے درمیان) تفریق نہ ہوئی ہوتب بھی (شوہر کے لئے) اس عورت سے وطی حرام ہے، (اورابن عابدین شامی نے محرکات واسباب وطی کو بھی حرمت میں شامل کیا ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد: 5، ص: 126، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس سے ثابت ہوا کہ لعان طلاق بائن کے حکم میں ہے، بیوی اگرشوہر پر زنا کا الزام لگائے تو لعان جاری نہیں ہوگا اورنکاح قائم رہے گا، تاوقتیکہ شوہر طلاق نہ دے۔

لیکن امام ابوداوٗد روایت کرتے ہیں: قال سهل: حضرت هذا عند رسول الله ﷺ، فمضت السنة بعد في المتلاعنين ان يفرق بينهما، ثم لا يجتمعان ابدا۔

ترجمہ: ''سہل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس (لعان) کے موقع پر حاضر تھا، اس کے بعد (لعان کرنے والے زوجین کے بارے میں) یہ سنت جاری ہوگئی کہ ان کے درمیان تفریق کردی جائے، پھر وہ کبھی بھی (نکاح میں) جمع نہیں ہوں گے، (سنن ابی داوٗد رقم الحدیث: 2244)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أي مادام حكمه باقياً، فلو خرجا أو احدهما عن أهلية اللعان له أن ينكحها كما يأتي، وعليه حمل الحديث المذكور، ولا ينافيه قوله ابدا كمافي قوله تعالىٰ: انهم ان يظهروا عليكم يرجموكم او يعيدوكم في ملتهم ولن تفلحوا اذا ابدا، (الكهف: 20)۔

ترجمہ: ''یہ دائمی تفریق اس وقت تک مؤثر ہے، جب تک اس کا حکم باقی ہے، اگر وہ دونوں یا ان میں سے ایک اہلیت لعان سے خارج ہوگیا (مثلاً شوہر اپنی بیوی پر زنا کے الزام سے رجوع کرلے تو اس پر حد قذف لگے گی) تو پھر لعان کے بعد بھی اس سابقہ بیوی سے نکاح کرسکتا ہے، (کیونکہ لعان کی بنا پر تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہے اور طلاق بائن کے بعد باہمی رضا مندی سے دونوں میں نکاح ہوسکتا ہے)، اور آگے چل کر شامی نے آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے کہ کلمہ ''ابداً'' ہمیشہ قطعی دائمی کے حکم میں نہیں ہوتا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 5، ص: 119 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

سوال: 97

زید نے ایک مطلقہ عورت سے شادی کی اس عورت کی پہلے خاوند سے اولاد (لڑکی) ہے اور زید کی بھی (پہلی بیوی سے) اولاد ہے، اب زید (اپنی پہلی بیوی کے) بیٹے کا نکاح اس عورت کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔ آیا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟، (قاری محمد زمان چشتی، مدرس: دارالعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل یہ نکاح جائز ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لا بأس بأن يتزوج الرجل امرأة ويتزوج ابنه ابنتها أو أمها كذا في محيط السرخسي۔

ترجمہ: "کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس شخص کے لڑکے نے عورت کی لڑکی سے نکاح کیا جو اس عورت کے پہلے شوہر سے تو حرج نہیں، یونہی اگر لڑکے نے عورت کی ماں سے نکاح کیا جب بھی یہی حکم ہے (بشرطیکہ حرمتِ نکاح کی اور کوئی وجہ نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

مفتی محمد نور اللہ نعیمی ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: اگر صورتِ سوال صحیح اور واقعی ہے تو یہ نکاح کرنا یقیناً روا ہے، قرآن کریم میں ہے: واحل لکم ما وراء ذالکم، فتاویٰ عالمگیری، جلد: 2، ص: 6 میں محیط سرخسی سے ہے اور بحرالرائق، جلد: 3، ص: 98، درمختار، شامی جلد: 2، ص: 383 میں بحرالرائق اور فتاویٰ خیریہ سے ہے: والنظم من الدر واما بنت زوجة ابيه او ابنه فحلال بحرالرائق میں اضافہ فرمایا: وقد تزوج محمد بن الحنفيه امرأة وزوج ابنه بنتها، سب عبارات کا

حاصل یہ ہے کہ یہ نکاح کرنا حلال ہے اور اہل بیت کرام میں بھی ہوا، حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام محمد بن حنفیہ نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اسی عورت کی بیٹی کا نکاح اپنے بیٹے سے کرادیا اپنی بیوی کی لڑکی اپنے صاحبزادے کو نکاح کردی، (فتاویٰ نوریہ، جلد:2، ص:433، مطبوعہ: بصیرپور اوکاڑہ)"۔

حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح

سوال: 98

ایک بچے نے ایک عورت کا دودھ پیا۔اس بچے کے بڑے بھائی کا رشتہ اس عورت کی لڑکی سے آیا ہے کیا یہ شادی ہوسکتی ہے۔برائے مہربانی اس بات کی شرعی تصدیق فرمادیجئے کہ یہ شادی جائز ہے یا نہیں؟، (تحسین، مکان نمبر 2-65 قصبہ موڑ، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل جس بچے نے عورت کا دودھ مدتِ رضاعت (یعنی ڈھائی سال کی عمر تک) پیا تو اس بچے کی رضاعت ثابت ہے اور اس عورت کی تمام اولاد خواہ وہ دودھ پلانے سے پہلے کی ہو یا بعد کی اس شوہر سے ہوں یا دوسرے شوہر سے وہ سب اس دودھ پینے والے کے لئے رضاعی بہن بھائی ہوگئے اور ان میں سے کسی کی شادی اس دودھ پینے والے سے نہیں ہوسکتی۔لیکن اس کے دوسرے بھائی بہن جنہوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا اس سے رضاعت کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔لہٰذا ان کے آپس میں نکاح جائز ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وتحل اخت اخیہ رضاعا)______كأن يكون لاخيه رضاعا اخت

نسباو بھما۔

ترجمہ:"حقیقی بھائی کی رضاعی بہن یا رضاعی بھائی کی حقیقی بہن یا رضاعی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار:جلد:4،ص:301،داراحیاء التراث العربی،بیروت)"

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ: زید بکر کا چچازاد بھائی ہے اور رضاعی بھی زید کے صرف ایک حقیقی چھوٹا بھائی ہے اور بکر کے ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن جو کہ حقیقی ہیں اور بکر کی بہن دونوں بھائیوں سے چھوٹی ہے تو زید کے چھوٹے بھائی کا نکاح بکر کی چھوٹی بہن سے جائز ہے یا نہیں؟،چونکہ زید اور بکر آپس میں رضاعی بھائی ہیں۔

جواب میں لکھتے ہیں: بکر نے اگر زید کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید اور اس کا بھائی بکر کے بھائی ہوئے نہ کہ خواہر بکر کے اور اگر زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید خواہر بکر کا بھائی ہوا نہ کہ زید کا بھائی بہر حال زید کے بھائی اور بکر کی بہن میں نکاح جائز ہے لقولھم تحل اخت اخیہ رضاعا(فقہاء کے قول کے مطابق بھائی کی رضاعی بہن حلال ہے)،واللہ تعالیٰ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ ،جلد:11،ص:279،مطبوعہ:رضافاؤنڈیشن،لاہور)"۔

لاعلمی میں بہن بھائی کا نکاح

سوال:99

کچھ دن پہلے ہمارے محلے میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ہوا یوں کہ ہمارے محلے میں ایک لڑکی کی شادی ہوکر آئی ،شادی کے چھ ماہ بعد ان دونوں کو پتہ چلا کہ وہ آپس میں بہن بھائی ہیں، جو تین سال کی عمر میں بچھڑ گئے تھے،یہ بات معلوم

ہوتے ہی لڑکی نے خودکشی کرلی، جبکہ لڑکا دبئی چلا گیا اور وہیں شفٹ ہوگیا تا کہ یہاں شرمندگی نہ ہو۔اب ایسے میں اسلام کیا کہتا ہے، کیا وہ لڑکا گنہگار ہے یا نہیں؟، (نبیل بھٹی، لاڑکانہ)۔

جواب:

صورت مذکورہ میں وہ لڑکا یا لڑکی شرعاً گناہ گار نہیں ہیں، اگر انہیں نکاح کے وقت اس کا علم نہیں تھا، تاہم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں، لڑکی کا خودکشی کرنا شرعاً فعل حرام ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عفو ومغفرت کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔ البتہ اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاء مجلس نکاح کو ان دونوں کے اس بھائی بہن کے رشتے کا علم تھا، اور انہوں نے اسے حلال جان کر کیا تو کفر ہے، توبہ کریں اور تجدیدِ ایمان وتجدیدِ نکاح کریں، اور اگر اسے حرام قطعی جانتے ہوئے کیا تو وہ سب فاسق وفاجر ہیں، توبہ کریں اور اللہ کے غضب سے ڈریں۔ اور اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاء مجلس نکاح کو بھی اس رشتے کا علم نہیں تھا تو پھر وہ سب بھی عنداللہ معذور ہیں، بہر حال اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں اور معافی مانگتے رہیں۔ باقی نکاح کرنے والا بھائی چونکہ بہن کے رشتے سے لاعلم تھا، اس لئے معاشرے کو چاہئے کہ جو عنداللہ معذور ہو، اسے ملامت نہ کریں۔

تحلیلِ شرعی کے لئے زوجِ غیر کے ساتھ نکاحِ صحیح ضروری ہے

سوال: 100

ایک لڑکی ''ک'' کا نکاح بنام ''الف'' سے ہوا۔ شادی کے تقریباً سات سال بعد اس کے خاوند نے ''ک'' اس کو تحریری طور پر تین طلاقیں دے دیں اور حق مہر وعدت کے تمام واجبات ادا کر دیئے۔ ایک سال کے بعد دونوں میں مفاہمت کے

امکانات پیدا ہوگئے اور ''تحلیلِ شرعی'' کے لئے راضی ہوگئے ۔جس کے لئے ایک شخص ''ش'' سے غیر مشروط طور پر نکاح کرلیا، نکاح لڑکی کے والد نے پڑھایا، صرف لڑکی کی والدہ موجود تھی اور کوئی گواہ نہیں تھا، اس شخص یعنی ''ش'' نے ازدواجی تعلقات بھی تین مرتبہ قائم کئے، لیکن اس نکاح کو پوشیدہ رکھا گیا اور ایک ماہ بعد اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ یا شرط، اس نے ''ک'' کو فون پر اس کے والد کے روبرو تین طلاق دے دیں اور لڑکی نے عدت بھی مکمل کرلی ۔اب لڑکی ''ک'' دوبارہ اپنے سابقہ شوہر ''الف'' سے نکاح کرنا چاہتی ہے ۔اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آیا تحلیلِ شرعی کے لئے کیا گیا نکاح درست ہوا یا نہیں؟ اور اب ''ک'' اپنے سابقہ شوہر ''الف'' سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟، (ایم یاسین عابد قریشی، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب :

نکاح کا اعلانیہ طور پر ہونا، نکاح کے مستحبات میں سے ہے، اور دو گواہوں کی موجودگی میں ہونا شرائط نکاح میں سے ہے، جیسا کہ اعلان نکاح کے حکم میں حدیث مبارکہ میں ہے: عن عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا قالت: قال رسول اللہ ﷺ: أعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوہ علیہ بالدفوف۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو، (سنن ترمذی، رقم الحدیث :1089)''۔

نکاح کے منعقد اور صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ دو مسلمان گواہوں کے سامنے مجلسِ نکاح میں ایجاب وقبول کیا جائے، امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی

مسلک ہے، اور ان ائمۂ ثلاثہ کی دلیل یہ حدیث ہے: عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال: البغایا اللاتی ینکحن انفسھن بغیر بینۃ ۔
ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بدکار عورتیں وہ ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1103)''۔
شیخ الاسلام برہان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں: و لا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاھدین حرین عاقلین بالغین او رجل و امرأتین۔
ترجمہ: ''مسلمانوں کا نکاح منعقد نہیں ہوتا جب تک وہاں دو آزاد عاقل و بالغ مسلمان مرد گواہ یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ موجود نہ ہوں''۔ اس کی شرح میں علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: أما اشتراط الشھادۃ فلقولہ علیہ السلام "لا نکاح الا بشھود "
ترجمہ: ''پس شہادت (گواہوں) کی شرط نبی کریم ﷺ کے اس قول کے مطابق لگائی گئی ہے کہ ''گواہوں کے بغیر نکاح (منعقد) نہیں''، (فتح القدیر مع ہدایہ، جلد 3، ص: 190,191 مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکات رضا، گجرات، ھند)''۔
علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ ''لا نکاح الا بشھود۔ (گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا)'' اور ہمارے علماء (حنفیہ) اسی حدیث پر عمل کرتے ہیں اور امام مالک، ابن ابی لیلیٰ، اور عثمان بتی رحمہم اللہ یہ کہتے ہیں کہ نکاح میں گواہ شرط نہیں بلکہ اعلان شرط ہے حتی کہ بچوں اور مجنونوں کے سامنے بھی نکاح کا اعلان کر دیا تو نکاح درست ہو گا اور اگر گواہوں کو یہ حکم دیا کہ وہ گواہی ظاہر نہ کریں تو نکاح درست نہیں ہوگا، (المبسوط، جلد 5، ص: 31، مطبوعہ: دار المعرفۃ، بیروت)''۔

صحتِ نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا شرط ہے، یعنی دو آزاد عاقل وبالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہے، اور مذکورہ صورت میں لڑکی کے والد نے نکاح پڑھایا اور گواہ کی صورت میں صرف ایک عورت (یعنی لڑکی کی والدہ) موجود تھی، گواہی کا نصاب مکمل نہیں، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: لان النکاح بغیر شھود فاسد لاباطل۔

ترجمہ: ''گواہوں کے بغیر نکاح فاسد ہے باطل نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص: 28، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

سوال میں بیان کردہ صورت سے واضح ہے کہ دوسرا نکاح ''ش'' سے تحلیل شرعی کی غرض سے پڑھایا گیا اور تحلیل شرعی کی بابت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز درمختار (جلد 5 ص: 34 تا 36، مطبوعہ بیروت) کی ایک عبارت کی تلخیص فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ''درمختار میں ہے: لاینکح مطلقة بالثلاث حتی یطأھا غیرہ بنکاح نافذ خرج الفاسد والموقوف، ترجمہ: ''تین طلاقوں سے مُطلّقہ عورت سے دوبارہ اس وقت تک نکاح نہیں ہوسکتا، جب تک دوسرا خاوند (شرعی طور پر) نافذ (اور مؤثر وصحیح) نکاح کے ساتھ اس عورت سے جماع نہ کرلے، صحیح اور نافذ نکاح کی قید سے نکاح فاسد اور نکاح موقوف خارج ہوگیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 423، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مذکورہ بالا میں جب نکاح صحیح طور پر منعقد ہی نہیں ہوا تو وہ عورت طلاق کا محل ہی نہیں بنی، لہٰذا طلاق کیسے مؤثر ہوگی؟، اور اس سے شوہرِ اوّل کے لئے حِلّت کیسے ثابت ہوگی؟۔ اس خاتون، اور اس کے ساتھ نکاحِ فاسد میں شریک شخص اور دیگر شرکاءِ معاملہ سب کو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔ اور ''تحلیلِ شرعی'' اب بھی

ازروئے قرآن ''زوجِ غیر'' کے ساتھ غیر مشروط نکاح اور پھر اس کا اپنی مرضی سے طلاق دینا اور عدت کا گزرجانا ضروری ہے۔

عنین کا حکم

سوال: 101

12 مئی کو میرے چھوٹے بھائی نوید کی شادی ہوئی لیکن شادی کے بعد سے اب تک وہ اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار نہیں کرسکا لڑکی والوں کا کہنا ہے کہ اب لڑکی کی شادی لڑکے کے بڑے بھائی سے کردی جائے اور وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ہم یہ چاہتے ہیں کہ لڑکی والے ہم کو وقت دیں تا کہ ہم اس کا علاج کرواسکیں لیکن لڑکی والے اس کے لئے تیار نہیں ہورہے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟ عدت سے متعلق کیا حکم ہے؟ اور کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟ ،(جاوید،اورنگی،کراچی)۔میری بیٹی کی شادی 12 مئی کو ہوئی اور لڑکا حقِ زوجیت ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔اس صورت میں ہم اس کے بھائی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔آیا عدت کرنا ہوگی یا کوئی کفارہ ہوگا؟،(محمد شریف،اورنگی،کراچی)۔

جواب:

جو شخص اپنی بیوی کے ازدواجی حقوق ادا کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اسے اصطلاحِ فقہ میں ''عنین'' کہتے ہیں۔

عبدالرزاق عن معمر عن الزهري عن سعيد بن المسيب قال: قضى عمر بن الخطاب رضي الله عنه في الذي لايستطيع النساء ان يؤجل سنة قال معمر: وبلغني انه يؤجل سنة من يوم ترفع امرها۔

ترجمہ:امام عبدالرزاق اپنی سند کے ساتھ سعید بن مسیّب سے روایت فرماتے ہیں:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسے شخص کے بارے میں کہ جو اپنی عورت پر (جماع کی) قدرت نہ رکھتا ہو، کے بارے میں فیصلہ فرماتے کہ اس کو ایک سال کی مدت دی جائے، معمر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ اس کو ایک سال کی مدت اس روز سے دی جائے گی کہ جس دن یہ معاملہ قاضی کے پاس پہنچا، (مصنف عبدالرزاق ،رقم الحدیث:10720)"۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

عورت بے موت یا طلاق جدا نہیں ہوسکتی اگر چہ مرد نامرد ہو، ہاں چارۂ کار حاکم شرعی کے یہاں دعویٰ ہے، وہ اس ثبوت لینے کے بعد کہ مرد اس پر قادر نہ ہو، مرد کو ایک سال کی کامل مہلت دے کہ اپنا علاج کرے، اس سال میں عورت مرد سے جدا نہ رہے اگر سال گزر جائے ،اور اب بھی قادر نہ ہو، عورت پھر دعویٰ کرے اور حاکم پھر ثبوت لینے کے بعد عورت سے پوچھے کہ تو اپنے شوہر کے پاس رہنا چاہتی ہے یا اپنے نفس کو اختیار کرتی ہے، اگر عورت فوراً بلا تاخیر کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا تو حاکم ان میں تفریق وجدائی کر دے، یہ تفریق طلاق ہوگی ،اور اب بعد عدت عورت دوسرے سے نکاح کر سکے گی ورنہ نہیں، یہ حکم عورت کی جانب ہے، رہا مرد، اسے حکمِ شریعت ہے کہ جب وہ عورت کا حق ادا نہیں کرسکتا تو اس پر فرض ہے کہ عورت کو طلاق دے دے ، نہ دے گا تو گنہگار و مستحقِ عذاب ہوگا۔ واللہ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ ، جلد:12،ص:488)"۔

سوال میں بیان کردہ واقعات اگر درست ہیں، تو شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی کو فی الفور طلاق دے دے، ورنہ وہ گنہگار ہوگا اور مستحقِ عذاب ہوگا اور شوہر کے گھر والوں کو چاہئے کہ وہ اسے برضا ورغبت طلاق دینے پر آمادہ کریں، اگر وہ اس کے باجود طلاق

دینے پر آمادہ نہ ہوتو پھر بیوی عدالت سے رجوع کرے اور عدالت شوہر کو ایک سال کا وقت دے، اگر وہ اس ایک سال کے دوران اپنی اہلیت مباشرت ثابت نہ کر سکے تو عدالت نکاح فسخ کردے گی اور عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہوگی، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

ہمیں حرمتِ مصاہرت سے متعلق دو سوالات موصول ہوئے

ترتیب وار پیشِ خدمت ہیں۔

حرمتِ مصاہرت زنا سے بھی ثابت ہوتی ہے

سوال: 102

میں ایک رات جلسے میں شرکت کرنے کے بعد کافی دیر سے گھر آیا تو سب گھر والے سو چکے تھے، میں اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے لائٹ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ معمول کے مطابق میری چارپائی کے ساتھ بیوی کی چارپائی ہوتی ہے۔ مجھے کچھ خواہش ہوئی جس کی وجہ سے میں نے اپنا ہاتھ بیوی کی طرف بڑھایا اور میں نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، بعد ازاں قمیص کے اندر بھی ہاتھ داخل کیا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ میں نے لائٹ لگائی تو فی الواقع وہ میری بیوی نہ تھی بلکہ میری ساس تھی جو بیوی کی جگہ لیٹی ہوئی تھی اور ساتھ میں میری بچی بھی سو رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے فوراً توبہ و استغفار کیا۔ میں نے حنفی علماء کرام سے اس مسئلے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہاری بیوی اب تم پر حرام ہے۔ خدارا آپ اس مسئلے کو مفصل و مدلل تحریر فرما کر میری پریشانی کا شافی حل بتائیے۔ میرے سب رشتے دار بڑے غصے میں ہیں، جو بھی حکم از روئے قرآن و حدیث ہے اس سے ہمیں اپنے فتویٰ کے ذریعے آگاہ فرمائیے، (محمد عبدالرحمٰن، بنوں، صوبہ سرحد)۔

جواب :

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول وفروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول وفروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمتِ مصاہرت کہتے ہیں۔ یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاُمَّھٰتُ نِسَآئِکُمْ وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ۔

ترجمہ: ’’(اور تم پر حرام کی گئی ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، (النسآء: 23)‘‘۔

قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح وطی کر لی گئی ہو اور شہوت کے ساتھ چھونا بھی وطی کے حکم میں ہے، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: و کما تثبت ھذہ الحرمۃ بالوطء تثبت بالمس والتقبیل والنظر الی الفرج بشھوۃ کذا فی الذخیرۃ۔

ترجمہ: ’’حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ’’ذخیرہ‘‘ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 275-274، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)‘‘۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (ولا فرق فیما ذکر) وبین اللمس والنظر

بشهوة بين عمد ونسيان وخطاء واكراه۔

ترجمہ: ''کسی عورت کوشہوت کے ساتھ چُھوا،یا (شرمگاہ کو نظرِ شہوت) دیکھا حرمت ثابت ہوجائے گی،اگر چہ یہ کام جان بوجھ کر کیا ہو،بھولے سے ہو،غلطی سے ہو یا زبر دستی کرایا گیا ہو،ہر صورت میں حرمت ثابت ہوجائے گی،(ردالمحتار علی الدرالمختار،فصل فی المحرمات،جلد 2 ص:306 مطبوعہ:مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:ثم لا فرق فی ثبوت الحرمة بالمس بین کونه عامدا أو ناسیا أو مکرها أو مخطئا کذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ: ''پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا چُھونا،خواہ (یہ فعل) جان بوجھ کر ہو،یا بھول کر ہو یا اس سے زبر دستی کرایا گیا ہو یا غلطی سے ہوا ہو،ہر صورت حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجائے گی،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1 ص:274 مطبوعہ:مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

لہٰذا جب بیوی کی ماں کو شہوت سے چھولیا تو بیوی اسی وقت حرام ہوگئی اور بیوی کی ماں تو پہلے سے ہی حرام تھی،اب دونوں ماں بیٹی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئیں کہ ان سے نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔متارکہ کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ اس شخص کے سوا جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے۔متارکے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر دو گواہوں کے سامنے کہے ''میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا وہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے''۔متارکہ کے بعد عدت شروع ہوگی۔

سوال: 103

میری خالہ دبئی سے آئی ہیں اور اپنی سگی بہن (میری والدہ) کے گھر پر ٹھہری ہیں۔میری خالہ کی ایک بیٹی ہے،میری امی نے خالہ سے میرے بھائی کے لئے ان کی بیٹی کا رشتہ کرلیا نکاح کے چھ سات مہینے باقی تھے اسی دوران خالہ اور بھانجے میں

صحبت (زنا) ہوگئی ۔لیکن بھائی اور خالہ نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا۔ خالہ بہت پرہیز گار اور پانچ وقتہ نمازی ہے ۔خالہ کی عمر 32 سال ہے اور بھائی کی عمر 18 سال ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں پتا تھا سات مہینے بعد جب لڑکی کے ابو دبئی سے آئے تو ہم سب نے مل کر منگنی اور نکاح کر دیا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی نکاح کے بعد لڑکی اور لڑکے کا آمنا سامنا تھا نکاح کے تین مہینے بعد لڑکا نے لڑکی سے صحبت کر لی ۔اسی دوران لڑکا اور لڑکی کی آپس میں لڑائی ہوگئی ماموں کے حوالے سے تو لڑکے نے غصے میں آ کر کہا ''میں تمہیں تین طلاقیں دیتا ہوں اگر تم ماموں کے سامنے گئی تو'' طلاق دینے کے بعد کہا کہ تمہیں سمجھ میں آئی کہ میں نے کیا کہا تیسری دفعہ بھی یہی کہا۔میری خالہ نے خالو کو میرے بھائی کے ساتھ زنا کی بات بتادی اور طلاق والی بات بھی بتادی، خالو نے غصے میں بیٹی کو ماموں کا سامنا کرا دیا ،کیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟،(ایک سائل، کراچی)۔

جواب :

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۔

ترجمہ: ''تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں ،اور تمہاری بیویوں کی مائیں ،اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، (النسآء:23)''۔

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، وہ اسباب جن کے سبب نکاح حرام ہے ان میں ایک قسم نسب ہے، محرماتِ نسبیہ میں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں شامل ہیں، ان سے نکاح کرنا، صحبت کرنا اور کسی قسم کا کوئی بھی شہوانی عمل کرنا دائما حرام ہے۔

دوسرا سبب حرمتِ مصاہرت ہے، یعنی مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول وفروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول وفروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمتِ مصاہرت کہتے ہیں۔ یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح وطی کر لی گئی ہو یا انہیں شہوت کے ساتھ چُھوا، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وكما تثبت هذه الحرمة بالوطئ تثبت بالمس و التقبيل و النظر الى الفرج بشهوة كذا في الذخيره۔

ترجمہ: ''حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرف شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ''ذخیرہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 275-274، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔ اب صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائل اس کے بھائی نے خالہ سے زنا کیا اور خالہ تو پہلے ہی حرام تھی اب اس کی اولاد بھی اس پر حرام ہوگئی، اور دونوں کا آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا، نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، تو طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یعنی جب وہ

خاتون اس لڑکے کے لئے محلِ نکاح ہی نہیں بنتی، تو اس کے ساتھ نکاح ابتداءً ہی منعقد نہیں ہوسکتا۔ پس وہ محل طلاق ہی نہیں ہے، کیونکہ طلاق تو نکاح کی بندش کو اٹھانے کا نام ہے، لہذا دونوں کو فوراً علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔

﴿کتاب الطلاق﴾

''دلالتِ حال'' نسبت طلاق کے لئے کافی ہے

سوال: 104

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تجھے طلاق دے دوں گا اور پھر کہا طلاق، طلاق، طلاق، آیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ (معرفت صاحبزادہ نورالعارفین صدیقی، آشٹن، اولڈھم، یو۔کے)۔

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق وقوع طلاق کے لئے نسبت شرط ہے اور نسبت یہ ہے کہ طلاق دیتے وقت شوہر اپنی بیوی کی زوجیت کا اظہار کرے، مثلاً یوں کہے کہ میری بیوی کو طلاق ہے یا بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے کہ اس کو طلاق ہے یا طلاق دیتے وقت بیوی کا نام ذکر کرے، جس طلاق میں نسبت نہ ہو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ نسبت کا صریح لفظوں میں پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اگر شوہر کی نیت طلاق کی ہو تو بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ولا یلزم کون الاضافة صریحة فی کلامه الخ۔

ترجمہ: ''کلام میں (بیوی کی طرف) نسبت کا صریح ہونا لازمی نہیں ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: لان دلالة الحال قائمة مقام النية الخ۔

ترجمہ: ''اس لئے کہ دلالتِ حال نیت کے قائم مقام ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:4، ص:338، 339 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

نسبت معنوی کی بنا پر وقوع طلاق کی مثالیں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں، شیخ الامام

محمد بن محمد بن شہاب المعروف ابن بزاز کردری حنفی متوفی 827ھ لکھتے ہیں: قال لها بعد الخلع من ساعته هرسه هرسه اخاف وقوع الثلاث وان لم توجد الاضافة لانه سبق ذکر الطلاق۔

ترجمہ: ''(شوہر نے) بیوی سے خلع کے بعد اسی وقت کہا: ''تین کی تین''، (اس میں) اگرچہ (بیوی کی طرف) نسبت نہیں پائی گئی، (پھر بھی) تینوں طلاق واقع ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ طلاق کا ذکر پہلے گزر چکا ہے''۔

اس کے بعد آگے چل کر لکھا: ''این زن که مراست دسه'' لا یقع وقال ابوبکر العیاض ان نوی یقع وقال الورشتنی رحمه الله طلقت امرأته لانه وجدت الاضافة فی اول الکلام۔

ترجمہ'' (شوہر نے کہا:) یہ جو میری بیوی ہے (اس کو) تین طلاق واقع ہوں، (تو طلاق) واقع نہیں ہوگی، اور ابوبکر عیاض نے کہا: (اگر شوہر نے) نیت کی ہے تو واقع ہوگی اور ورشتنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: اس کی بیوی کو طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ ابتدائے کلام میں نسبت ہے۔

اس سے پیشتر انہوں نے لکھا: وسئل احمد القلانسی عمن وکزا امرأته فقال" اینك یك "یقع طلاق ثم ذکر ثانیا وقال "اینك دو طلاق" وکذا فی الوکزة الثالثه، قال تطلق ثلاثاً الخ۔

ترجمہ: ''احمد القلانسی سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو مکا مار کر کہا: ''اس کو ایک'' تو ایک طلاق واقع ہوجائے گی، پھر دوبارہ ذکر کیا اور کہا: ''اس کو دو طلاق''، اسی طرح تیسری بار مکا مار کر کہا: ''اسے تین طلاق'' تو (احمد القلانسی) نے کہا: (اس کی بیوی کو) تین طلاق واقع ہوجائیں گی، (فتاویٰ بزازیہ برحاشیہ فتاویٰ عالمگیری

ج:4،ص:179، 172 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری سے دریافت کیا گیا: محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا، اس کی والدہ نے کہا کہ اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی مظفر نے کہا کہ طلاق دیتے ہیں پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا: طلاق، طلاق، طلاق بغیر مخاطب کرنے کسی کو، اب شرعاً صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔

جواب میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''تین طلاقیں ہوگئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی، (فتاویٰ رضویہ ج:12،ص 359، مطبوعہ رضا فاونڈیشن، لاہور)''۔

مولانا محمد امجد علی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک طویل سوال میں پوچھا گیا: ساس نے داماد سے کہا کہ یہ کمینہ پن ہے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح نہیں مارتا ہے، تم یہاں سے نکل جاؤ، (شوہر نے) یہ سن کر کہا: طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا، اس وقت زید کی بیوی اپنے چچا کے مکان کے سائبان میں تھی الخ۔

اس کے جواب میں علامہ امجد علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

اگرچہ زید کے ان الفاظ میں اضافت نہیں ہے اور وقوع طلاق کے لئے اضافت ضروری ہے مگر چونکہ ساس کے جواب میں کہا تھا، لہٰذا زید کے الفاظ کے یہی معنی متعین ہیں کہ تمہاری بیٹی کو طلاق الخ، (فتاویٰ امجدیہ، جلد: دوم، ص: 227، 228)۔

صورتِ مسئولہ میں شوہر کے کلام میں اگرچہ (بیوی کی طرف) نسبت صریحہ نہیں ہے، لیکن چونکہ پہلے شوہر نے طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، جیسا کہ خط کشیدہ

الفاظ سے ظاہر ہے ،لہٰذا اس قرینے کے پیشِ نظر صورتِ مسئولہ میں نیت معنوی پائی گئی اور مذکورہ خاتون کو تین طلاقیں واقع ہو گئیں ۔متکلم کی "دلالتِ حال" نیت کے قائم مقام ہے اور یہاں "دلالتِ حال"،الفاظِ طلاق کی ادائیگی سے پہلے،ارادۂ طلاق کا اظہار ہے۔

ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور طلاق

سوال: 105

میرے خاوند نے دو سال پہلے مجھے ایک طلاق دی اس کے بعد ہم نے رجوع کرلیا،پھر چھ ماہ بعد انہوں نے مجھے دوسری طلاق دی اور پھر ہم نے رجوع کرلیا اس کے چار ماہ بعد ایک بار جب پاکستان سے میرے بھائی اور بہنوئی نے مجھے موبائل پر فون کیا اور میری ان سے بات ہوئی ،جب میرے خاوند گھر آئے تو انہوں نے موبائل چیک کر کے پوچھا کہ کیا آج تمہارا پاکستان سے فون آیا تھا،(میں یہ بتاتی چلوں کہ کچھ جھگڑوں کی وجہ سے دونوں خاندانوں کی بول چال بند تھی،میرے خاوند کو بالکل پسند نہیں کہ میں یا وہ فون کریں اور دوسرا یہ کہ وہ بہت شکی ،اور وہمی طبیعت کے مالک ہیں)خیر جب میرے خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہاری بات ہوئی ہے تمہارے گھر والوں سے میں نے کہا کہ ہاں،انہوں نے کہا کہ کس کس سے ہوئی؟میں نے کہا کہ بھائی،بہن،امی سے ہوئی (یہ میں نے جھوٹ کہا تھا جبکہ میری بات صرف بھائی اور بہنوئی سے ہوئی تھی)پھر انہوں نے کہا کہ کیا بہنوئی سے بھی ہوئی،میں نے بات نہ واضح کرتے ہوئے کہا کہ شاید ہوئی ہو،کیونکہ مجھے ان کی طبیعت کا اندازہ تھا ،انہوں نے کہا "اچھا اگر توُ گل کیتی تے توُ میری بیوی نہیں"۔بقول میرے خاوند کے کہ یہ الفاظ میں نے طلاق کی نیت سے استعمال نہیں کئے۔بلکہ میرے دل میں یہ تھا

کہ بیویاں اپنے شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ اگر تم کو میری عزت کا خیال ہوا تو اگلی بار تم بات نہ کروگی۔ میں نے یہ مسئلہ جب Dues Bury England کے مفتی موسیٰ سے پوچھا! تو انہوں نے کہا کہ آپ کے شوہر سے بات کرنی پڑے گی کہ آیا ان کی نیت کیا تھی۔ پھر میرے خاوند نے کہا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دینی ہوتی تو جس طرح پہلی دونوں بار طلاق کا لفظ استعمال کیا اب بھی کرتا۔ خیر مفتی صاحب نے اجماع کر کے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ کیا معلوم اس وقت ان کی نیت کیا ہو۔ بہت پریشان رہتی ہوں۔ پر میرے خاوند بہت قسمیں اٹھاتے ہیں۔ اور مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ پھر اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے، اگر وہ غلط بیانی کرتا ہے۔ آپ میری صحیح رہنمائی کریں۔ میرے شوہر نے مجھ پر بہت گندے الزامات اور بہتان لگائے ہیں، اپنے گھر والوں کے کہنے پر اس کی حمایت اور تائید میرے خاوند نے بھی کی۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، اب 4 ماہ سے میں نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے، وہ بچوں سے ملنے آتے ہیں، پر نان نفقہ بالکل نہیں دیتے، کہتے ہیں کہ جب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، تو تم کیوں الگ رہتی ہو، وہ کہتے ہیں کہ کبھی مجھ کو طلاق نہیں دیں گے۔ چاہے دوسری شادی بھی کرلیں۔ اپنے خاوند کے بارے میں یہ بتاتی چلوں کہ دینی اعتبار سے نابلد ہیں۔ اور جھوٹے اور لالچی انسان ہیں، (یاسمین، معرفت محمود احمد، مکان نمبر 558، گلی نمبر 16 مرگلہ، اسلام آباد)

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع

صرف نظر کرنی چاہئے، خاص کر شوہروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر تمہاری بیویاں تمہیں پسند نہ آئیں تو صبر کا مظاہرہ کرو ممکن ہے کہ اس میں تمہارے لئے کوئی بہتری ہو۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیاء و یجعل اللّٰہ فیہ خیرا کثیرا (النساء:19)۔

ترجمہ:''پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بھلائی رکھے،اس تمہید کے بعد صورت مسئولہ میں شوہر پہلے دو طلاقیں دے چکا ہے، ازروئے شرع شوہر کو مزید صرف ایک طلاق دینے کا حق ہے، آئندہ کبھی اگر شوہر نے ایک طلاق دے دی تو بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جائے گی۔ استفتاء میں درج پنجابی کے خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:386 پر ہے:

ولوقال "توزن من نئی" لایقع ان نوی وھوالمختار

ترجمہ:''اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے تو میری بیوی نہیں ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگر چہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے''۔لہٰذا نکاح باقی ہے، عورت اگر شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو بشرطیکہ شوہر کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو تو ایسی عورت کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم نہیں ہے، عالمگیری جلد 1 ص:545 پر ہے:

وان نشزت فلا نفقة لھا حتی تعود الیٰ منزلہ الخ۔

ترجمہ:''اگر عورت مرد کی نافرمانی کرے تو مرد کے ذمہ اس کا خرچہ نہیں ہے، جب تک کہ وہ واپس اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر میں نہ رہے''۔

طلاقِ ثلاثہ کے بعد شوہرِ اول سے نکاح کا حکم

سوال: 106

آپ نے 18 جون کے دین ودانش ایڈیشن میں ایک سائل کے جواب میں مسئلہ طلاق کے ذیل میں بیان فرمایا کہ تین طلاقوں کے بعد عورت سابقہ شوہر سے نکاح نہیں کرسکتی اس کے علاوہ کسی بھی مرد سے نکاح کے سلسلے میں آزاد ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اگر تینوں طلاقیں دینے کے بعد میاں بیوی اپنے فیصلے پر پشیماں ہوں، اور بچوں وغیرہ کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے دوبارہ گھر بسانا چاہیں تو شریعت اس کا کوئی حل پیش کرتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے ضلع میں ایک واقعہ ہوا ہے کہ تین طلاقوں کی عدت گزرنے کے بعد اس عورت کا نکاح کسی نامعلوم مرد سے ہوا اور مباشرت کے بعد اس نے طلاق (تین بار) دے دی، اور اس کی عدت گزرنے کے بعد پھر پہلے مرد سے نکاح کردیا گیا، کیا قرآن وسنت میں ایسے کسی طریقے کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟، اگر نہیں تو ان لوگوں اور نکاح خواں کا یہ عمل کیسا ہے اور شریعت اس پر کیا حد لگاتی ہے۔ ایسا نکاح کرنے والے امام کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں اور مسجد میں اسے مستقل امام مقرر کیا جائے یا نہیں؟، برائے مہربانی جلد اخبار میں جواب سے نوازیں، (رشید احمد خان، دکان نمبر 147 پرانی لکڑ منڈی، منڈی بہاؤالدین)۔

جواب:

ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا ہوا ہے، یہ بات ہمارا خالق ومالک رب تبارک وتعالیٰ ہم سے بہتر جانتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء آیت نمبر 11 میں احکام وراثت بیان کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ لَکُمۡ نَفۡعًا ط

ترجمہ: ''تمہارے باپ اور تمہارے بیٹوں میں سے کون تمہارے نفع کے اعتبار سے تمہارے زیادہ قریب ہے؟''۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام قطعیت کے طور پر بیان کر دیے ہیں، ان میں ردو بدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے، طلاق کے حوالے سے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 229 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌ ۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ ۢ بِاِحْسَانٍ ط

''طلاق کی وہ صورت جس میں شوہر کو طلاق کے بعد اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کا حق حاصل ہے، وہ فقط دو (رجعی) طلاقیں ہیں، پھر (اس کے بعد اس کے پاس دو راستے ہیں) یا تو معروف طریقے سے (رجوع کر کے) اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے یا بھلائی کے ساتھ اس کا راستہ کھلا چھوڑ دے''۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ط

ترجمہ: ''اگر وہ (دو طلاق رجعی کے بعد ایک) طلاق (اور دے دے) تو اب (تین طلاق کے بعد) وہ مطلقہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ وہ عورت اس (سابق شوہر) کے علاوہ کسی اور شوہر سے نکاح کر لے''، پھر اگر وہ (زوج ثانی اپنی مرضی سے) اسے طلاق دے دے، تو (اس عورت اور اس کے سابق شوہر) دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر انہیں گمانِ (غالب) ہو کہ وہ (اب دوبارہ شروع ہونے والی اپنی ازدواجی زندگی میں) اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے، تو (عدت طلاق) گزرنے کے بعد لوٹ کر دوبارہ نکاح کر لیں۔ اس کے علاوہ ان کے رجوع کی حلال اور جائز ہونے کوئی صورت نہیں ہے۔

سوال: 107

میرے شوہر شاہنواز احمد خان نے گھریلو پریشانیوں سے تنگ آکر غصہ کرتے ہوئے لفظِ طلاق استعمال کیا، جھگڑا اس وجہ سے شروع کیا کہ پانچ ہزار کا مطالبہ کیا یہ کہہ کر کہ میں چلا جاؤں گا اور تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا۔ میں نے کہا میرے دل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس پر کہا کہ میرے دل میں تو ہے۔2جون 2006ء جمعہ کی رات تقریباً ساڑھے دس بجے غصہ کرتے ہوئے کہا کہ "میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں، میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں"، میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا۔ آیا مذکورہ صورت میں کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں؟ (ریحانہ بیگم، ماریہ اپارٹمنٹ نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائلہ اس کے شوہر کا یہ قول کہ "تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا" یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاءآت میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر (بصیغۂ حال) کہے کہ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں"، یا بصیغۂ ماضی کہے "میں نے تمہیں طلاق دی"، لہٰذا مذکورہ الفاظ "تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا" سے کوئی طلا

ق واقع نہیں ہوئی۔

پھر سائلہ کے بیان کے مطابق 2 جون، 2006ء کی شب سائلہ کے شوہر نے دو مرتبہ کہا کہ ''میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں'' ان الفاظ سے دو طلاق صریحہ واقع ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الطلاق مرتن ص فامساك م بمعروف او تسريح باحسان ط

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)''۔ شوہر چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہو کر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ سائلہ کے بیان کے مطابق ''میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا'' چونکہ یہاں طلاق کو فون کرنے اور دونوں بھائیوں کے آنے پر معلق کیا

تھااور شرط نہیں پائی گئی لہٰذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ، واللہ اعلم بالصواب۔

مذاکرۂ طلاق

سوال: 108

میری شادی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے جبکہ میری بیٹی تین ماہ کچھ دن کی ہے جب سے میری شادی ہوئی ہے گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے ، میرے بھائی اور بہنوں کے میری بیوی سے بہت اختلافات ہیں ابھی دو دن پہلے کی بات ہے صبح ناشتہ کے ٹائم گھر میں جھگڑا ہو گیا میری بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ مانی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حالت میں کئی بار طلاق طلاق طلاق کہتا رہا جبکہ میں نے دل سے طلاق نہیں دی بلکہ معاملہ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے کہا جبکہ سن کر میری بیوی رونے لگی اور سب گھر والے بھی رونے لگے میں نے اپنی بیوی کو تھوڑی دیر بعد کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور میں اپنی بیوی اور بیٹی کو سسرال چھوڑ کر آیا اور میں نے اس سے وعدہ لیا کہ اس جھگڑے کا کسی سے ذکر نہیں کروگی ، میں تمہیں دو چار دن میں کرائے کا گھر لے کر چلا جاؤں گا بلکہ میں اپنی اس حرکت شیطانی پر بہت شرمندہ ہوں ، (سہیل عمران ، الکرم اسکوائر بلاک 4 لیاقت آباد ، کراچی)۔

بیان زوجہ : میں مسماۃ خالدہ بنت ضیاء الحق حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ مورخہ 31 مئی 2006ء صبح کے وقت میرے اور میری نند کے درمیان گفتگو جھگڑے کی صورت اختیار کرگئی اور بات بڑھتے بڑھتے یہ ہوئی کے میرے دیور نے مجھے گالیاں

دیتے ہوئے میرے شوہر سے یہ کہا کہ آپ اسے طلاق دے دیں ہم آپ کی دوسری شا
دی کر دیں گے اور اس پر میرے شوہر نے ان کو ڈانٹا لیکن وہ بار بار طلاق دینے پر اصر
ار کرتا رہا، اس دوران انتہائی غصے میں میرے شوہر نے تین بار طلاق، طلاق، طلاق کہا
نہ مجھے مخاطب کیا اور نہ ہی میرا یا اپنا نام لیا، (خالدہ بنت ضیاء الحق)۔

جواب:

طلاق میں اضافت کا پایا جانا ضروری ہے خواہ وہ اضافتِ لفظی ہو یا معنوی ہو یا کسی ایسے کلام کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور تھی، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافة فی اللفظ فاقول علی ثلثة انحاء، الاول تحققها صریحاً فی کلام الزوج وهذا الذی ذکر الحلبی والطحاوی امثلته کقوله انت طالق او طلقتك او هذه او زینب او بنت زید او ام عمرو او اخت بکر او امرأتی طالق، الثانی تحققها فیه لاجل کونه جواباً لکلام تحققت فیه فتحقق فی الجواب ایضاً لان السوال معاد فی الجواب وهذا مافی الهندیة عن الخلاصة قالت طلاق بدست تو است مرا طلاق کن فقال الزوج طلاق می کنم و کرر ثلثا طلقت ثلثا اه۔

ترجمہ: ''یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے: اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے وہ یہ ہے جس کی مثالیں علامہ حلبی اور علامہ طحاوی نے یہ ذکر کی ہیں، مثلاً تو طلاق والی ہے، میں نے تجھے طلاق دی (بیو ی کو اشارہ کرتے ہوئے) اسکو، نام لے کر، زینب کو، زید کی بیٹی کو، عمرو کی ماں کو، بکر کی بہن کو، میری بیوی کو طلاق۔ دوسری صورت، یہ کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے

جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جوابا طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں ہندیہ میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے "طلاق تیرے ہاتھ میں ہے مجھے طلاق دے"۔ تو جواب میں خاوند کہے "میں نے طلاق دی" تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھ ت (فتاوی رضویہ جلد 12 ص: 345۔344 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا اس کی والدہ نے کہا کہ اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعاً صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟ جواب میں لکھتے ہیں:

"تین طلاقیں ہوگئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاوی رضویہ جلد 12 ص: 360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

صورتِ مسئولہ میں بر صدقِ بیانِ سائل اور حلفیہ اقرارِ زوجہ، صورتِ مسئولہ میں مذاکرۂ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ: طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے۔ آپ کے تحریری و زبانی بیان کے مطابق کہ "میرے بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ

مانی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حالت میں کئی بار طلاق طلاق طلاق کہتا رہا ''،آپ کا لفظِ طلاق کہنا آپ کے بھائی کے کلام کے جواب میں تھا،اسی کو اصطلاح فقہاء میں مذاکرۂ طلاق کہتے ہیں،لہٰذا تین طلاق مغلظہ واقع ہو گئی ہیں۔

تین طلاق کا حکم

سوال: 109

میں روبینہ انجم سبحانی بنت سبحان خان میری شادی محمد افسر سے 28مارچ 1986ء کو انجام پائی ہم دونوں فقہ حنفی سے تعلق رکھتے ہیں،10 سال پہلے میرے شوہر نے غصے میں آکر ایک ہی نشست میں مجھے کئی بار یہ لفظ ادا کیے ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں ہے،پھر وہ مکتبۂ اہلِ حدیث سے فتویٰ لے آئے کہ تین طلاق سے ایک ہی طلاق واقع ہوئی ہے ہم پھر ساتھ رہنے لگے،اس کے بعد وہ مجھ پر تشدد کرتے اور کہیں آنے جانے بھی نہیں دیتے،تالے میں مجھے بند رکھتے ،اس واقعہ کے 7 سال بعد انہوں نے 5مرد اور 7 خواتین کی موجودگی میں قبلہ رو ہو کر کلمہ پڑھا اور کہا ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں،میں تمہیں طلاق دیتا ہوں،میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔میرے چار بچے ہیں،بڑے بیٹے کی عمر 18 سال،12 سال کی ایک بیٹی،10 سال کا ایک بیٹا پھر 8 سال کی بیٹی،تین چھوٹے بچے میرے بغیر نہیں رہتے اور میرے ساتھ ہیں وہ (بچوں کے والد) کوئی خرچہ بھی نہیں دیتے اور تشدد کرکے بچے چھین کر لے جاتا ہے،قرآن وسنت کے حساب سے باپ پر بچوں کا خرچہ کیا بنتا ہے؟،(روبینہ انجم،روفی گرین سٹی بلاک 18 گلستانِ جوہر،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو دس

سال قبل جو تین طلاق دیں وہ مؤثر ہیں اور دیانۃً طلاق اسی وقت واقع ہوگئی ہے اور باوجود فقہ حنفی سے تعلق رکھنے کے، غیر مقلدین سے فتویٰ لینا محض ہوائے نفس کی پیروی اور جہالت ہے اور اس کے بعد جتنا عرصہ ساتھ گزارا وہ سب حرام اور زنا میں شمار ہوگا، آپ نے لکھا ہے کہ پہلی بار جب آپ کے شوہر نے تین طلاقیں دیں، تو اس کے گواہ نہیں ہیں، عنداللہ طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی، لازم نہیں ہے، آپ کے بقول آپ کے شوہر مسلک اہل حدیث سے فتویٰ لے آئے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی بار بھی تین طلاق دینے کا اقرار کرتے ہیں اور یہ اعتراف قضاءً طلاق کے لئے مؤثر ہونے کے لئے کافی ہے۔ بچوں کی کفالت اور پرورش کا حق اوّلاً ماں کو حاصل ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربیۃ الولد (تثبت للام)۔ ترجمہ: ''حق حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے، (جلد نمبر 5، ص: 203 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)''۔ اگر مطلقہ ماں کی عدّت ختم ہوچکی ہو اور وہ بچے کی پرورش پر اجرت کا تقاضہ کرے تو اجرت دینا باپ کے ذمّے واجب ہے، البتہ اگر وہ عدّت میں ہو تو یا غیر مطلّقہ ماں اجرت کا تقاضا کریں تو ایسی صورت میں وہ اجرت کا مطالبہ نہیں کرسکتیں۔ درمختار میں ہے:

(و تستحق) الحاضنۃ (اجرۃ الحضانۃ اذا لم تکن منکوحۃ ولا معتدۃ) لابیہ۔ ترجمہ: ''بچے کی پرورش کرنے والی عورت پرورش کرنے کی اجرت کی مستحق ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ بچے کے باپ کی منکوحہ نہ ہو اور نہ ہی وہ بچے کے باپ کی مطلّقہ معتدہ ہو، (جلد نمبر 5، ص: 209 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)''۔

بالغ بیٹا آزاد ہے چاہے ماں کے ساتھ رہے یا باپ کے ساتھ، نابالغ بچوں کی

نگہداشت کا حق ماں کو حاصل ہے اور ان کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، نفقہ باپ کی مالی حیثیت کے مطابق طے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وعلی المولود لہ رزقھنّ و کسوتھن بالمعروف ط لا تکلف نفس الّا وسعھا ج

ترجمہ: ''اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں کیا جائے گا، (البقرہ 233:)''۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

لینفق ذو سعۃ من سعتہ ط و من قدر علیہ رزقہ فلینفق ممّآ اٰتٰہ اللہ ط لا یکلف اللہ نفساً الّا مآ اٰتٰھا ط

ترجمہ: ''گنجائش والے کو چاہئے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے نفقہ دے جو اللہ نے اسے دیا اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے، (الطلاق:7)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

فتستحق النفقۃ(بقدر حالھما)، بہ یفتٰی، ویخاطب بقدر وسعہ والباقی دین الی المیسرۃ۔

ترجمہ: ''خاوند پر دونوں کی حیثیت کے مطابق نفقہ واجب ہوگا، اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، اور خاوند اپنی وسعت کے مطابق ادائیگی کا مکلّف ہوگا اور جو رقم باقی رہ جائے، تو وہ اس کے ذمہ قرض ہوگا، جس کو اپنی سہولت سے ادا کرے گا''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قال فی "البحر": واتفقوا علی وجوب نفقۃ الموسرین اذا کانا موسرین،

علی نفقة المعسرین اذا کانا معسرین، وانما الاختلاف فیما اذا کان احدهما موسرا والآخر معسرا، فعلی ظاهر الروایة الاعتبار لحال الرجل، فان کان موسرا وھی معسرة فعلیه نفقة الموسرین، وفی عکسه نفقة المعسرین۔ واما علی المفتی به فتجب نفقة الوسط فی المسألتین وھو فوق نفقة المعسرة ودون نفقة الموسرة۔

ترجمہ: ''''بحر'' میں ہے: سب کا اتفاق ہے کہ اگر دونوں خوش حال ہیں،تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ واجب ہوگا،اور اگر دونوں تنگ دست ہیں،تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ ہوگا، اور اختلاف صرف اس صورت میں ہے ،جب دونوں میں سے ایک امیر اور دوسرا غریب ہے، ظاہر روایت کے اعتبار سے مرد کے حال کا اعتبار ہوگا، پس اگر خاوند خوشحال ہو،اور زوجہ تنگ دست،تو ان پر خوشحالی کا نفقہ واجب ہوگا، اور اس کے برعکس ہو،تو تنگ دستی کا نفقہ واجب ہوگا، اور مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ درمیانہ نفقہ دونوں مسئلوں میں واجب ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ خوشحالی سے کم اور تنگ دستی سے زائد ہو'' .... آگے چل کر لکھتے ہیں:

ویؤیدہ قول ''البدائع'':حتی لو کان الرجل مفرطا فی الیسار یاکل خبز الحواری ولحم الدجاج والمرأة مفرطة فی الفقر تأکل فی بیت اھلھا خبز الشعیر یطعمھا خبز الحنطة ولحم الشاة ۔

ترجمہ: ''''بدائع'' میں ہے: اگر خاوند انتہائی خوشحال ہونے کی بنا پر صاف باریک آٹا اور مرغ کا گوشت کھاتا ہے اور بیوی انتہائی تنگ دستی کی بنا پر اپنے گھر والوں کے ہاں جو کی روٹی کھاتی ہے،تو خاوند اسے گندم کی روٹی اور بکرے کا گوشت نفقہ کے طور پر کھانے کو دیگا''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 226-225 مطبوعہ دار احیاء

التراث العربي، بیروت)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یقدر نفقتها بالدراهم والدنانیر علی أی سعر کانت بل یقدر بها علی حسب اختلاف الاسعار غلا ورخصا رعایة للجانبین کذافی البدائع۔

مفہوم:"نفقہ کا تعین اشیاء ضرورت کی مروجہ قیمت سے صرف نظر کر کے (ایک مستقل معیار کے طور پر) درہم و دینار (روپوں) سے نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہمیشہ اتنے ہی روپے دیئے جائیں، اس لئے کہ اشیاء ضرورت کی قیمتیں کم و بیش ہوتی رہتی ہیں) بلکہ (ہر دور میں) مہنگائی اور ارزانی کے اعتبار سے نفقہ کا تعین ہو گا تا کہ جانبین کی رعایت ملحوظ رہے۔ ارزانی وگرانی دونوں ادوار کے مصارف یکساں ں ہو سکتے، بلکہ گرانی میں اس کے لحاظ سے نفقہ کی مقدار بڑھائی جائے گی اور ارزانی میں کم کی جائے گی بدائع الصنائع میں بھی اسی طرح سے ہے، (فتاوی عالمگیری جلد 1 ص: 547 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

طلاق میں اضافت

سوال: 110

میرا ایک مسئلہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی میں گھریلو بات پر لڑائی ہوئی ۔بہت ہی شدید غصے میں لڑائی اسقدر بڑھ گئی کہ ہم دونوں ہوش وحواس کھو چکے تھے، اور میں نے شدید غصے میں اسے دو مرتبہ طلاق، طلاق کہا۔ نہ تو میں نے اپنی بیوی کا نام لیا اور نہ ہی یہ کہا کہ تجھے طلاق، اس طرح کی بات بالکل نہیں۔ صرف طلاق، طلاق کہا ۔میرے یہ الفاظ کہنے سے پہلے ہم دونوں کے درمیان گالیاں چل رہی تھیں اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے جب جھگڑا شروع ہوا تو اس وقت کہا تھا کہ مجھے علیحدگی چاہیے جس

وقت طلاق کے لفظ کہے اس وقت بدکلامی ہورہی تھی ۔اب ہم دونوں ہی بہت پریشان ہیں ہمارا ڈیڑھ سال کا بچہ ہے، براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں ہمارے اس مسئلے کا حل بتائیں،(فیصل خان، بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

طلاق میں اضافت ضروری ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافة فی اللفظ فاقول علی ثلثة انحاء، الاول تحققها صریحاً فی کلام الزوج وھذا الذی ذکر الحلبی والطحاوی امثلته کقوله انت طالق او طلقتك او ھذہ او زینب او بنت زید او ام عمرو او اخت بکر او امرأتی طالق، الثانی تحققها فیه لاجل کونه جواباً لکلام تحققت فیه فتحقق فی الجواب ایضاًلان السوال معاد فی الجواب وھذا مافی الھندیة عن الخلاصة قالت طلاق بدست تو است،مرا طلاق کن فقال الزوج طلاق می کنم وکرر ثلثا طلقت ثلثا۔

ترجمہ:''یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے:اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے اس کی صورت وہ ہے جو علامہ حلبی اور علامہ طحاوی نے ان الفاظ میں ذکر کی ہیں: مثلاً تو طلاق والی ہے،میں نے تجھے طلاق دی (یا بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے طلاق دی) یا بیوی کا نام لے کر کہا کہ (مثلاً اس کا نام زینب ہے) میں نے زینب کو طلاق دی،(یا اس کی کنیت کی نسبت سے کہا کہ) میں نے زید کی بیٹی کو یا عمرو کی ماں کو یا بکر کی بہن کو طلاق دی،یا یوں کہا میری بیوی کو طلاق۔دوسری صورت یہ ہے کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے

کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی، تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں فتاویٰ عالمگیری میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے "طلاق تیرے اختیار میں ہے مجھے طلاق دے" تو جواب میں خاوند کہے "میں نے طلاق دی" تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھ ت (فتاوی رضویہ جلد 12 ص: 345۔344 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا تو اس کی والدہ نے کہا کہ: اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعاً صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟

جواب میں لکھتے ہیں:

تین طلاقیں ہوگئیں، تحلیلِ شرعی کے بغیر اس کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاوی رضویہ جلد 12 ص: 360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل، چونکہ مذاکرۂ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ:

طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اسی کو اصطلاح فقہاء میں مذاکرۂ طلاق کہتے ہیں، لہٰذا دو طلاق واقع ہوگئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الطلاق مرتن ص فامساك م بمعروف او تسريح باحسان ط

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے ، (البقرہ 229)''۔

شوہر چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کرسکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کرسکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کرسکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا ہو تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، کیونکہ پہلے دی ہوئی طلاقیں رجوع کے باوجود آئندہ طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہتی ہیں، لہٰذا شوہر اول کے رجوع یا عقد ثانی کے بعد اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی، اسے انتہائی محتاط زندگی گذارنی ہوگی۔

بیوی کو مشروط طلاق دینا

سوال: 111

محمد اشرف نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہ الفاظ کہے ''اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے تم کو طلاق ہوگی''۔ اس کے بعد وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے اور ایک سال سے بیوی کا بھائی اس سے ملتا بھی ہے اس

کے گھر میں کھانا کھاتا اور رہتا بھی ہے بہن جاہل ہے وہ ضد سے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔محمد اشرف نے بیان دیا کہ "میں نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے اس کو طلاق ہوگی"۔اس بیان کے گواہ محمد اشرف کی ہمشیرہ اور ایک بہنوئی موجود ہیں۔معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت دونوں میاں بیوی کی کیا حیثیت ہے کیا وہ دونوں میاں بیوی رہے ہیں یا نہیں؟،(محمد عربی فورمین،کوئٹہ)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور شوہر (محمد اشرف) نے اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ کلمات کہے ہیں اور وہ ان کلمات کا اقرار کرتا ہے،تو جب پہلی بار بیوی نے بھائی سے بات کی تو اس پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی،اس کے بعد چونکہ وہ بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے،لہٰذا رجوع ہوگیا اور ان کا نکاح قائم ہے۔آئندہ شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا اختیار باقی ہے،اگر شوہر منکر ہے اور مدعی کے پاس چونکہ ایک مرد اور ایک عورت گواہ ہے لہٰذا اس سے نصابِ شہادت پورا نہیں ہوتا،بصورتِ انکار شوہر کو قسم دی جائے گی،یہ مسئلہ قضا یعنی عدالتی ثبوت کے اعتبار سے ہے،عنداللہ حقیقتِ حال اور دیانت پر فیصلہ ہوتا ہے۔

خلع اور حقِ حضانت

سوال: 112

میری بیٹی پانچ ماہ کی حاملہ ہے خلع ہونے کی صورت میں کیا بچے کی پیدائش سے پہلے اس کے ماں یا باپ کے پاس رہنے کا فیصلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔بچے کی ولادت کے بعد بچہ کتنے عرصے تک ماں کے پاس رہ سکتا ہے اور اس کے بعد شریعت کیا کہتی

ہے،(سید ارشاد علی، 23-x- عثمان گارڈن بلاک 13، گلستان جوہر، کراچی)۔

جواب:

بچے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش ونگہداشت کا حق بچے کی ماں کو حاصل ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

الحضانة للأم ------------ (ثم) أی عدم الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبی (أم الأم) وان علت عند عدم أهلية القربیٰ (ثم أم الأب وان علت) بالشرط المذکور ، وأما أم ابی الأم فتؤخر عن أم الأب بل عن الخالة أيضاً ۔

ترجمہ: ''بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے ------------ آگے چل کر لکھتے ہیں: ترجمہ: ''ماں فوت ہوجائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرلے جو بچے کے لئے اجنبی ہے تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا، اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو، پھر دادی کو اور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا، پھر نانا کی ماں، دادی بلکہ خالہ سے بھی موخر ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربیت الولد (تثبت للام) النسبية۔

ترجمہ: ''حق حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے، (جلد نمبر 5، ص: 203 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لڑکے کے حق پرورش کے متعلق لکھتے ہیں:

(والحاضنة) أما أو غيرهما (أحق به) أی بالغلام حتی يستغنی عن النساء

وقدر بسبع وبه يفتى لأنه الغالب۔

ترجمہ:’’پرورش کرنے والی ماں ہوں یا کوئی اوراس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہوجائے، جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اوراسی پرفتویٰ ہے، کیونکہ اکثرصورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔

لڑکی کی پرورش کے بارے میں لکھتے ہیں:

(الأم والجدة) لأم أو لأب(احق بها)بالصغيرة (حتى تحيض)اى تبلغ (وغيرهما احق بها حتىٰ تشتهى) وقدر بتسع وبه يفتى۔

ترجمہ:’’ماں اورنانی اوردادی لڑکی کےحیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی ہیں، (ان کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشتہاۃ (قریب البلوغ)ہونے تک ہےاوراس کی مدت کا اندازہ 9سال لگایا گیا ہے،اوراسی پرفتویٰ ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 5ص: 210 تا216 مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی، بیروت)‘‘۔

صورتِ مسئولہ میں بچے کی پیدائش کے بعد اگرلڑکا ہوتو سات سال،اورلڑکی ہوتو نو سال کی عمر تک ماں کے پاس رہیں گےاوراس کی پرورش کا خرچہ (جب تک وہ بچہ اپنی بقاءونگہداشت کیلئے ماں کی محتاج ہے) بچے کے باپ کے ذمے ہے،اور یہ خرچہ وہ اپنے مالی معیار کے مطابق دینے کا پابند ہوگا،اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:وعلى المولودلهٗ رزقهن و كسوتهن بالمعروف۔

ترجمہ:’’اورجس کابچہ ہے،اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اورپہننا ہے،(البقرۃ:233)‘‘۔

(وتستحق)الحاضنة(اجرة الحضانة اذا لم تكن منكوحة ولا معتدة)لابيه۔

ترجمہ:''بچے کی پرورش کرنے والی (ماں) اجرتِ حضانت کی حق دار ہے،بشرطیکہ نہ وہ کسی شخص کے نکاح میں ہواور نہ ہی اس (زیرنگہداشت) بچے کے باپ کی عدت (طلاق) میں ہو ،(جلدنمبر 5،ص: 209 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)''۔

طلاقِ بائن

سوال : 113

میرے شوہر نے مجھے دومرتبہ یہ کہا کہ میں نے تجھے آزادکیا،ابھی جب یہ مجھے چھوڑ کر گئےتو دوبارہ یہی الفاظ دہرائے وہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق کے الفاظ استعمال نہیں کئے اس صورت میں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے برائے مہربانی آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ دے دیجیے،(شہلاظفر،R-822 بلاک 14فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولو قال اعتقتك طلقت بالنية كذا فى معراج الدراية۔

ترجمہ:''اوراگر (خاوند) نے اپنی بیوی سے کہا:''میں نے تجھے آزادکیا''،اگر (یہ کلمات اداکرتے وقت) ان کی نیت طلاق کی تھی،تو ایک طلاق واقع ہوجائیگی،جیسا کہ معراج الدرایہ میں ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1ص: 376 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

یہ طلاقِ بائن کا کلمہ ہےاوراس کا دارومدار نیت پر ہے،عام فقہی قاعدہ یہ ہے کہ بائن

،بائن کولاحق نہیں ہوتی ہے،لیکن اگر ثانی کواوّل کی خبربنانا ممکن ہوتو ،ثانی سے اوّل ہی مراد ہوتی ہے،چونکہ شوہر نے''میں نے تجھے آزاد کیا'' کا کلمہ دومرتبہ متصلاً کہا ہے، اس لئے اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگی،اس کے بعد جب دوبارہ آپ کو چھوڑکر جاتے وقت یہی کلمہ اگر عدت کے اندر طلاق کی نیت سے کہا ہے،تو اس سے دوسری طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

اذا امکن جعلہ اخبارا عن الاول کانت بائن کانتِ بائنٌ بائنٌ او ابنتكِ بتطليقة فلا يقع لانہ اخبارٌ فلا ضرورة فی جعلہ انشاء بخلاف ابنتك باخری او انت طالق بائنٌ۔

ترجمہ:''طلاق بائن کو(دوسری) بائن لاحق نہیں ہوتی ،جبکہ دوسری کو پہلی کی حکایت وخبرقرار دینا درست ہو،جیسے شوہر یوں کہے،تو بائن ہے،بائن ہے یا یہ کہے کہ میں نے تجھے ایک طلاق بائن دی تو یہ دوسری بائن واقع نہیں ہوگی ،کیونکہ یہ پہلی ہی کی حکایت وخبر ہے۔تو اسے انشاء یعنی نئی طلاق قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے،ہاں اگر وہ کوئی ایسے کلمات کہہ دے،جنہیں پہلی کی خبرقرار دینا ممکن نہ ہو،تو وہ دوسری طلاق شمار ہوگی ،جیسے یوں کہے کہ: ''میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی،(ردالمحتار علی الدرالمختار،ج4ص:409-408،داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لا یلحق البائن البائن بان قال لھا انت بائن ثم قال لھا انت بائن لایقع الا طلقة واحدة بائنة لانہٗ یمکن جعلہ خبراعن الاول۔

ترجمہ:''طلاق بائن ،بائن کولاحق نہیں ہوتی ،مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا تو بائن

ہے،پھر اس سے کہا تو بائن ہے،تو اس سے ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگی ، کیونکہ دوسری کو پہلی کی حکایت وخبرقرار دینا ممکن ہے،(فتاویٰ عالمگیری ج 1 ص: 377 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

اور اگر شوہر کی نیت طلاق کی نہیں،تو یہ کلمات لغو ہوں گے اور کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی،لیکن اگر طلاق دیتے وقت شوہر کی نیت طلاق کی تھی،مگر بعد میں وہ منکر ہوگیا،تو قضاءً عدمِ وقوعِ طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

''تم تو میری بیوی نہیں ہو''،الفاظِ طلاق نہیں

سوال: 114

میرے شوہر نے آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے جھگڑے کے دوران غصے میں دو تین مرتبہ کہا''تم تو میری بیوی نہیں ہو''اس کے بعد میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارا میرا تعلق صحیح نہیں ہے،انہوں نے کہا: میں نے طلاق کی نیت سے نہیں کہا،آپ سے گزارش ہے کہ جلد میرے مسئلے کا حل کردیجئے،کہ مجھے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟۔(ایک دینی بہن،معرفت علامہ جمیل احمد نعیمی)۔

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد واتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے،ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرف نظر کرنی چاہئے،استفتاء میں درج خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی،صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔

ولوقال "توزنِ من نئی" لایقع ان نوی وھوالمختار۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو میری بیوی نہیں ہے،تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگر چہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے''۔لہٰذا نکاح باقی ہے،فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 386 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

مسئلہ طلاق

سوال: 115

میرا مسئلہ کچھ یوں ہے کہ 7 سال قبل میرے اور شوہر کے بیچ جھگڑا ہو رہا تھا کہ اتنے میں میرے شوہر نے کہا: ''چپ ہو جاؤ ورنہ کچھ بول دوں گا''۔بولوں ابھی ''طلاق''۔پھر بولوں! چپ ہو جاؤ، میں نے ان کو چپ کرایا، ہمارے بیچ کوئی طلاق کی بات نہیں چل رہی تھی اور نہ میں نے ان سے کبھی طلاق کا مطالبہ کیا۔پھر انہوں نے قرآن اٹھایا اور کہا: کہ میں یہ لفظ آئندہ نہیں بولوں گا۔اس کے تین سال بعد میرے شوہر نے پھر لفظ ''طلاق'' کہا، جھگڑے کے دوران ۔تب بھی کوئی مطالبہ یا کوئی بات طلاق کی نہیں چل رہی تھی، پھر ان سے میں نے کہا کہ ہمارے بیچ نازک رشتہ ہے اور دو بار آپ بول چکے ہیں،تو انہوں نے پھر قرآن اٹھایا اور کہا کہ آئندہ یہ لفظ نہیں بولوں گا۔میں نے یہی سمجھا کہ انہوں نے دو طلاقیں دیں یا دو بار بولا۔اور ان کو سمجھایا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال پھر انہوں نے کچھ مہینے قبل جھگڑے میں کہا کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔پھر میں نے کہا کہ اب ہماری ۳ ہو گئی ہیں اور میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں،تو انہوں نے کہا کہ یہ دوسری بار ہے،اس کے بعد میں اپنی امی کے گھر آ گئی ۔پھر میری ان سے فون پر بات ہوئی اور انہوں نے کہا کہ ''میں نے دے دوں گا'' کہا تھا اور وہ اللہ کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں۔بہر حال اب وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے صرف ایک طلاق دی ہے اور

ہم اب بھی میاں بیوی ہیں۔برائے مہربانی میرا مسئلہ قرآن وسنت کی روشنی میں حل کر دیجیے،تا کہ میں سکون سے رہ سکوں۔میری آخرت اور دنیا دونوں سرخرو ہوسکیں۔ ایک بات یاد رہے کہ میں نے ان سے ان تینوں موقعوں پر طلاق کی بات یا مطالبہ نہیں کیا،اچانک غصے کی حالت میں وہ یہ نکال دیتے۔اب وہ یہی کہتے ہیں کہ ایک طلاق ہوئی ہے۔فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دیجیے کہ ہمارا نکاح باقی ہے یا نہیں یا کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں۔(بشریٰ بنت اقبال،A-492،بلاک 3 گلشن اقبال،کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں متعدد احتمالات ہیں،جس کی وجہ سے علی التعیین ایک حکم بیان کرنا مشکل ہے،لہٰذا تمام احتمالات میں سے ہر ایک کا حکم حسب ذیل ہے:

پہلی مرتبہ شوہر نے یہ الفاظ کہے ’’بولوں ابھی طلاق‘‘ اور پھر کہا: ’’پھر بولوں‘‘،دوبارہ ’’پھر بولوں‘‘ کہنا اس بات کا قرینہ ہے کہ پہلی بار اس نے طلاق کی نیت کی ہے،لہٰذا ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔تین سال کے بعد جب دوبارہ شوہر نے لفظ طلاق بولا تو اس صورت میں بھی اگر اس نے یہ لفظ اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے بولا ہے،تو ایک اور طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔اور شوہر کا یہ کہنا ’’ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے‘‘ بظاہر اس بات پر قرینہ ہے کہ مذکورہ لفظ طلاق بہ نیت طلاق زوجہ کہا ہے۔لہٰذا مذکورہ خاتون کو ایک اور طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔شوہر کا یہ کہنا کہ طلاقِ رجعی کے بعد رجوع کرلیا جائے،تو وہ طلاق کالعدم ہو جاتی ہے،درست نہیں ہے،بلکہ وہ آئندہ طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے بدستور مؤثر رہتی ہے،تاہم دو طلاقِ رجعی کے بعد شوہر کو پھر بھی رجوع کا حق حاصل رہتا ہے۔شوہر نے جب تیسری بار ’’میں تجھے طلاق دیتا ہوں‘‘ کے الفاظ کہے تو اب یہ طلاق پچھلی دو طلاقوں کے ساتھ مل کر تین

طلاقیں ہو جائیں گی۔ لیکن اگر شوہر کہتا ہے کہ میں نے ''طلاق دے دوں گا'' کے الفاظ کہے تھے، تو بیوی سے گواہ طلب کئے جائیں گے، اگر گواہوں سے ثابت ہو جائے تو تیسری طلاق کا حکم لگا دیا جائے گا اور بیوی شوہر کے لئے حرام ہو جائے گی ورنہ شوہر کے انکار کی صورت میں قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہو گا اور اس صورت میں نکاح قائم رہے گا۔

مشروط طلاق

سوال: 116

میں نے مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے شوہر سید محمد طارق کو طلاق دینے کا نوٹس دیا تھا اور اس نوٹس کے جواب میں انہوں نے ایک خط تحریر کر کے روانہ کیا جس کی نقل منسلک ہے یہ خط مجھے 11 اگست 2006ء کو ملا۔ اس خط میں ایک طلاق کا ذکر ہے میں گذشتہ دو سال سے والدین کے ساتھ مقیم ہوں اور اس خط کے موصول ہونے کے بعد بھی اُس مقررہ تاریخ پر یا اس کے بعد شوہر کے گھر نہیں گئی اور تا حال والدین کے گھر میں رہ رہی ہوں، خط کی تحریر مندرجہ ذیل ہے:

ڈیئر ریشماں! السلام علیکم!

تم ایک طویل عرصے سے میکے میں بیٹھی ہو اور میرے بار بار بلانے پر بھی واپس نہ آئی اب میں تم کو حتمی طور پر کہتا ہوں کہ 14 اگست 2006ء یوم آزادی کے دن دوپہر بارہ بجے تک واپس آجاؤ ورنہ تم پر میری جانب سے پہلی طلاق نافذ ہو جائے گی اور اسی دن سے عدت شروع ہو جائے گی، دورانِ عدت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو آسکتی ہو وہ رجوع سمجھا جائے گا، ورنہ عدت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہو جائے گی، خیر اندیش طارق۔

مہربانی فرما کر اس خط کی شرعی حیثیت پر فتویٰ صادر فرمائیں۔
۱۔ کتنی مدت تک مجھے انتظار کرنا ہوگا کہ طلاق مکمل ہوجائے؟
۲۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور نوکری کرتی ہوں لہٰذا اس مدت کے دوران تو کوئی عدت نہیں کیونکہ مجھے نوکری پر جانا ضروری ہے۔
۳۔ اگر خاص مدت کے بعد خودبخود طلاق ہوجاتی ہے تو میرے پاس تو کوئی تحریر نہیں ہے کہ مجھے مکمل طلاق ہوگئی ہے شوہر کی جانب سے مکمل طلاق کی تحریر کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟، (ریشماں صدیقی، A-33/9 دستگیر سوسائٹی فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر سائلہ ریشماں صدیقی کا بیان درست ہے تو ان کے شوہر نے انہیں ایک مشروط طلاق دی تھی کہ اگر وہ 14، اگست 2006ء (یوم آزادی) کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس چلی گئیں تو فبہا، ورنہ ایک طلاق واقع ہوجائے گی، اور وہ 14، اگست 2006ء کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس نہیں گئیں، لہٰذا شرط کے مفقود ہونے پر یہ طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ دوسری بات جو شوہر (طارق) نے خط میں اپنی بیوی (ریشماں صدیقی) کو لکھی، یہ ہے کہ: ”دورانِ عدّت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو، آسکتی ہو، وہ رجوع سمجھا جائے گا، ورنہ عدّت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہوجائے گی“۔ سائلہ چونکہ 14، اگست 2006ء بارہ بجے دوپہر تک شوہر کے ہاں نہیں گئی، پس اس بنا پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی اور اسی تاریخ سے عدّت بھی شروع ہوگئی، عدّت شروع ہونے کے لئے کسی نیت یا خاص عمل کی ضرورت نہیں ہے، طلاق کے بعد عدّت ازخود شروع ہوجاتی ہے۔

پھر دورانِ عدّت نہ تو شوہر نے رجوع کیا اور نہ ہی بیوی خود شوہر کے پاس گئی، کیونکہ شوہر نے دورانِ عدّت اس کے واپس آجانے پر رجوع کو معلّق و مشروط کیا تھا۔لہٰذا عدّت کے گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہوگئی۔اب یہ خاتون (ریشماں صدیقی) باہمی رضامندی سے اپنے سابق شوہر کے ساتھ بھی نکاح کرسکتی ہے اور کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھی۔سابق شوہر کے ساتھ نکاح کی صورت میں خدانخواستہ اگر اس نے دوبارہ ایک یا دو طلاقیں دیں تو تجدیدِ نکاح کے باوجود یہ پہلی طلاق ان کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہے گی، یعنی نکاحِ ثانی کے بعد اگر اس نے ایک طلاق دی تو وہ اس پہلی طلاق کے ساتھ مل کر دو ہوجائیں گی اور اگر دو طلاقیں دیں تو وہ اس پہلی کے ساتھ مل کر تین ہوجائیں گی۔شرعی تقاضوں کے مطابق شوہر کا یہ خط ثبوتِ طلاق کے لئے کافی ہے، قانونی کارروائی اور طلاق کی توثیق کے لئے یو۔سی ناظم سے رجوع کریں۔

طلاقِ معلّق بالشرط

سوال: 117

گذشتہ چند ماہ سے گھریلو جھگڑے کی وجہ سے میری بیوی اپنے والدین کے گھر گئی ہوئی تھی، میں کئی مرتبہ لینے گیا لیکن بے سود رہا۔فون پر بات ہوئی، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر مُصر رہی، میں نے کہا کہ طلاق لکھ کر بھیج دوں؟، پھر ماں باپ کے پاس بیٹھی رہو گی۔اس نے جواباً کہا کہ میں پوری زندگی آپ کے ساتھ رہوں گی طلاق مجھے قطعاً نہیں چاہئے لیکن میری شرائط وہی ہیں۔شرائط سے اس کی مراد یہ ہے کہ میں اس کے والدین اور بھائیوں کے ماتحت رہوں اور گھر میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو۔جب کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی تو بقائمی ہوش وحواس اور

طبیعت میں سختی کے ساتھ طلاق دینے کی نیت سے میں نے یہ الفاظ کہے ''تین قبول کر''،اس کے بعد (میں نے غالبًا)،''طلاق قبول کرلو'' کے الفاظ کہے اور پھر میں نے فون بند کردیا۔ان الفاظ کی ادائی کے دوران بھی وہ اپنی بات پر بضد رہی شاید میری بات پر توجہ بھی نہیں دی اور میرے کہے ہوئے الفاظ شاید اس نے نہیں سنے اور میں نے اپنی بات کہہ کرفون بند کردیا۔گھر آکر میں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ میں نے اسے فارغ کردیا ہے،طلاق دے دی ہے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟،اگر ہوگئیں تو کتنی؟،(معرفت:سید مختار حسین شاہ،امام مسجد محلّہ جدون آباد،ہری پور،ہزارہ صوبہ سرحد)۔

جواب:

شوہر کا اپنی بیوی کوطلاق کی نیت سے یہ کہنا کہ:''تین قبول کر''۔یہ طلاق کنایہ کے الفاظ ہیں اور چونکہ نیت طلاق موجود ہے،اس لئے تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔اب تحلیل شرعی کے بغیر عدّت کے اندر اور عدّت کے بعد دونوں کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:ولو قال لھا: ثلاثہ دہ ونوی الطلاق،یقع۔

ترجمہ:''شوہر نے اپنی بیوی کوطلاق کی نیت سے کہا: تجھے تین دیئے،تو طلاق واقع ہوجائے گی،(فتاویٰ عالمگیری،جلد:1،ص:380)''۔

خلع

سوال:118

عرض ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز کی بیٹی کا نکاح تقریبًا ایک سال پہلے ہوا تھا اور ایک سال کے بعد رخصتی ہونا تھی لہٰذا گھریلو طور پر عورتوں میں کافی اختلافات

پڑ گئے جس کی وجہ سے خلع تک نوبت آ گئی لہٰذا اب کوئی صورت بات بنتی نظر نہیں آ رہی لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ خلع کی صورت میں شرعی کیا پہلو ہیں؟۔(حنیف شیخ بلالی، کراچی)۔

جواب:

خلع زوجین کی رضامندی سے ہوتا ہے، یعنی بیوی کچھ مال دے کر خلع حاصل کرے یا مطالبہ مہر سے دستبردار ہو جائے، اس سے طلاق بائن ہو جاتی ہے۔ مال کے بدلے نکاح زائل کرنے کو خلع کہتے ہیں۔ خلع میں عورت کا قبول کرنا شرط ہے اور اس کے الفاظ معین ہیں ان الفاظ کے علاوہ اور لفظوں سے خلع نہ ہوگا۔ خلع ایک طلاق بائن کے درجے میں ہوتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اگر زوجین خلع پر رضامند ہو جاتے ہیں تو چونکہ رخصتی تا حال نہیں ہوئی اور عورت غیر مدخولہ ہے لہٰذا اس پر عدت نہیں ہے۔

زوجِ مفقود الخبر

سوال: 119

میرے خاوند فاروق قیصر کوٹ لکھپت جیل لاہور میں بطور کانسٹیبل کام کرتے تھے۔ 1994 میں وہ صبح گھر سے اپنی ڈیوٹی پر گئے، گھر سے نکلتے ہی کچھ لوگوں نے انہیں اغوا کر لیا، شام تک میرے خاوند گھر واپس نہیں آئے تو ہم نے ان کے آفس (جیل) سے معلوم کیا، تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس دن ڈیوٹی پر نہیں آئے۔ ہم نے اس دن ہی ان کی اغوا کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں درج کرا دی تھی۔ پولیس نے بھی کافی عرصہ اس کسی کی تفتیش کی، مگر آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آج ان کے اغوا کو گیارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ عرض یہ ہے کہ میں اس وقت سے اپنے ضعیف والدین کے ساتھ رہ رہی ہوں، میرے تین

بچے ہیں، میرے والدین میری اور میرے بچوں کی اس دن سے کفالت کر رہے ہیں۔میرے والدین کب تک میرا ساتھ دیں گے۔ دراصل میں اپنا اب گھر بسانا چاہتی ہوں تا کہ باقی ماندہ زندگی باعزت اور شرعی طور پر گزرے۔میرے میکے والے بھی مجھے قبول نہیں کر رہے ہیں۔اور نہ میری کفالت کرنے کو تیار ہیں۔ان تمام حالات کے مدنظر میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تا کہ میں اپنا گھر بسا سکوں۔ان حالات کے تحت کیا میں دوسری شادی کرسکتی ہوں یا نہیں۔آپ سے درخواست ہے کہ میرے اس مسئلے کا حل بتایا جائے اور اس سلسلے میں ہماری شریعت کیا کہتی ہے، اور شریعت کی ہی رو سے فتویٰ دیا جائے،(نسیم فاروق،مکان نمبر 586/16فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

خاوند کے لاپتہ (مفقود الخبر)ہونے کی صورت میں امام ابو حنیفہ کا موقف:

علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں کہ:

واذاتم لہ ماۃ وعشرون سنۃ من یوم ولد حکمنا بموتہ وھذہ روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃوفی ظاھر المذھب یقدر بموت الاقران وفی المروی عن ابی یوسف بماۃ سنۃ وقدرہ بعضھم بتسعین والاقیس ان لا یقدر بشئی والارفق ان یقدر بتسعین واذا حکم بموتہ اعتدت امراتہ عدۃ الوفات من ذالک الوقت وقسم مالہ بین ورثۃ الموجودین۔

ترجمہ:’’امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جب مفقود (لاپتہ) کی زندگی کے ایک سو بیس سال پورے ہو جائیں گے تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا اور ظاہر مذہب یہ ہے کہ جب اس کے تمام معاصرین فوت ہو جائیں گے تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا۔امام ابو

یوسف سے نوے سال کی روایت ہے: بعض مشائخ حنفیہ نے بھی 90 سال مقرر کئے ہیں، زیادہ قیاس یہ ہے کہ وقت مقرر نہ کیا جائے۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ 90 سال مدت مقرر کی جائے اور جب اس کو مردہ قرار دے دیا جائے گا تو اس کی بیوی عدتِ وفات گزارے گی اور اس کا تر کہ وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، (ہدایہ اولین ص: 598، کتاب المفقود)"۔

امام ابوالحسن لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ لاپتا شخص کا نکاح یقین سے ثابت اور معروف ہے، اور غائب ہو جانا تفریق کو واجب نہیں کرتا اور اس کی موت مشکوک ہے اور یقین شک سے زائل نہیں ہوتا، اس لئے جب تک اتنی مدت نہ گذر جائے، جس میں اس کی موت کا یقین ہو جائے۔ اس وقت تک اس کو مردہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ اور عرف اور عادت میں ایک آدمی ایک سو بیس سال سے زیادہ نہیں رہتا یا اپنے تمام معاصرین کی موت کے بعد زندہ نہیں رہتا، اس لئے اس مدت کے گذرنے کے بعد اس کو مردہ فرض کر لیا جائے گا۔ علامہ ابن ہمام نے تخفیف کر کے اس مدت کو ستّر سال قرار دیا ہے۔

امام ابو حنیفہ اور مشائخ حنفیہ کی عبارات کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس لاپتا شخص کی بیوی کو اس کی عمر کے ایک سو بیس سال یا تمام معاصرین کی موت تک یا ستّر یا نوے سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کا اتنا مال اور تر کہ موجود ہو، جس کو اس کی بیوی ستّر یا نوے سال تک بیٹھ کر کھا سکے۔

سنن دار قطنی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امرأة المفقود امرأته حتى يأتيها البيان "لاپتا شخص کی بیوی اس کی بیوی قرار پائے گی جب تک کہ کوئی وضاحت نہ آ جائے یا کوئی خبر نہ آ جائے"۔ علامہ ابن

ہمام فرماتے ہیں،اس حدیث کی سند میں محمد بن شرجیل ایک ضعیف راوی ہے۔ابو حاتم نے کہا یہ شخص حضرت مغیرہ کی طرف منکر اور باطل روایات منسوب کرتا ہے۔ابن قطان نے کہا اس کا ایک راوی سوار بن مصعوب متروکین میں مشہور ہے اور اس سلسلہ میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار اور اقاویل متعارض ہیں۔

خاوند کے لاپتا (مفقود الخبر) ہونے کی صورت میں امام مالک کا موقف:

علامہ ابن سحنون مالکی نے امام مالک سے پوچھا آیا مفقود کی بیوی امام مالک کے قول کے مطابق حاکم کی اجازت کے بغیر بھی چار سال عدت گذار سکتی ہے؟امام مالک نے فرمایا:نہیں!امام مالک نے فرمایا:اگر مفقود کی بیوی بیس سال بھی انتظار کرتی رہے، اس کے بعد حاکم کے پاس اپنا مقدمہ پیش کرے تو حاکم اس میں غور وفکر کرے اور جس جگہ وہ شخص گیا تھا،وہاں اس کی تفتیش کرے اور جب اس کا پتا نہ چل سکے اور وہ مایوس ہو جائے تو پھر اس کو چار سال ٹھہرنے کا حکم دے۔امام مالک سے پوچھا گیا کہ چار سال ٹھہرنے کے بعد چار ماہ دس دن عدت گذارنے کے لئے بھی حاکم کی اجازت ضروری ہے یا وہ یہ مدت از خود بھی گذار سکتی ہے۔امام مالک نے فرمایا:ہاں اس کی عدت وفات کے ساتھ حاکم کا کیا تعلق ہے؟سحنون از ابن القاسم از امام مالک از یحیٰی بن سعید از سعید بن مسیّب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا جس عورت کا شوہر لاپتا ہو جائے،وہ چار سال انتظار کرے پھر چار ماہ دس دن عدت وفات گذارے اس کے بعد وہ نکاح کے لئے حلال ہو جائے گی۔

۶ ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ کو مفتی المالکیہ شیخ الجامع الازہر نے گیارہ معاشرتی مسائل میں امام مالک کے مذہب کی نصوص پر مشتمل ایک فتویٰ جاری کیا،جس کی جامع ازہر کے تمام علماء نے تصدیق کی ہے جن میں حنفی علماء بھی شامل ہیں۔اس فتویٰ کو مصر کی

وزارتِ اوقاف نے فتاویٰ اسلامیہ میں شائع کیا ہے۔اس فتویٰ سے پہلے علماءِ ازہر نے فقہ حنفی سے اس پر تصریحات پیش کی ہیں کہ ضرورت کے وقت دوسرے مذہب پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

صدرالا فاضل علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ "فتاویٰ امجدیہ" کے حاشیے میں، جو یاتو ان کا اپنا املا کرایا ہوا ہے اور یا ان کے تلمیذ رشید اور نائب خصوصی، مفتی اعظم ھند علامہ محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تحریر کردہ ہے: لیکن اگر شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے عورت دوسری شادی پر اتنی مجبور ہو جائے کہ دوسرا کوئی چارۂ کار نہ ہو حالتِ ملجیہ پیدا ہو جائے تو مذہب امام مالک رضی اللہ عنہ پر عمل کرنے کی اجازت ہمارے علماء نے بھی دی ہے۔خصوصاًاس دور پرفتن میں ہمارے علماء کاتقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس خصوص میں امام مالک رضی اللہ عنہ کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے ،مگراس خصوص میں چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں،اول یہ کہ مذہب امام مالک رضی اللہ عنہ یہ نہیں کہ شوہر کے غائب ہونے کے دن سے چار سال گزار کرشوہر کی وفات کا حکم دیا جائے ، بلکہ یومِ قضاء (یعنی جس دن قاضی لاپتا شوہر کی موت کا حکم لگائے) سے چار سال انتظار کرنا ضروری ہے، جیسا کہ فتاویٰ رضویہ ج ۵ ،ص ۵۰۰ پر کتاب مُدَوَّنہ کے حوالے سے مذکور ہے،دوسرے یہ کہ اس کے لئے قضائے قاضی شرط ہے ،درمختار میں ہے:انما یحکم بموتہ بقضاءٍ لانہ امر محتمل فمالم ینضم الیہ القضاء لایکون حجۃ۔

ترجمہ:شوہر کی موت کا حکم قضائے قاضی سے دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو دوسری جہت (زندگی) کا بھی احتمال رکھتا ہے،تو جب تک اس کے ساتھ قاضی کا فیصلہ نہیں ملے گا، یہ حجت نہیں ہوگا،(جلد:۳،ص:۳۳۱،کتاب المفقود ،

نعمانیہ)''۔اس زمانے میں جب کہ یہاں حاکمِ اسلام نہیں، علمائے بلد، جو مرجع فتویٰ ہوں، اس خصوص میں قاضی کے قائم مقام ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ امجدیہ دوم، ص: 91 مطبوعہ مکتبۂ رضویہ آرام باغ کراچی)''۔

مختصر یہ کہ انتہائی مجبوری کی حالت میں جب عورت کے لئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہوجائے، اسے خدشہ ہو کہ بشری کمزوری کی بناء پر وہ حرام میں مبتلا ہوجائے گی تو ایسے موقع پر امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے یا قاضی فیصلہ دے سکتا ہے۔ شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحات 1095 تا 1120 میں اس مسئلے پر مفصل ومدلل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ آثارِ صحابہ بھی اس سلسلے میں موجود ہیں اور چونکہ امام اعظم ابو حنیفہ نے اثرِ صحابہ کو اپنی اجتہادی رائے پر ترجیح دی ہے، اس لئے التزاماً مذہبِ حنفی کے مطابق بھی کہا جاسکتا ہے اور جیسا کہ امام مالک کے قول سے ثابت ہے اور صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا کہ وہ عورت جس کا خاوند مفقود الخبر (لاپتا) ہے، جب عدالت سے رجوع کرے گی تو قاضی اس کی تلاش کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے باوجود لاپتا رہنے پر اس کی وفات کا حکم دے گا اور اس وقت سے وہ عورت چار سال اور عدت وفات گزارنے کے بعد کسی دوسرے شخص سے عقد کرسکے گی۔

علامہ سعیدی نے اس امکانی صورت پر بھی بحث کی ہے کہ اگر ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد عورت کسی شخص سے نکاح کرلیتی ہے اور پھر تقدیرِ الٰہی سے وہ شخص واپس آموجود ہوتا ہے تو کیا کیا جائے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''جب مفقود لوٹ آئے اور یہ ظاہر ہوجائے کہ وہ زندہ ہے اور ابھی دوسرے شخص نے اس سے مقاربت نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کو مفقود کے زندہ ہونے کا پہلے علم تھا تو اب یہ مفقود کی زوجہ ہے، خواہ عقد

نکاح ہو چکا ہو،اور اگر دوسرے شوہر کو مفقود کی حیات کا علم تھا تو اس نے مقاربت کی ہو یا نہ کی ہو مفقود کے لوٹ آنے کے بعد وہ مفقود کی بیوی ہوگی ،اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مفقود، دورانِ عدت فوت ہوا ہے یا عدت کے بعد دوسرے نکاح سے پہلے فوت ہوا ہے یا عقد کے بعد مقاربت سے پہلے فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہوسکتی ہے اور اگر مقاربت کے بعد فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہوسکتی ہے اور اگر مقاربت کے بعد فوت ہوا ہے درآں حالیکہ دوسرے شوہر کو اس کی حیات کا علم نہیں تھا تو اب یہ وارث نہیں ہوگی۔(شرح صحیح مسلم جلد ثالث ص: 1107 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)''۔

تحریری طلاق نامہ لڑکی کو نہ ملے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے

سوال: 120

میری بیوی اور میرے درمیان کچھ اختلافات ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے میری بیوی ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی، تقریباً عرصہ دس ماہ گذر جانے کے بعد میں نے کافی اثر ورسوخ استعمال کیا، لیکن کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔اس کے بعد میں وکیل کے پاس چلا گیا، اپنا قصہ سنایا اور پھر اس کو طلاق کا نوٹس تیار کرنے کو کہا۔ وکیل نے تین طلاق کا نوٹس تیار کر دیا اور میں نے طلاق نوٹس کی ایک کاپی سسرال والوں کے پتہ پر بھیج دی۔اور ایک کاپی یونین کونسل کے پتا پر روانہ کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں کاپیاں الگ الگ مجھے مل گئیں، جو وصول نہ ہوئی تھیں، اور نہ ہی ان پر دستخط موجود تھے، اس کے بعد میں نے ایک جرگہ بٹھایا اور پوچھا کہ آپ کو میری طرف سے طلاق کا نوٹس ملا کہ نہیں، جس پر سسرال والوں نے جواب دیا کہ نہیں ملا۔اور میں نے طلاق کا نوٹس مورخہ 26 اپریل 2005ء کو دیا تھا اور ابھی تقریباً چھ ماہ ہو چکے

ہیں۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا طلاق ہوگئی ہے یا نہیں ہوئی ؟مہربانی فرما کر قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے ،میرے دو بچے ہیں،اور میری بیوی بھی دوبارہ میرے ساتھ بخوشی زندگی گذارنا چاہتی ہے،کیا طلاق مؤثر ہے یا غیر مؤثر؟،(محمد یعقوب، تحصیل حاصل پور ضلع بہاولپور)۔

جواب:

کتب فتاویٰ میں یہ مسئلہ درج ہے کہ اگر کسی شخص نے کاتب یا وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو اور اس نے لکھ دی تو طلاق واقع ہو جائے گی،جیسا کہ فتاویٰ شامی میں ہے:ولو قال للکاتب: اکتب طلاق امرأتی کان اقرارا بالطلاق وان لم یکتب۔

ترجمہ:"اور اگر اس (شوہر) نے کاتب سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو تو یہ طلاق کا اقرار ہے،خواہ کاتب نے لکھا نہ ہو(تب بھی طلاق واقع ہو جائے گی)، (ردالمحتار علی الدر المختار،ج4 ص: 337مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)"۔

چونکہ آپ نے اپنی مرضی سے وثیقہ نویس سے اپنی بیوی کے نام تین طلاقیں لکھوائیں اور اس طلاق نامے پر دستخط کردیے،تو اسی وقت طلاق واقع ہوگئی، طلاق کے مؤثر ہونے کے لئے بیوی کو تحریری طلاق نامے کا ملنا ضروری نہیں ہے،جس وقت طلاق نامے پر دستخط ہوئے ،اسی وقت سے عدت بھی شروع ہوگئی ،اب آپ کا اپنی بیوی سے کوئی تعلق باقی نہیں ہے،فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

طلاقِ مغلظہ کے بعد تعلقات

سوال: 121

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ ایک میرے قابلِ احترام بنام مولانا علامہ فتح محمد ولد نظام دین ساکن نئ آبادی کھرالہ تحصیل وضلع جہلم کے رہائشی نے دو شادیاں کی ہوئی ہیں، دوسری شادی 1982ء کو ہوئی تھی۔اس عورت کو کچہری میں جا کر 50 روپے والے اشامپ پیپر پر لفظ طلاق۔طلاق۔طلاق لکھ کر (جس طلاق نامے کی فوٹو کاپی ساتھ ارسالِ خدمت ہے) طلاق دے دی اور بمطابق قانونِ پاکستان ایک طلاق نامہ جو کہ اصل تھا، مطلقہ بیوی کو ارسال کر دی۔اب جس عورت کو طلاق دی گئی ہے، وہ عورت طلاق نامہ وصول کرنے سے انکاری ہے اور محترم طلاق دینے والے بزرگوار ماشاءاللہ دینِ خداوندی پر عبور حاصل ہے دونوں یہ کہتے ہیں کہ طلاق اگر وصول نہ کی جائے تو طلاق نہیں ہوتی اور یہ دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں اور ایک ہی جگہ پر رہائش پذیر ہیں۔

جناب عالی! اسلام کی روح سے ان قابلِ احترام بزرگوار کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس طلاق شدہ عورت کے بارے میں کیا احکاماتِ خداوند ہیں، جناب فتویٰ صادر فرمایا جائے تاکہ باقی اس گھر میں رہنے والے فریق خدا کے غضب سے بچ سکیں، (شاہد محمود ولد مولانا فتح محمد،نئ آبادی کھرالہ تحصیل وضلع جہلم)۔

جواب:

ہمیں مذکورہ بالا استفتاء کے ساتھ شوہر کا اشامپ پیپر تحریری طلاق نامہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی منسلک کرکے ارسال کی گئی ہے جس پر شوہر فتح محمد صاحب اور دو گواہوں محمد ناصر اور حافظ سجاد حیدر کے دستخط بھی ثبت ہیں اور سید صفات احمد شاہ (

اوتھ کمشنر) نے اپنے دستخطوں اور مہر کے ساتھ اس کی توثیق کی ہے ،لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ شوہر نے اپنی بیوی کا نام لے کر تین دفعہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر طلاق دے دی ہے، اس لئے طلاق واقع ہوگئی۔ وقوعِ طلاق کے لئے بیوی کا طلاق نامے کو وصول کرنا ضروری نہیں ہے، بس جس وقت شوہر نے طلاق نامے پر دستخط کئے، طلاق اسی وقت سے مؤثر ہوگئی اور عدت بھی شروع ہوگئی اور طلاق مغلظہ ہونے کی بنا پر ان کا عدت کے اندر یا عدت کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، تاہم یہ مطلّقہ خاتون عدت اسی سابق مُطلِّق شوہر کے مکان میں گذاریں گی ،ایامِ عدت کا نفقہ بھی شوہر کے ذمے ہوگا، لیکن دورانِ عدت بھی اس طلاق دینے والے شوہر اور اس طلاق یافتہ عورت کا آپس میں معاملہ اجنبی والا ہوگا، ستر وحجاب کی پابندی ہوگی ، الگ رہنا ہوگا۔ اس طلاقِ مغلظہ کے بعد ان کا آپس میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے ،زنا کے زمرے میں آئے گا ،انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے اور اس محلے یا بستی کے لوگوں کو انہیں اس پر متوجہ کرنا چاہئے ،اگر وہ اس کے باوجود باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ (Sociol Boycott) کرنا چاہئے ، البتہ چونکہ مطلّقہ خاتون اسی مُطلِّق شوہر سے صاحبِ اولاد ہیں ،ان کے پانچ جوان بچے ہیں، لہٰذا ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ اگر وہ یا ان کی اولاد مالی استطاعت رکھتے ہیں تو وہ اپنی اولاد کے ساتھ الگ مکان میں رہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)، لیکن اگر ان کی اور ان کی اولاد کی اتنی مالی استطاعت نہیں ہے اور سابق طلاق دینے والے شوہر کا مکان اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شرعی ستر وحجاب کی پابندی کو قائم

رکھتے ہوئے اجنبی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اور شوہر اپنی اولاد کی ماں ہونے کی حیثیت سے انہیں اس کی اجازت دیتا ہے تو پھر وہ وہاں اپنی اولاد کے ساتھ رہ سکتی ہیں، لیکن یہ امر واضح رہے کہ شرعاً وہ ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ اجنبی رہیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ثبوتِ طلاق کے طریقے

سوال: 122

میرا نام اسماء بیگم ہے، میرے شوہر محمد حماد نے مختلف مواقع پر مجھے تین طلاقیں دیں ان الفاظ کے ساتھ "میں نے تمہیں طلاق دی" اور طلاق کا کوئی گواہ نہیں ہے، اب میرا شوہر مجھے اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہتا ہے، اس بارے میں مجھے آپ اپنے فیصلے سے نوازیں، (اسماء بنت محمد امین شیخ، L-505 سیکٹر 5/B-2 نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو جو تین طلاقیں دی ہیں، وہ مؤثر ہیں اور دیانۃً طلاق اسی وقت سے واقع ہوگئی اور آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر نے جو تین طلاقیں دی ہیں تو اس پر کوئی گواہ نہیں ہے، عنداللہ طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی، لازم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: "پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی

دے دے،تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کر لے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کر سکتی ہے)، (البقرۃ:230)"۔ وقوع طلاق کے بعد آپ کے شوہر کا آپ کو تحلیل شرعی کے بغیر رکھنے کا ارادہ، گناہ پر جسارت ہے اور ایک گونہ اس پر اپنے قلبی اطمینان کا اظہار ہے۔

لیکن قضاءیعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق طلاق کی مُدَّعِیَہ ہے مگر شوہر منکر ہے،تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

عن عمرو بن شعیب، عن ابیہ، عن جدہ: ان النبی ﷺ قال فی خطبتہ: "البیّنہ علی المُدّعی والیمین علیٰ المدعی علیہ"۔

ترجمہ: "عمر ابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے،تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1339)"۔

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے،تو اسے قسم دی جائے گی۔ اور اس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی

بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے،تو وہ گنہگار رہے،اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا،اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

طلاق غیر مدخولہ

سوال: 123

میرا نکاح ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء میں فرقان احمد خان کے ساتھ ہوا تھا،میرا نام عائشہ حیدر خان ہے،فرقان احمد خان جو کہ میرے شوہر تھے،انہوں نے اپنی والدہ کے دباؤ میں آکر مجھے طلاق کا نوٹس بھجوا دیا ہے،جس میں تین بار طلاق کا لکھا ہوا ہے،اور ان کے دستخط ہیں،میری رخصتی نہیں ہوئی تھی،میں اپنے گھر میں ہی ہوں اور وہ اپنے گھر میں اب آپ مجھے اس کا فتویٰ دے دیجئے کہ آیا میرا نکاح فرقان احمد خان سے دوبارہ ہوسکتا ہے؟اور اس کی کیا مدت ہے؟اور پرانا نکاح ابھی تک برقرار ہے یا نہیں؟اور میں نے اپنے نکاح کا مہر بھی نہیں لیا ہے،اس صورت میں کیا طریقہ ہے؟قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیجئے۔(عائشہ حیدر،R-770/16 ایف بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:اذا طلق الرجل امراتہ ثلاثا قبل الدخول بھا وقعن علیھا فان فرق الطلاق بانت بالاولیٰ ولم تقع الثانیة و الثالثة۔

ترجمہ:”اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہوجاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاق بائن ہوجائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی،(عالمگیری جلد اول

ص:373)"۔

صورت مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائلہ چونکہ ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی اور خلوت صحیحہ (دونوں میاں بیوی کا تنہائی میں جمع ہونا) بھی نہیں پایا گیا اور شوہر نے تین طلاق (منسلکہ طلاق نامہ میں) علیحدہ علیحدہ دی ہیں لہٰذا پہلی طلاق سے ہی نکاح ختم ہوگیا اور دوسری دو طلاقیں واقع نہیں ہوں گی، اس لئے کہ غیر مدخولہ (جس کے ساتھ مباشرت نہ کی گئی ہو) کو طلاقِ رجعی نہیں ہوتی بلکہ ایک طلاق دینے سے بھی بائن ہو جاتی ہے اور طلاق بائن دینے کے بعد وہ عورت محلِ طلاق نہیں رہتی، اس لئے طلاق کے دوسرے الفاظ لغو ہو جاتے ہیں، اس صورت میں یہ شوہر دوبارہ نکاح کر سکتا ہے، عدت اور تحلیلِ شرعی کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: یاایھا الذین امنوا اذانکحتم المؤمنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن فمالکم علیھن من عدۃ تعتدّونھا ج

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب: 49)"۔

مگر پہلے والے نکاح میں جو مہر مقرر ہوا تھا، شوہر پر واجب ہے کہ آدھا مہر عورت کو ادا کرے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وان طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن وقد فرضتم لھن فریضۃ فنصف مافرضتم۔

ترجمہ: "اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ: 237)"۔

تحلیلِ شرعی کے لئے شخصِ غیر کی قید

سوال : 124

میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے میں پھر اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور حلالہ کرنا چاہتا ہوں حلالہ غیر مرد کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا میں اس وقت اس کے لئے غیر مرد ہوں کیا یہ کام میں خود کرسکتا ہوں؟۔(انیس محمد،لیاقت آباد،کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ:''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دی،تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے۔پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے،تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں،(البقرۃ:230)''۔

تحلیلِ شرعی کے لئے آیت میں''غیــــرہ''،''ہ''ضمیر مذکر ہے،جس سے مراد زوجِ اوّل کے علاوہ دوسرا شخص ہے،آپ حلالے کے متعلق نہ سوچیں۔

حدیث مبارک میں ہے:عن عبداللہ بن مسعود قال: لعن رسول اللہ ﷺ المحلّل والمحلّل لہ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر(بشرطِ تحلیل) رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی،(سنن ترمذی رقم الحدیث:1120)''۔

طلاق ہوئی یا نہیں؟

سوال : 125

میرا میری بیوی سے جھگڑا ہو رہا تھا اس دوران اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے طلاق دے دو، میں نے جواب میں کہا کہ ''تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا، طلاق دوں گا''۔ میں حلفیہ کہنے کو تیار ہوں کہ میں نے یہی الفاظ کہے تھے، اور میں نے آئندہ کے لئے کہا تھا فی الحال میں نے طلاق نہیں دی، جبکہ میری بیوی کہتی ہے کہ اس نے مجھے طلاق دی ہے۔ آیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟، (عبدالرحیم ،گلستانِ جوہر بلاک 13 کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئولہ میں بر صدقِ بیانِ سائل شوہر کے الفاظ ''تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا، طلاق دوں گا'' سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ چونکہ آپ کے ادا کردہ تمام الفاظ ارادۂ طلاق کو ظاہر کرتے ہیں اور ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے ۔لہٰذا ان تمام الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق کی مُدّعیہ ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:عن عمرو بن شعیب ، عن ابیہ، عن جدہ: ان النبی ﷺ قال فی خطبتہ : "البیّنہ علی المُدّعی والیمین علیٰ المدعی علیہ"۔

ترجمہ: ''عمر بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعٰی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)"۔یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعٰی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم دی جائے گی۔اوراس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اوراس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

جبری طلاق کی ایک صورت

سوال: 126

ہم نے اپنی بہن کا نکاح ایک جگہ کیا اور سوچا کہ رخصتی کچھ عرصے بعد کریں گے اس رشتے سے ہمارے اور لڑکے کے گھر والے سب خوش تھے، لیکن ہمارے کچھ رشتے دار جنہوں نے اس نکاح سے پہلے ہم سے بہن کا رشتہ مانگا تھا جو ہم نے کسی وجہ سے قبول نہ کیا ان لوگوں کو اس نکاح پر اعتراض تھا انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ نکاح ٹوٹ جائے لڑکی کو اغوا کرنے کی دھمکی بھی دی اور یہ بھی کہا کہ لڑکے کو قتل کردیں گے۔ان لوگوں نے دس بارہ افراد کا ایک گروپ بنا کر لڑکے کو گھیر لیا اس وقت ان کے پاس ہتھیار بھی تھے جس کے دم پر انہوں نے لڑکے سے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کروالیا اور کہا کہ اب منہ سے بھی بولو کہ میں نے طلاق دی۔لڑکے نے انکار کردیا جس پر

انہوں نے مار پیٹ شروع کردی آخر کار لڑکے کے منہ سے بھی بلوالیا، طلاق کے الفاظ یہ تھے، (میں نے علی گوہر وگن کی بیٹی شازیہ کو طلاق، طلاق، طلاق دی)۔ کیونکہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ نہ کہتا تو اسے واقعی قتل کردیا جاتا۔ اب اس طلاق کو نہ تو لڑکا قبول کررہا ہے اور نہ ہی لڑکی، معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں؟، (وقار احمد وگن، D-33 پی ٹی سی ایل کالونی جناح ہسپتال)۔

جواب:

اصولی طور پر فقہ حنفی میں "طلاق مکرَہ" (یعنی جس سے جبراً طلاق دلائی گئی ہو) معتبر ہے، البتہ اگر "اکراہ تام" یا "اکراہ مُلجی" ہو، یعنی ایسی ضرب شدید جس میں جان یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ ہو، جیسے آج کل بندوق کی نوک (Gun Point) پر دھمکی دی جاتی ہے، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دھمکی پر عمل کرلے گا تو اسے "اکراہ مُلجی" یا "اکراہِ تام" کہتے ہیں۔ ایسے "اکراہِ ملجی" کی صورت میں ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر جبر کرکے تحریراً طلاق لے لی جائے تو وہ مؤثر نہیں ہوگی، لیکن اگر جبر کرکے زبانی طلاق دلوادی جائے تو وہ مؤثر ہوجائے گی۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی "البحر" أن المراد الاكراه علی التلفظ بالطلاق، فلو أكره علی أن يكتبَ طلاق امرأته فكتب لا تُطلّق، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا، كذا فی "الخانية" ولو أقر بالطلاق كاذباً أو هازلاً وقع قضاءً لا ديانة۔

ترجمہ: "اور "البحرالرائق" میں ہے کہ "اکراہ" سے مراد یہ ہے کہ لفظاً طلاق دینے پر مجبور کردیا گیا ہو، اگر (شوہر) کو مجبور کردیا گیا ہو کہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ دے، پھر اس

نے (بامر مجبوری) لکھ دیا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ تحریر اس وقت طلاق لفظی کے قائم مقام ہوتی ہے، جب اس کی حاجت ہو اور یہاں اسے حاجت نہیں ہے، (کیوں کہ وہ خود اپنی مرضی سے طلاق نہیں دینا چاہتا)، ''خانیہ'' میں اسی طرح ہے، اور اگر شوہر نے (اپنی بیوی کو) جھوٹ کے طور پر یا بطورِ مذاق طلاق دینے کا اقرار کیا، تو طلاق قضاءً واقع ہو جائے گی (یعنی اگر معاملہ عدالت میں گیا تو عدالت وقوعِ طلاق کا فیصلہ دے گی، کیوں کہ عدالتوں میں معاملات کا فیصلہ ظاہری قرائن وشواہد پر ہوتا ہے، نیتوں پر نہیں ہوتا، جب کہ عنداللہ نیت کا اعتبار ہوگا)، (مگر) دیانۃً نہیں ہوگی، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد: 4، ص: 324 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: کہ ایک شخص نے کسی کے جبر وظلم سے محض ناچار و مجبور ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاقنامہ لکھ دیا تو اس صورت میں طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔

آپ نے جواب میں لکھا کہ: طلاق بخوشی دی جائے خواہ بجبر، واقع ہو جائے گی۔ نکاح شیشہ ہے اور طلاق سنگ، شیشہ پر پتھر خوشی سے پھینکے یا جبر سے یا خود ہاتھ سے چھٹ پڑے شیشہ ہر طرح ٹوٹ جائے گا، مگر یہ زبان سے الفاظ کہنے میں ہے، اگر کسی کے جبر واکراہ سے عورت کو خطرہ میں طلاق لکھی یا طلاق نامہ لکھ دیا اور زبان سے الفاظِ طلاق نہ کہے تو طلاق نہ پڑے گی۔ تنویر الابصار میں ہے: ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو مکرَھا او مُخطئا وفی رد المحتار عن البحر ان المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق، فلو أُکرہ علی أن یکتب طلاق امرأتہ فکتب لا تطلق، لأن الکتابۃ أقیمت مقام العبارۃ باعتبار الحاجۃ ولا حاجۃ ھنا۔

ترجمہ: ''ہر عاقل بالغ خاوند کی طلاق نافذ ہو جائے گی اگر چہ اسے مجبور کیا گیا ہو یا غلطی

سے طلاق دے دی، اور ردالمحتار میں بحر سے منقول ہے کہ جبر سے مرادلفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو، اور اگر اس کو اپنی بیوی کو طلاق لکھنے پر مجبور کیا گیا تو اس نے مجبور ہو کر لکھ دی تو طلاق نہ ہوگی، کیونکہ کتابت کو تلفظ کے قائم مقام محض حاجت کی بناء پر کیا گیا ہے اور یہاں خاوند کو حاجت نہیں ہے"۔ مگر یہ سب اس صورت میں جبکہ اکراہ شرعی ہو کہ اسے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو اور وہ ایذا پر قادر ہو، صرف اس قدر کہ اس (مُکرِہ) نے اپنے سخت اصرار سے مجبور کردیا اور اس کے لحاظ پاس سے اسے لکھتے بنی ، اکراہ کے لئے کافی نہیں، یوں لکھے گا تو طلاق ہو جائے گی، کمالایخفی (جیسا کہ ظاہر ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد: 12، ص: 385، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

صورتِ مسئولہ میں اگر شوہر نے جبر کی بنا پر صرف تحریری طلاق پر اکتفا کی ہوتی تو طلاق واقع نہ ہوتی اور ان کا نکاح بدستور قائم رہتا، لیکن چونکہ لفظاً بھی طلاق دے دی ہے، لہٰذا فقہ حنفی کی رو سے طلاق واقع ہوگئی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذا طلق الرجلُ امراتہ ثلاثا قبل الدخول بھا وقعن علیھا فان فرق الطلاق بانت باالاولی ولم تقع الثانیۃ و الثالثۃ۔

ترجمہ: "اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاق بائن ہو جائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی، (عالمگیری جلد اول ص: 373)"۔

صورتِ مسئولہ میں منسلکہ تحریری "طلاق نامہ" کے مطابق تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں ، اور زوجین میں حرمتِ مغلظہ قائم ہو چکی ہے اور رجعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور چونکہ رخصتی نہیں ہوئی اور زوجین میں خلوتِ صحیحہ نہیں ہوئی، اس لئے مطلقہ پر کوئی عدت

نہیں ہے، وہ طلاق کے وقت سے ہی کہیں بھی نکاح کرنے کے لئے آزاد ہے، اللہ تعالٰی کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: یایھا الذین امنوا اذانکحتم المؤمنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن فمالکم علیھن من عدۃ تعتدّونھا۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب: 49)''۔

اور مطلقہ اپنے سابق شوہر سے نصف مقررہ مہر کی بھی حقدار ہے، اللہ تعالٰی کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وان طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن وقد فرضتم لھن فریضۃ فنصف مافرضتم۔

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ: 237)''۔

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (1)

سوال: 127

میرے لڑکے ذیشان مسعود ولد محمد مسعود نے اپنی بیوی طاہرہ ولد محمود کو طلاق کا نوٹس بھیجا جو کہ اس نے وصول کیا، نوٹس کے الفاظ یہ تھے:

''فریق اول (ذیشان مسعود ولد محمد مسعود) نے تین طلاقیں دو گواہوں کی موجودگی میں 27، اپریل 2006ء کو دی''۔

دونوں کا صرف نکاح ہوا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی ذیشان مسعود سسرال جاتے تھے تنہائی میں بھی بیٹھتے تھے مگر کوئی ملاپ یا ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے، کھلے کمرے میں

بیٹھتے تھے جس میں گھر والوں کا گزر ہوتا تھا مہر کی رقم پچیس ہزار روپے ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے آیا حق مہر ادا کیا جائے گا یا نہیں؟ (محمد مسعود، B.10/38 جوہر اسکوائر گلستان جوہر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ بر صدق بیان سائل چونکہ شوہر نے ایک لفظ میں تین طلاقیں دی ہیں لہٰذا تین طلاق واقع ہو گئیں اور بغیر تحلیل شرعی کے دوبارہ ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ سائل کے بیان کے مطابق چونکہ دونوں کے درمیان نہ تو ازدواجی تعلقات استوار ہوئے اور نہ ہی خلوت صحیحہ ہوئی لہٰذا شوہر پر نصف مہر کی ادائیگی لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وان طلقتموهن من قبل ان تمسّوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف مافرضتم

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ: 237)''۔

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (2)

سوال: 128

میرا نام کنول رانی ہے، میرا نکاح شیخ ہمایوں سے 3، اپریل 2002ء کو ہوا لیکن رخصتی نہیں ہوئی اور ہمارے درمیان کسی قسم کے ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے۔ ایک بار ہمایوں نے غصے میں ہم سے کہا کہ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم جس سے

چاہو شادی کر لو اور میرے والدین بھی میرے لئے لڑکیاں تلاش کر رہے ہیں اور جب

ہم نے کہا کہ یہ لکھ کر دیں تو وہ مکر گئے اور کہنے لگے کہ چاہے کچھ بھی کر لو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا، تب ہم نے اپنے مسئلے کے حل کے لئے کورٹ سے رجوع کیا، کورٹ نے 16 جولائی 2004ء کو خلع کے آرڈر جاری کر دیئے، کورٹ سے جو خلع لی گئی ہے وہ کتنی مؤثر ہے؟، (کنول رانی، دستگیر، کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو قال تزوجی ونوی الطلاق أو الثلاث صح وان لم ینو شیئاً لم یقع کذا فی العتابیۃ۔

ترجمہ: ''اگر شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو نکاح کر لے، ایک طلاق کی نیت سے یا تین طلاق کی نیت سے تو صحیح یہ ہے کہ طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 376 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائلہ شوہر کے الفاظ ''چاہے کچھ بھی کر لو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا'' سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ الفاظ بہ نیتِ طلاق نہیں کہے گئے، لہٰذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قاضیٔ مُجاز یا عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ ''طلاقِ بائن'' کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں ''فسخِ نکاح'' کے بعد زوجین عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یایھا الذین امنوا اذا نکحتم المؤمنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن

فمالكم عليهن من عدة تعتدّونها ج

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب 49:)''۔

ادائیگی مہر کے بارے میں اللہ تعالٰی کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وان طلقتموهن من قبل ان تمسّوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف مافرضتم۔

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ: 237)''۔

خلع کورٹ کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ زوجین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے، جس میں بیوی اپنے مطالبہ مہر کے حق سے دستبردار ہوکر کہے کہ تم مجھے اس کے عوض طلاق دے دو اور شوہر اس کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تمہیں خلع دیا، یہ خلع ہے اور طلاق بائن کے حکم میں ہے۔

عدالتی نکاح دراصل حاکم مجاز کی جانب سے فسخ نکاح ہے، اس کے لئے وجوہ شرعیہ کا ہونا ضروری ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق دینے پر بھی آمادہ نہ ہو اور اسے مکمل حقوق کی ادائیگی کے ساتھ رکھے بھی نہیں، نان نفقہ نہ دے، ظلماً مارے پیٹے، حقوق زوجیت ادا نہ کرے اور معلق (Hung) رکھے، وغیرہ۔ لہٰذا عدالتی طلاق کے مؤثر ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اس سلسلے میں جج نے حدود شرعیہ اور احکام شرعیہ کو ملحوظ رکھا یا نہیں، صرف اتنی بات خلع کے جواز کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت یہ کہے کہ: میں اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

امام شافعی کے نزدیک تین طلاق کا حکم

سوال: 129

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے شوہر نے مجھے ٹیلی فون پر تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ "میں نے تمہیں طلاق دی"، یہ الفاظ تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہے اب وہ اس بات پر مصر ہے کہ ہم رجوع کر سکتے ہیں۔کیا اس کا رجوع کرنا صحیح ہے؟۔واضح رہے کہ میرے شوہر کا مسلک شافعی ہے اور میں اہلسنت وجماعت سے تعلق رکھتی ہوں، برائے کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں، (میرا، M-C703 گرین ٹاؤن شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: "پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کر لے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کر سکتی ہے)۔(البقرۃ:230)"۔اس کے علاوہ ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے۔

علامہ یحیٰ بن شرف الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأته انت طالق ثلثا فقال الشافعی و مالك

وابو حنيفة احمد و جماهير العلماء من السلف و الخلف يقع الثلاث ـ

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)،تواس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے،امام شافعی ،امام مالک،امام اعظم ابوحنفیہ اور امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ اجمعین اور جمہور علماء سلف وخلف کا رحمھم اللہ اجمعین کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی ،(شرح صحیح مسلم للنووی جلد 1 ص 478 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)''۔

صورتِ مسئولہ میں برصدق بیان سائلہ اس کے شوہر نے تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ ''میں نے تمہیں طلاق دی''،تین بار کی ادائیگی سے طلاق مغلظہ واقع ہوگئیں اور باقی طلاقیں لغو ہوگئیں ،بغیر تحلیل شرعی کے دونوں کا میاں بیوی کے حیثیت سے رہنا ناجائز وحرام ہے،اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی تین طلاق سے عورت حرام ہو جاتی ہے اور بغیر تحلیل شرعی کے ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب ۔

انکارِطلاق کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے

سوال: 130

میرا نام افشاں انجم بنت سید رحمت علی ہے،میری شادی 20 سال قبل زبیر احمد بن قاضی معز الدین سے ہوئی میرے تین بیٹے ہیں، میں پانچ سال سے لاہور میں مقیم ہوں اور میرے شوہر راولپنڈی میں ہوتے ہیں میں پانچ سال سے اپنے شوہر سے الگ رہ رہی ہوں اور بچے میرے ساتھ ہی لاہور میں ہیں جہاں وہ اپنی تعلیم مکمل کررہے ہیں اور شوہر کوئی نان ونفقہ نہیں دے رہے ہیں ہمارے درمیان مستقل لڑائی جھگڑے رہتے تھے اور میرے شوہر ان جھگڑوں کے دوران طلاق کے الفاظ ادا کرتے

رہتے تھے کبھی ایک بار اور کبھی دو بار بھی ادا کرتے کہ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" اور پھر ایک دو دن کے اندر رجوع کر لیتے اور جب میں اعتراض کرتی کہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے تو قرآن پاک اٹھا کر کہتے کہ میں نے ایسا نہیں کہا اور ایک بار میرے شوہر نے مسجد کے امام صاحب کے سامنے قرآن پاک اٹھا کر کہا کہ میں نے طلاق کے الفاظ ادا نہیں کیے بلکہ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دے دوں گا اور میرے پاس کوئی گواہ نہ ہوتے جو میری بات کی تصدیق کرتے اسی وجہ سے کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا اب جبکہ مجھے اپنے شوہر سے الگ رہتے پانچ سال ہو رہے ہیں کبھی کبھی ان سے فون پر بات ہوتی ہے، ایک بار میں اور میرے بچے ان کو لینے گئے تھے تو شوہر نے ہم سے جھگڑا شروع کیا اور وہاں پر موجود ایک مرد اور ایک عورت کے سامنے انہوں نے کہا کہ میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی اور میرا نام لیکر انہوں نے یہ الفاظ ادا کیے تھے مگر جب ان سے پوچھا تو قسمیں کھانے لگے کہ وہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ پھر ہم یعنی میں اور بچے واپس لاہور آگئے۔ اب آپ مجھے بتایئے کہ کیا مجھے طلاق ہوگئی ہے اور اگر ہوگئی ہے تو مجھے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا مجھے اپنے مسئلے کیلئے فتویٰ چاہیئے تاکہ میرے پاس ثبوت ہو اور اگر طلاق نہیں ہوئی ہے تو اس 5 سال کی علیحدگی کے بارے میں کیا حکم ہے، وہ کوئی خرچہ نہیں دیتے ہیں، اب بھی فون پر کبھی کبھی بات چیت ہوتی ہے، ان حالات میں مجھے کیا کرنے چاہیئے برائے مہربانی مجھے تحریری طور پر جواب دے دیں، (افشاں انجم، نیو کالونی مصطفیٰ آباد، لاہور)۔

جواب :

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائلہ شوہر نے کئی مرتبہ طلاق کے یہ الفاظ

ادا کیے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اور تین مرتبہ ادا کیے جا چکے ہوں تو تین طلاقِ مغلظہ ہو جائیں گی اور رجوع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، رجوع یا تجدیدِ نکاح کا اختیار صرف دو طلاق تک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الطلاق مرتٰن صلے فامساكٌ م بمعروف او تسريح باحسان ط

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)''۔

تیسری طلاق دینے کے بعد بغیر تحلیلِ شرعی کے دونوں کا شوہر بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْ م بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجاً غَيْرَهٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ''پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کرلے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کرسکتی ہے)، (البقرۃ: 230)''۔

قضاء یعنی دنیوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت

طلاق کی مُدَّعِیَہ ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: عن عمرو بن شعیب، عن ابیه، عن جده: ان النبی ﷺ قال فی خطبته: "البینه علی المُدّعی والیمین علیٰ المدعی علیه"۔

ترجمہ: ''عمر ابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعٰی علیہا گر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)''۔

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ دو عادل مرد بطور گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعٰی علیہا گر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم دی جائے گی، شوہر کی قسم کے بعد فیصلہ ہوگا اور اس طرح قضاءً نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''بحالتِ اختلاف، طلاق کا ثبوت گواہوں سے ہوگا اور دو گواہ عادل شرعی شہادت بروجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہو جائیگی، پھر اگر شوہر نفی کے گواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت گواہ بروجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائیگا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر

حاکم شرعی کے سامنے حلف سے انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائیگی، (فتاویٰ رضویہ جلد: 12 صفحہ 453، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)" اگر شوہر تین طلاقیں دے کر منکر ہو جاتا ہے اور طلاق کے وقت کوئی گواہ موجود نہیں تھے اور اس کے بعد بدستور اسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہے تو یہ شرعاً حرام اور زنا کی زندگی ہے، کیونکہ خلق کو تو دھوکہ دیا جاسکتا ہے، خالق کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔ مذکورہ صورت میں سائلہ تین طلاق کی مدعیہ ہے اور شوہر اس سے منکر ہے اور بہ بیانِ مدعیہ اس کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے دو عادل مرد گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے لیکن اس کے پاس مذکورہ نصاب مکمل نہیں، ایسی صورت میں بیوی کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو، اور وہ تین طلاق جو آپ زبانی دے کر منکر ہو گئے ہیں، ان کا اقرار کرلیں اور لکھ کر دے دیں، اگر انہیں خوفِ خدا آجائے تو شریعت پر عمل کریں۔ اور اگر خدانخواستہ وہ بدستور انکار پر ڈٹے رہیں تو ان کے انکار اور گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءً حرمت اور تفریق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، لہٰذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا، اگر چہ دیانۃً اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں جوابدہی کے اعتبار سے وہ نکاح باقی نہیں ہے، دنیا میں احکامِ شرعی کا اطلاق ظاہرِ حال، قرائن اور شہادتوں یا اقرار وانکار پر ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقتِ حال کے مطابق فیصلے ہوں گے، یعنی ظاہر حال کے مطابق دنیوی عدالتوں سے جو فیصلے جاری ہوتے ہیں اور نافذ ہو جاتے ہیں، وہ حقیقت حال کو تبدیل نہیں کرتے۔

اگر آپ کو کامل یقین ہے کہ شوہر آپ کو تین طلاق دے چکا ہے تو ان حالات میں آپ کے لئے جائز شرعی اور قانونی راستہ یہ ہے کہ آپ عدالت سے رجوع کریں اور

عدالت کے ذریعے فسخ نکاح کرائیں، چونکہ جائز شرعی وجوہ موجود ہیں، اس لئے یہ فسخ نکاح شرعاً وقانوناً معتبر ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

طلاق مدہوش

سوال: 131

میرا نام ریحان حسین خان ہے میری بیوی کا نام شازیہ ہے ہماری شادی کو بارہ سال ہوگئے ہیں اور ہماری 3 بیٹیاں ہیں، پچھلے کئی سالوں سے مجھے دماغ کی ایک بیماری ہے جس کو ڈاکٹرز Panic Disorder کہتے ہیں اور ان دوروں (Attacks) کے درمیان مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مر رہا ہوں اور یہ اٹیک ایک جنون کی طرح ہوتا ہے اور جتنی دیر اٹیک رہتا ہے، مجھے کچھ یاد نہیں رہتا اور مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں نے کیا کیا، یا کیا کہا ہے جب بھی ہوتا ہے میرے گھر والے مجھے بتاتے ہیں کہ تم نے ایسا ایسا کیا تھا، پہلے یہ دورے زیادہ ہوتے تھے، لیکن علاج ہوتے رہنے کی وجہ سے ان میں کچھ کمی آئی ہے۔ میرا مستقل علاج آغا خان ہسپتال، کراچی میں ہو رہا ہے۔ 18، جون 2006ء اتوار کو میرے بھائی کے گھر رہنے گئیں ان کے ساتھ والدہ بھی تھیں رات کو مجھے بھی وہیں رکنے جانا تھا رات کو جب میں وہاں گیا تو میرا اپنی بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا اور میں وہاں سے اپنے گھر آگیا ڈاکٹرز نے مجھے ٹینشن لینے سے منع کیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اٹیک بڑھ جاتے ہیں، بہر حال جب میں گھر آگیا تو مجھے پھر اٹیک ہوا اس وقت میں اپنی بیوی کو فون کر رہا تھا اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں کیا ہوا! میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور میرے چاروں طرف میری الٹیاں (قے) تھیں، صبح جب میں بیوی بچوں کو لینے گیا تو میری بیوی نے بتایا رات کو آپ نے فون کیا تھا اور فون پر مجھے طلاق دی، مگر مجھے کچھ بھی یاد نہیں، ہاں صرف اتنا

یاد ہے کہ میں اپنی بیوی سے لڑ کر آیا تھا۔اب ہم سب پریشان ہیں کہ اس کا شرعی مسئلہ کیا ہوگا؟، (ریحان حسین خان فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اگر طلاق دینے والے کی طلاق دیتے وقت وہی کیفیت تھی جیسا کہ سائل نے بیان کی ہے کہ وہ اس وقت دورے (Attack) کی حالت میں تھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔شرعاً درستگیٔ عقل شرط طلاق ہے اور اختلال عقل مانع طلاق ہے ۔ہدایہ میں ہے:ولا یقع طلاق الصبی والمجنون والنائم لقوله علیه السلام کل طلاق جائز الّا طلاق الصبی والمجنون ولان الاهلیة بالعقل الممیّز وهماعدیما العقل والنائم عدیم الاختیار۔

ترجمہ:''اور بچے کی اور مجنوں (جنون والے) کی ،اورسوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا قول ہے کہ ہر (طلاق دینے والے شخص کی) طلاق جائز (واقع) ہے مگر بچے کی اور مجنوں کی جائز نہیں ہے،اس لئے کہ یہ دونوں عقل سے تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دونوں میں عقل کا عنصر نہیں پایا جاتا اور سویا ہوا شخص (چونکہ) اختیار نہیں رکھتا، (ہدایہ اولین جلد 2 ص: 338 مطبوعہ محمد علی کارخانہ اسلامی کتب کراچی)'' ۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمی علیه والمدهوش هکذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ:'' اور بچے (نابالغ) کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگر چہ وہ عقل رکھتا ہو اور مجنوں کی اور سوئے ہوئے شخص کی، ذات الجنب (برسام) کے مریض کی طلاق، مغمی (بیمار

جس پر بے ہوشی طاری ہو) مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوگی، فتح القدیر میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 353 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

اگر صورت مندرجہ بالا صحیح اور واقعیٰ ہے اور سائل پر بوقت طلاق دورہ (Panic Attack) پڑا تھا اور اس نے اس حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی تو وہ طلاق شرعاً لغو وباطل قرار دی جائے گی، یہ جواب صحت سوال وبیان مذکور پر مبنی ہے اور اگر سوال وبیان صحیح نہ ہوں تو جواب بھی یہ نہیں ہوگا۔

فیملی کورٹس کے فاضل جج صاحبان کی خدمت میں مؤدبانہ گذارشات

آج کل بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ماضی کے مقابلے میں طلاق کی شرح ویسے بھی زیادہ ہوچکی ہے، اسی تناسب سے "عدالتی فسخِ نکاح" کی شرح میں بھی اضافہ ہوا ہے، جسے عرف عام میں "خلع" کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ شرعی "خُلع" نہیں ہے۔شرعی خلع یہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فان خفتم الا یقیما حدود اللہ لا فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ ط تلك حدود اللہ فلا تعتدوھا ج ومن یتعد حدود اللہ فاولئك ھم الظلمون O

ترجمہ "اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں (زوجین) اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت نے جو بدلِ خلع دیا ہے (شوہر کے اسے لینے میں) تم دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے، یہ اللہ کی حدود ہیں، سو تم اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اور جنہوں نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا، تو وہی لوگ ظالم ہیں، (البقرہ: 229)"۔اس ارشاد باری تعالیٰ کی رو سے "خلع" یہ ہے کہ میاں بیوی اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ وہ "حقوقِ زوجین" کی بابت اللہ تعالیٰ کی مُقرّرہ حدود کو قائم نہ رکھ پائیں گے، باہمی اعتماد نہ رہا یا نفرت پیدا ہوگئی یا کوئی اور داخلی یا خارجی سبب بن گیا اور شوہر یک طرفہ طور پر طلاق دینے پر آمادہ نہیں

ہے،تو پھر بیوی نے نکاح کے موقع پر جو "حقِ مہر" لیا ہے، وہ شوہر کو واپس کردے اور شوہر اس کے عوض اسے طلاق دے دے، یہ "طلاق بائن" ہوتی ہے، اس کے بعد شوہر کو عدت کے اندر بھی یک طرفہ رجوع کا حق نہیں رہتا، البتہ باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں، بشرطیکہ ایک ہی طلاق دی ہو۔ "خلع" قاضی کے یک طرفہ حکم سے نافذ نہیں ہوتا، اس پر زوجین کی رضامندی ضروری ہے اور قاضی کو چاہئے کہ ترغیب یا ترہیب (جس میں وہ تعزیراً حوالات میں بھی رکھ سکتا ہے) سے شوہر کو آمادہ کرے۔ فیملی کورٹس کے جج صاحبان عام طور پر شرعی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے، بس صرف قانونی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ضابطۂ کار (Procedural Law) کو اور آسان بنا دیا گیا ہے اور بعض جج صاحبان چیمبر میں ہی بیٹھ کر نکاح کو فسخ (Dissolve) کردیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تیز رفتاری سے حکومت جدید روشن خیالی (Enlightened Moderation) اور آزاد خیالی (Liberalism) لانا چاہتی ہے، ہمارا معاشرہ اس کا ساتھ نہیں دے پارہا۔ اس لئے آئے دن لوگ عدالت سے "فسخ نکاح" کی ڈگری (Decree) لے کر دارالافتاء میں آتے ہیں کہ یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟، نہ صرف یہ کہ مفتی کے لئے ہر فیصلے کی تائید و توثیق دشوار ہوتی ہے، بلکہ "عدالتی ڈگری" کے باوجود اسے معاشرہ بھی آنکھیں بند کرکے قبول کرنے لئے تیار نہیں ہوتا اور معاشرتی اخلاقی اقدار (Social Ehtical values) اور معاشرتی مزاحمت (Social Resistance) کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ بیشتر فیصلے "قضا علی الغائب" (IN ABSENTIA) ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمارے جج بھی ماشاءاللہ مسلمان ہیں اور انہیں یہ معلوم ہے کہ مجرّد دعویٰ ثبوتِ مقدمہ کے

لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ ہر مقدمے میں مُدّعی سے اس کے دعوے کے حق میں ثبوت مانگا جاتا ہے، "مُدّعیٰ علیہ" (Respondent) کو اپنی صفائی اور وضاحت کا موقع دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ اعتراف جرم (Confession) کرے اور یا اپنی براءت پیش کرے۔ آج کل بالعموم یہ ہو رہا ہے کہ "مُدّعیٰ علیہ" نہ تو اصالتاً (Personally) عدالت میں حاضر ہوتا ہے اور نہ ہی وکالتاً (Through Attorney)، اس کو عدالت کی جانب سے رسمی طور پر طلبی کا نوٹس (Summon) بھیج دیا جاتا ہے، بیلف چلا جاتا ہے، اس کے دروازے پر نوٹس چسپاں کرآتا ہے یا اخبارات میں اشتہار "اطلاع عام بابت طلبی بہ عدالت فلاں" دیدیا جاتا ہے۔ جج، وکلاء اور عام لوگ کب اطلاع عام کے ان روزمرّہ اشتہاروں کو پڑھتے ہیں یا وہ اخباران کی دسترس میں ہوتا ہے۔ جج کے منصب کو اتھارٹی اور قوت مملکت اور سربراہ مملکت کی طرف سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا جج پر لازم ہے کہ وہ حکومت یعنی پولیس کو پابند بنائے کہ وہ "مُدّعیٰ علیہ" کو عدالت میں پیش کرے، کیونکہ یہ محض دادرسی اور حق طلبی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حلال وحرام کا بھی مسئلہ ہے۔ حالانکہ جب ہم معلوم کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ عام طور پر "مُدّعیٰ علیہ" اسی شہر یا ملک میں موجود ہوتا ہے، اس کا صحیح پتا بھی فریق مخالف کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ استثنا صرف ان مقدمات میں معتبر ہوسکتا ہے، جہاں "مُدّعیٰ علیہ" یا تو بالکل لاپتا (مفقود الخبر) ہوتا ہے یا ملک سے باہر ہوتا ہے، تاہم وہاں بھی ممکنہ طور پر پاکستانی سفارت خانے کی مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ نیز جج کو اس بات کا پابند ہونا چاہئے کہ وہ ان وجوہ کو باقاعدہ قلمبند کرے، جن کی رو سے اس کے اطمینان اور شرح صدر اور پیش کردہ ثبوت وشواہد (Proof & Evidence) کے مطابق عورت کے لئے عملاً ممکن نہیں رہا کہ وہ شرعی حدود کو قائم رکھتے ہوئے رشتۂ

ازدواج کو قائم رکھ سکے یا اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ہم ان میں سے بعض وجوہ کا تذکرہ آگے چل کر کریں گے۔یہیں سے ''فسخِ نکاح'' (Dissoution) اور خُلع کے معاملات کو الگ کردینا چاہئے۔''فسخِ نکاح'' کے مقدّمے میں صرف اتنی بات کافی نہیں کہ عورت کہے کہ میں شوہر کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی، جب کہ اس کی معقول وجوہ موجود نہ ہوں۔اگر خدانخواستہ قانون میں سقم ہے تو جج صاحبان کو پھر بھی شریعت کی رعایت، شرعی حدود وقیود، خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور حلال وحرام کی نزاکت اور حسّاسیّت کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔بعض حضرات ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ قاضی (Judge) کو معقول وجوہ واسباب کے بغیر بھی ''فسخِ نکاح'' کا اختیار حاصل ہے، چنانچہ ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے:

عن ابن عباس : انّ امرأة ثابت بن قيس اتت النبی ﷺ فقالت: يارسول الله، ثابت بن قيس، ماأعيبُ عليه فی خُلق ولادين، ولكنی اكره الكفر فی الاسلام، فقال رسول الله ﷺ: اتردّين عليه حديقته قالت: نعم، قال رسول الله ﷺ: اقبل الحديقة وطلقها تطليقة۔

ترجمہ:''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ثابت کے دین اور اخلاق کے بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے، مگر یہ کہ میں اسلام میں رہتے ہوئے کفر (ناشکری اور شوہر کی نافرمانی) سے ڈرتی ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کا وہ باغ (جو ثابت نے نکاح کے وقت مہر میں دیا تھا) واپس کردوگی، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں: چنانچہ انہوں نے (مہر میں لیا ہوا) وہ (باغ) شوہر کو واپس کردیا، رسول اللہ ﷺ نے (ثابت سے) فرمایا: باغ قبول کرلو

اور اسے ایک طلاق دے دو، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5273)''۔

صحیح بخاری میں اس سے اگلی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے (ثابت کو) طلاق کا حکم فرمایا اور ثابت نے طلاق دے دی، اس سے آگے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ثابت کو حکم فرمایا تو انہوں نے بیوی سے (بذریعہ طلاق) علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ حدیث ''فسخ نکاح'' سے متعلق نہیں ہے، یعنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود بحیثیت حاکم وقاضی نکاح فسخ فرمایا بلکہ آپ نے بیوی کو مہر واپس کرنے اور شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ فرمایا اور یہی خلع ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ ہمارے فیملی کورٹس کے جج فسخِ نکاح(Dissolution of Marriage) کو آخری اور ناگزیر امکانی صورت (Option) کے طور پر اختیار کریں۔ جج کی پہلی ترجیح مصالحت (Reconcilliation) ہونی چاہئے، دوسری ترجیح شوہر کو رضا کارانہ طلاق پر آمادہ کرنا اور تیسری دونوں کو خلع پر آمادہ کرنا ہونی چاہئے، کیونکہ اگرچہ شریعت نے انتہائی ناگزیر صورتِ حال میں زوجین میں طلاق یا تفریق کی گنجائش رکھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حلال امور میں یہ سب سے زیادہ اس کے غضب کا باعث ہے، امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابغض الحلال الی اللہ عزوجلّ الطلاق، ترجمہ: ''یعنی حلال امور میں اللہ عزوجلّ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2171)''۔ بابل کے مقام پر دو فرشتے ھاروت و ماروت بنی اسرائیل کو بطورِ آزمائش جادو سکھاتے تھے اور قرآن مجید میں ان کے جادو سیکھنے کا جو سب سے مذموم پہلو بتایا، وہ یہ ہے کہ فیتعلّمون منھما مایفرّقون بین المرء وزوجہ ط ،

ترجمہ: ''یعنی وہ لوگ دونوں فرشتوں سے اس (جادو) کو سیکھتے تھے، جس کے ذریعے مرد اور عورت میں علیحدگی کرادیں، (البقرہ: 102)''۔ اس لئے جیسا کہ میں نے عرض کیا، فیملی کورٹس کے جج صاحبان کو زوجین میں علیحدگی (Separation) کا عدالتی اختیار انتہائی ناگواری کے ساتھ آخری ناگزیر وناپسندیدہ ترجیح (Option) کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی ذات کا تعلق ہے، آپ کو ویسے بھی مومنوں پر ولایتِ تامّہ اور مکمل تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے زیادہ جتنا کسی عام حاکم یا قاضی کو یا کسی ذی لی اقرب کو حاصل ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم۔ ترجمہ: ''نبی کو مومنوں پر اس سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے، جتنا خود ان کو اپنی ذات پر ہے، (الاحزاب: 6)''۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بہر حال نافذ ہے اور آپ ﷺ وجوہ کو بتانے کے پابند نہیں ہیں، جبکہ عام جج، قاضی اور حاکم کی ولایت شرعی حدود وقیود کے ساتھ مشروط ہے۔ فقہِ حنفی میں ''عدالتی فسخ نکاح'' کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور یہ تقریباً ناممکن العمل ہے، احتیاط میں یہ شدّت اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے، تاہم دیگر ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک بعض حدود وقیود کے ساتھ اس کی گنجائش موجود ہے۔ اور فقہِ حنفی میں بھی یہ اصول مُسلَّم ومختار ہے کہ ضرورت شدیدہ کی بنا پر فسخِ نکاح کے لئے دوسرے ائمۂ کرام کے قول پر فیصلہ دیا جاسکتا ہے، ان میں سے چند صورتیں یہ ہیں:

(1) شوہر بے انتہا مار پیٹ کرتا ہے، جسمانی وذہنی اذیّت (Physical & Mental Torturing) میں مبتلا رکھتا ہے، نہ حقوق ادا کرتا ہے نہ طلاق دے کر گلوخلاصی کرتا ہے، بس اسے معلّق (Hung) رکھنا چاہتا ہے، تو ایسی صورت میں جج

ثبوت وشواہد اور قرائنِ قطعیہ کی بنا پر ''فسخِ نکاح'' کا فیصلہ دے سکتا ہے، لیکن اسے وجوہ ریکارڈ پر لانی چاہئیں۔

(2) شوہر نان نفقہ نہیں دیتا اور بیوی کے پاس کفالت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: (الف) یہ کہ شوہر مالدار ہے مگر ظلماً نہیں دیتا، اگر اس کا مال ظاہر ہو تو جج حکومت کے ذریعے جبراً شوہر سے نان نفقہ یعنی مصارفِ ضروریہ دلائے یا اسے قید کردے جب تک وہ خود رضا کارانہ طور پر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ (ب) اور اگر شوہر مفلس اور نادار ہے اور بظاہر اس بات کے آثار بھی نہیں ہیں کہ وہ جلد بیوی کا نفقہ دینے کے قابل ہو جائے گا اور بیوی کے لئے کوئی متبادل ذریعہ بھی دستیاب نہیں ہے، نہ ہی کوئی اور کفیل ہے اور نفقہ سے عجز کی بنا پر بیوی کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں جج نکاح فسخ کر سکتا ہے اور اسے تفصیلی وجوہ فیصلے میں درج کرنی چاہئیں۔

(3) شوہر کسی مُوذِی مرض میں مبتلا ہے، جیسے برص وجذام یا کینسر وغیرہ اور نکاح کے وقت بیوی کو معلوم نہیں تھا، اسے دھوکے میں رکھا گیا تھا، بعد میں اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی، اگر وہ اس کے باوجود رشتۂ ازدواج کو قائم رکھنا چاہے تو یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں اجر پائے گی، لیکن اگر وہ کسی طور پر بھی آمادہ نہ ہو تو جج نکاح فسخ کر سکتا ہے اور تفصیلی وجوہ اپنے فیصلے میں درج کرے۔

(4) شوہر کو خدانخواستہ طویل قید (جیسے پندرہ سال یا عمر قید) ہو گئی ہے اور بیوی جواں عمر ہے، اس کے لئے اپنے فطری جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے حدودِ شرع میں رہنا ممکن نہیں ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے یا کوئی اس کا کفیل نہیں ہے اور وہ عدالت سے فسخِ نکاح کا مطالبہ کرتی ہے تو جج فسخِ نکاح کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

(5)شوہر بلا سبب و بلا عذر مرض وغیرہ مسلسل طویل عرصے تک حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتا تو جج تنبیہ کے بعد اور تنبیہ کے غیر مؤثر ہونے کے بعد نکاح فسخ کرسکتا ہے۔

(6)شوہر مجنون ہوگیا، مناسب وقت گزرنے پر بھی علاج سے صحت یاب نہ ہوسکا، اس کے جنون سے بیوی کے جسم و جاں کو خطرہ لاحق ہے یا وہ اب حقوقِ زوجیت کی ادائیگی اور بیوی کی کفالت کا اہل ہی نہیں رہا تو جج نکاح فسخ کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی خدا ترس ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ شوہر کی یہ کیفیت عارضی ہے اور مناسب وقت میں اسے افاقہ ہوجائے گا تو ''فسخِ نکاح'' سے پہلے مناسب مہلت دینی چاہئے۔

(7)عنین (Impotent)شوہر اور مفقود الخبر یعنی لاپتا شوہر کے فسخِ نکاح کے مسائل تفصیل طلب ہیں، اس لئے ان پر کسی مناسب موقع پر الگ تفصیل سے بات ہوگی۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث (صفحات: 1094 تا 1121)میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مسلک کو اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کون کون سے مواقع ہیں جہاں دوسرے ائمہ کے قول پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں ''مجلس قضائے شرعیہ'' بہار، اکابر علماءِ اہلسنت نے قائم کی تھی اور انہوں نے ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں کچھ اصول متفقہ طور پر طے کئے تھے، جن میں سے ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں بعض متفقہ وجوہ کا تذکرہ مفتی عبدالواجد قادری نے ''فتاویٰ یورپ'' میں کیا ہے۔

آخر میں میری دردمندانہ گذارش ہے کہ اگر کوئی عورت خدانخواستہ خوفِ خدا سے عاری ہے، اس پر نفسانی خواہشات یا ہوسِ زر کا غلبہ ہے یا عشرتوں کی دلدادہ ہے اور کسی بھی

جائز سبب کے بغیر شوہر کے ساتھ بہر صورت رہنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو ایسی صورتِ حال میں شوہروں کو چاہئے کہ وہ رضا کارانہ طور پر خُلع پر آمادہ ہوجائیں یا یک طرفہ طور پر طلاق دے دیں، اس پر وہ عنداللہ اجر پائیں گے اور عورت فتنہ اور گناہ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے گی۔ اور اگر شوہر رضا کارانہ طور پر اس پر آمادہ نہ ہو تو عدالت مناسب دباؤ ڈال کر اس سے طلاق دلوائے۔

ماں کا حقِ نگہداشت ساقط ہونے کی صورتیں

سوال: 132

منکہ مسمی شعیب یونس ولد محمد یونس کی شادی مسماۃ فارینہ بنت امان اللہ سے 11 اگست 2001ء کو ہوئی تھی۔ اس سے میرا ایک ساڑھے چار سالہ بیٹا محمد مصطفی ہے۔ اس تمام عرصے میں میری بیوی کا رویہ مجھ سے کبھی محبت کا نہیں رہا اور اکثر اوقات وہ میکے میں رہنے کی خواہشمند رہتی جس پر کبھی کبھی ناراضی بھی ہوتی تھی ایک دن اچانک مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا اور اس روز میں نے اسے ایک ایسے موبائل فون پر کسی لڑکے کو SMS کرتے ہوئے پکڑا جو میں نے اسے نہیں دلایا تھا اور مجھ سے خفیہ رکھا ہوا تھا، رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ اس کے تعلقات دوسرے لڑکوں سے ہیں۔ اس موبائل پر تقریباً SMS750 آئے اور تقریباً 500 گئے، جس کی تفصیل پرنٹ کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد میری غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ ایسی عورت کو اپنے ساتھ رکھوں مگر پھر بھی میں نے ہوش میں رہتے ہوئے اس کے والدین کو بلایا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی اور ایک طلاق دے کر ان کے ساتھ بھیج دیا اس پر اس کے والدین نے نہ کسی شرمندگی کا اظہار کیا اور نہ ہی معافی مانگی اور میرے بچے کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ میرا

تعلق ایک دین دار گھرانے سے ہے، میں نے اس وقت ممتا کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کے خیال سے بچے کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی، مگر اس کی بے راہ روی اور غیر اخلاقی حرکات کو دیکھتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچے کو ساتھ رکھوں اور اس کی پرورش دینی ماحول میں کروں۔

محترم مفتی صاحب ان حالات میں آپ کا مشورہ اور فتویٰ درکار ہے تاکہ میں اپنے بچے کو اس گندے ماحول سے نکال کر اپنے پاس رکھوں اور اس کی تربیت دینی ماحول میں کرسکوں، جب وہ میرے پاس تھا تو اسکول بھی جاتا تھا لیکن اس کی ماں نے چار ماہ سے اسے اسکول نہیں بھیجا، بچے کا مستقبل خراب ہورہا ہے۔ برائے مہربانی بچے کی کفالت اور حصول کے لئے شرعی اور قانونی رہنمائی فرمائیں تاکہ بچے کا مستقبل محفوظ ہو اور وہ ایک دین دار انسان بن سکے، (محمد شعیب، C-205، پرنس ایونیو، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

شرعاً بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہوتا ہے لیکن اگر ایسے اسباب پائے جائیں جو اس کے حق کو ساقط کردیں، تو بچے کو اس کی پرورش میں نہیں دیا جائے گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الا م الا ان تكون مرتدة أو فاجرة غير مامونة كذا في الكافي ۔

ترجمہ: ''نکاح قائم رہے یا (بذریعۂ طلاق) تفریق ہوجائے ، (دونوں صورتوں میں) بچے کی پرورش کا سب سے زیادہ حق اس کی ماں کو حاصل ہے، لیکن اگر وہ مرتدہ ہوجائے یا (فسق و) فجور میں مبتلا ہوجائے، بچے کی صحیح نگہداشت نہ کرے تو (پھر اس

کا حق ساقط ہوجاتا ہے)" کافی " میں بھی اسی طرح ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں

:و کذا لو کانت سارقة أو مغنية أو نائحة فلا حق لها هكذا فى النهر الفائق

-

ترجمہ: "اور اسی طرح اگر وہ (ماں) چور یا گانے والی یا نوحہ خوانی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہے تو اس کے لئے حقِ پرورش نہیں ہے، "النہر الفائق" میں اسی طرح مذکور ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1 ص: 541 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)" ۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"تربیت الولد (تثبت للام) النسبیة (ولو بعد الفرقة الا أن تکون مرتدة أو فاجرة) فجوراً يضيع الولد به ، كزنا وغناء وسرقة ونياحة ، كما فى "البحر" و "النهر" بحثاً ۔ قال المصنف :والذى يظهر العمل باطلاقهم كما هو مذهب الشافعى أن الفاسقة بترك الصلاة لا حضانة لها ۔ وفى "القنية ":الأم أحق بالولد ولو سيئة السيرة معروفة بالفجور مالم يعقل ذلك (أو غير مأمونة) ذكره فى "المجتبىٰ "بأن تخرج كل وقت و تترك الولد ضائعاً ۔

ترجمہ: "بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، اگر چہ زوجین کے درمیان جدائی واقع ہوگئی ہو، لیکن اگر وہ (ماں) مرتدہ ہوگئی ہے یا فاجرہ ہے اور فسق ایسا ہے، جس سے بچے کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً زنا ،، گانا بجانا ، چوری ، اور نوحہ کرنا جیسا کہ "البحرالرائق " اور "النہر الفائق " کی بحث میں کہا گیا ہے مصنف کہتا ہے: بظاہر اس قول کے اطلاق پر عمل کریں گے جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے کہ اگر فاسقہ ماں نماز کی تارکہ ہے، تو اسے بھی بچے کی پرورش کا حق نہیں رہتا، اور "قنیۃ" میں ہے: ماں

بچے کی پرورش کی زیادہ حق دار ہے اگر چہ وہ اپنی سیرت وکردار میں برائی کے حوالے سے جانی جاتی ہو، بچہ اس وقت تک ماں کی پرورش میں رہے گا جب تک اسے اچھائی برائی کی تمیز نہ ہو (جب وہ باشعور ہو جائے تو اسے ماں سے علیحدہ کر لیں تاکہ ماں کو دیکھ کر اس کا کردار خراب نہ ہو) ایسے ہی اس عورت کی پرورش میں بھی نہیں دیا جائے گا ،جس کے پاس بچہ غیر محفوظ ہو یعنی وہ ہر وقت بچے کو چھوڑ کر آزادانہ گھومتی پھرتی رہے ،"المجتبیٰ" میں اسی طرح ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"والحاصل أنّ الحاضنة ان كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها، والا فهي أحق به الى أن يعقل فينزع كالكتابية۔

ترجمہ:"اور حاصلِ کلام یہ ہے کہ پرورش کرنے والی (ماں) اگر فاسقہ ہے اور اس کے پاس رہنے سے بچے کے ضائع ہونے (یا اس کی عادات واطوار بگڑنے) کا اندیشہ ہے تو اس (ماں) کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا، اور اگر فاسق نہ ہو تو بچے کے باشعور ہونے تک زیادہ حق دار وہی ہے ،اس کے بعد اس سے لے لیا جائے گا، جیسے "کتابیہ "ماں کا حکم ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص:204,205 داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

آپ نے سوال میں جو صورت درج کی ہے، اس کی رو سے ایسی ماں کی سرپرستی اور نگہداشت میں بچے کے کردار کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے اور اس نے بچے کو اسکول سے بھی روک دیا ہے ،لہٰذا آپ اس سے بچے کا مطالبہ کریں ،اگر حوالے نہ کرے تو پنچائیت یا عدالت کے ذریعے حاصل کریں۔

بچوں کی کفالت

سوال: 133

میرا بیٹا اختر محمود 15 نومبر 2006ء کو قضائے الٰہی سے انتقال کر گیا ہے، لواحقین میں درج ذیل افراد ہیں:

(1) بیوہ اختر محمود عمر 25 سال (2) ایک بیٹی عمر 4 سال

(3) ایک بیٹا عمر 2 سال (4) والد (محمود احمد)

عمر 60 سال

ا۔وراثت کی تقسیم میں شرعی احکامات کی رُو سے ہر ایک کو کس قدر حصہ ملے گا؟

۲۔مرحوم پر جو قرض ہے اس کی ادائیگی کے متعلق بھی شرعی فیصلے سے مطلع فرمائیں؟

۳۔بیوہ اگر نکاحِ ثانی کرتی ہے تو کیا ان دونوں کمسن بچوں کی کفالت ان کے دادا کے ذمے ہوگی؟، (محمود احمد لطفی، 502- سیکٹر B-5 سرجانی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق متعلق ہوتے ہیں: (1) ترکے سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔متوفی اختر محمود کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ 72 حصوں میں منقسم ہوگی، متوفی کے والد (محمود احمد) کو 12 حصے، بیوہ کو 9 حصے، بیٹے کو 34 حصے،

بیٹی کو 17 حصے ملیں گے۔جہاں تک بچوں کفالت اور حق حضانت (گود لینے اور پرورش) کا تعلق ہے،شرعاً اس کے استحقاق کی ترتیب درج ذیل ہے:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

تربیت الولد(تثبت للام)النسبیة (ثم) أی بعد الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبی (أم الأم وان علت) عند عدم أهلیة القربیٰ(ثم أم الأب وان علت) بالشرط المذکور ،وأما أم ابی الأم فتؤخر عن أم الأب بل عن الخالة أیضاً۔

ترجمہ:''بچے کی پرورش کا حق نسبی ماں کو حاصل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:ترجمہ:''ماں فوت ہوجائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کردے،یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرلے جو بچے کے لئے اجنبی ہے،تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا،اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو،پھر دادی کو اور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا،پھر نانا کی ماں،دادی بلکہ خالہ سے بھی موخر ہے۔

مزید لکھتے ہیں:والحاضنة أما أو غیرها(أحق به) أی بالغلام حتی یستغنی عن النساء وقدر بسبع وبه یفتی لأنه الغالب

ترجمہ:''پرورش کرنے والی عورت خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا کوئی اور اس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہوجائے،جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے،کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

(والأم والجدة) لأم أو لأب (احق بها)بالصغيرة (حتى تحيض وغيرهما احق بها حتىٰ تشتهى) وقدر بتسع وبه يفتى ۔

ترجمہ:''ماں اورنانی اوردادی لڑکی کے حیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی ہیں ، (ان کی عدم موجودگی یاعدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشتہاۃ (قریب البلوغ)ہونے تک ہے اوراس کی مدت کا اندازہ 9سال لگایا گیا ہے،اوراسی پرفتویٰ ہے ،(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5ص: 210تا216مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی، بیروت)''۔

صورتِ مسئولہ میں دونوں بچے مذکورہ بالاعمر تک ماں کے پاس رہیں گے بشرطیکہ ماں کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح نہ کرے جوبچے کے لئے اجنبی ہے،اس کے بعد دادا کو ان کی کفالت کاحق حاصل ہوگالیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں کو ماں سے اس طرح جدا کردیا جائے کہ اس سے ملنے تک نہ دیں یہ حرام اورسخت حرام ہے ۔حدیث مبارک میں ہے : عن ابی موسیٰ قال لعن رسول اللهﷺ من فرق بين الوالدة وولدها،وبين الاخى وبين اخيه۔

ترجمہ:''ابی موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے اس شخص پرلعنت فرمائی کہ جو ماں اوراس کے بچے میں جدائی پیدا کرے اورایک بھائی کو دوسرے بھائی سے جدا کرے،(سنن ابن ماجہ:رقم الحدیث:2250)''۔

﴾کتاب العدت﴿

عدت

سوال: 134

کیا عورت کو جو مہینہ آتا ہے وہ تین بار آجائے تو کیا عدت پوری ہو جاتی ہے؟، (انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروءٍ۔

ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ: 228)''۔

سوال: 135

میری بیوی حلالے کے بعد بچوں کی وجہ سے عدت کرنا نہیں چاہتی، کیونکہ بچوں کو اسکول اور مدرسے چھوڑنا، گھر کا سامان لانا، بچوں کی بیماری اور گھر کے دیگر بہت سارے کام ہوتے ہیں اور یہ کام کرنے والا کوئی نہیں ہے، میرے چھ بچے ہیں کیا اس صورت میں عدت لازم ہے مہربانی فرما کر میری مشکل آسان فرما دیں, (انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

عدت کا پورا کرنا لازمی ہے اور دورانِ عدت اس کا اور بچوں کا نفقہ ادا کرنا آپ کے ذمے لازم ہے اور جو عذر آپ نے پیش کئے ہیں وہ شرعاً نا قابل قبول

ہیں ۔اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن و احصوا العدۃ۔

ترجمہ: ’’جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے وقت (سے پہلے طہر میں) انہیں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو، (الطلاق:1)‘‘۔

کیا میں دورانِ عدتِ طلاق گھر سے باہر جاسکتی ہوں؟

سوال: 136

مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کے چار ماہ بعد میں بہت بیمار ہوگئی اور اپنی والدہ کے گھر آ گئی تھی ،اس دوران میرا میرے شوہر سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا خرچہ دیا میرے والدین نے سارا خرچا اٹھایا اب میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے تو جناب عدت کے بارے میں فرمایئے کہ میری عدت ہوگی، کتنے دن کی ہوگی؟ ،میں چونکہ ڈپریشن کی مریضہ بن گئی تھی تو ڈاکٹر نے مصروف رہنے کا کہا تھا اور پونے دو سال علاج بھی ہوا میں نے ابھی تین ماہ قبل ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے ۔کیا میں عدت کے دوران اسکول جاسکتی ہوں یا نہیں ؟اسکول میں پڑھانے سے میری دماغی حالت میں کافی بہتری آئی ہے ہم دونوں پونے دو سال سے جدا تھے ،اولاد کا سلسلہ بھی کوئی نہیں ہوا ،(فردوس جبیں ،بلاک 1فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو،اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں،قرآن مجید میں ہے:

والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثه قروء۔

ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ: 228)''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لاتخرجوھن من م بیوتھن ولا یخرجن۔

ترجمہ: تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں، (الطلاق: 1)''۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: وفی الجامع الصغیر المطلقۃ تعتد فی بیت کانت قبل الفرقۃ فیہ ولا تخرج لیلاً ولا نھاراً فی العدۃ۔

ترجمہ: جامع صغیر میں ہے مطلقہ عورت اپنے گھر میں عدت گذارے گی، دورانِ عدت رات ودن میں کسی وقت گھر سے نہیں نکلے گی، (جلد ثانی ص: 119 مطبوعہ مکتبۂ حبیبیہ، کوئٹہ)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لا تخرج لیلاً ولا نھاراً سواء کان الطلاق ثلاثاً أو بائنا أو رجعیاً۔

ترجمہ: ''رات ودن میں کسی بھی وقت (معتدہ) اس مکان سے جہاں وہ طلاق سے پہلے رہائش پذیر تھی، نہیں نکلے گی، خواہ اسے تین طلاق دی گئی ہوں یا طلاق بائن یا طلاقِ رجعی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 534 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

صورتِ مذکورہ میں چونکہ آپ اپنے والد کی کفالت میں ہیں اور کوئی معاشی ضرورت یا مجبوری درپیش نہیں ہے اور ملازمت کرنا آپ کی معاشی مجبوری نہیں ہے، لہٰذا عدت کے ایام میں گھر سے نہ نکلیں، ڈپریشن وغیرہ کا عذر مسموع نہیں ہے۔

سوال: 137

میرے شوہر محمد الطاف کا انتقال ۴رفروری ۲۰۰۶ء کو ہوا ہے اور میرے پانچ بچے ہیں، جن میں سب سے بڑی بیٹی ۱۷رسال کی، دوسری بیٹی ۱۵رسال کی، بیٹا ۱۱رسال کا اور دو چھوٹے جڑواں ڈیڑھ سال کے بچے ہیں۔ میرے شوہر کا جڑی بوٹیوں کا سپلائی کا کام ہے، اور ان کا تمام پیسہ کاروبار میں لگا ہوا ہے، میرے والد کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور میرا کوئی سگا بھائی بھی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت پریشان ہوں، اس لئے مجھے آپ سے یہ فتوی چاہئے کہ میں پردے میں رہ کر اپنے شوہر کے کاروبار کو چلا سکتی ہوں اور دکان پر کاروباری لوگوں سے بات چیت کرسکتی ہوں، فی الحال میرے ماموں زاد بھائی کاروبار کو سنبھال رہے ہیں، مگر وہ اس کاروبار کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں ہیں جبکہ میں اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کئی مرتبہ کاروبار سنبھال چکی ہوں اور کاروبار کی تمام باریکیوں سے واقف ہوں، اس لئے اگر اشد ضرورت پڑے تو پردے میں گھر میں یا باہر جا کر کاروبار سنبھال سکتی ہوں، کیونکہ میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری جوان بیٹی کاروبار کے سلسلے میں غیر مردوں کے سامنے جائے، آپ اس سلسلے میں فتوی دے کر میری رہنمائی کریں، (شہناز الطاف، D-120/A گلی نمبر ۱، موسیٰ کالونی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: والـذيـن يتـوفـون منكم ويذرون ازواجاً يتربصن بانفسهنّ اربعة اشهرٍ وّعشراً فاذا بلغن اجلهنّ

فلا جناح عليكم فيمافعلن في انفسهنّ بالمعروف ط ترجمہ:اور جولوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو کوئی حرج نہیں تم پراس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں کریں،(البقرہ: 234)۔

عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں !اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو،بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا یا نقصان پہنچے گا تو اس ضرورت سے اسکے لئے جاسکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔

درمختار میں علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(ومعتدة موت تخرج في الجديدين، وتبيت) اكثر الليل (في منزلها) لان نفقتها عليها، فتحتاج للخروج۔

ترجمہ:"اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے،لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے،اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے،(درمختار جلد 5 صفحہ 180،مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی،بیروت)"۔

علامہ علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:و أما المتوفى عنها زوجها فلا تخرج ليلاً ولا باس بان تخرج نهاراًفي حوائجها لانهاتحتاج الى الخروج بالنهار لاكتساب ماتنفقه لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفى بل نفقتها عليهافتحتاج الى الخروج لتحصيل النفقة۔

ترجمہ:"پس وفات پا گیا ہو جس عورت کا شوہر وہ رات میں نہ نکلے ،اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ھند)"۔

صورت مسئولہ میں فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق یہ واضح ہوتا ہے کہ معتدہ وفات اپنے اخراجات اور روزگار کے لئے دن کے وقت باپردہ باہر نکل سکتی ہے۔لہٰذا آپ کے لئے باپردہ ہو کر شوہر کے کام کی دیکھ بھال کے سلسلے میں نکلنا جائز ہے۔

مدتِ عدت

سوال: 138

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ: ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ عورت حاملہ ہے، تو اس کی عدت کتنی ہوگی؟، نیز عدتِ طلاق اور عدتِ وفات کی مدت کتنی ہے؟، آیا عدت کے دوران عورت گھر سے باہر جاسکتی ہے؟، (زاہد اللہ، کراچی)۔

جواب:

عِدّت (عین کی زیر کے ساتھ) کے لفظی معنی ہیں: گنتی کرنا اور عُدت (عین کے پیش کے ساتھ) کے معنی ہیں: کسی معاملے کی تیاری کرنا۔اور اصطلاحی معنی ہیں: نکاح ختم ہونے کے بعد ایک خاص مدّت تک عورت کا (عقدِ ثانی سے) رکے رہنا۔اگر عورت کو شوہر نے طلاق دے دی ہے اور وہ طلاقِ مُغلَّظہ ہے، یا طلاق رجعی ہے، مگر عدت کے اندر رجوع نہیں کیا، تو اس مطلّقہ (طلاق یافتہ) عورت کو اگر حیض

(Menses) آتا ہے تو اس کی عدت تین حیض ہے، ارشاد باری تعالٰی ہے: وعلی المطلقت یتربصن بانفسھن ثلثة قروء ۔ ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتوں پر لازم ہے کہ وہ (کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے) اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں (البقرہ:228)''۔

حیض اور طہر (پاکی کے ایّام) کا دورانیہ ہر عورت کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اور اگر عورت کو حیض نہیں آتا، خواہ کسی طبعی یا طبّی سبب سے ہو یا کم عمر ہے اور حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا یا وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوگئی ہیں، جب کہ فطری طور پر حیض کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے، ان کے لئے اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: والّٰئی یئسن من المحیض من نسآئکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثة اشھر والّٰئی لم یحضن ۔ ترجمہ: ''اور تمہاری جو عورتیں حیض سے ناامید ہو چکی ہوں یا انہیں سرے سے حیض آتا ہی نہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، (الطلاق:4)''۔

جو عورت طلاق کے وقت حالتِ حمل میں ہو تو اس کی عدت وضعِ حمل (Delivery of the child) یعنی بچہ پیدا ہونے تک ہے، اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: واُلات الاحمال اجلُھن ان یضعن حملھن ۔ ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضعِ حمل ہے، (الطلاق:4)''۔

جن عورتوں کے شوہر وفات پاجائیں اور بیوہ رہ جائیں تو ان کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے: اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

والذین یُتوَفّون منکم ویذَرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا۔ ترجمہ: ''اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں اور (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں (عقدِ ثانی سے پہلے) اپنے آپ کو چار ماہ دس دن

تک روکے رکھیں، (البقرۃ: 234)''۔اگر عورت بیوہ ہوگئی ہے اور وہ حاملہ ہے،تو اس صورت میں اس کی عدت وضع حمل تک ہی رہے گی، چنانچہ عِدّتِ وفات کے تحت علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(و) العدۃ (للموت اربعة اشھر وعشر مطلقا) وطئت اولا ولو صغیرۃ او کتابیة تحت مسلم الا الحامل۔

ترجمہ: ''یعنی عِدّتِ وفات جو چار ماہ دس دن ہے یہ مطلقاً سب کے لئے ہے، خواہ اس سے شوہر نے مباشرت کی ہو یا نہ کی ہو، خواہ نابالغہ ہو یا کوئی اہلِ کتاب عورت ہو جو کسی مسلمان کے نکاح میں تھی، سوائے حاملہ کے(کہ اس کی عِدّت شوہر کی وفات کی صورت میں وضعِ حمل ہی رہے گی)، ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:5،ص:150، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

عدت کی اصل حکمت ''استبراءِ رحم'' یعنی اس امر کا یقین کہ عورت حاملہ نہیں ہے، اس کے لئے مدت کا تعین وحی ربانی سے ہوا ہے، اسی لیئے مطلّقہ حاملہ کی عدت وضعِ حمل کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے۔البتہ شوہر کی وفات کی صورت میں ایک طرح سے سوگ بھی ہوجاتا ہے۔اگر کسی عورت کا نکاح ہوگیا ہے، لیکن باقاعدہ رخصتی نہیں ہوئی یا میاں بیوی میں خَلوتِ صحیحہ قائم نہیں ہوئی، (خَلوتِ صحیحہ سے مراد دونوں کا تنہائی میں اس طرح سے جمع ہونا کہ ازدواجی تعلق میں کوئی طبعی مانع حائل نہ ہو) تو طلاق کی صورت میں اس عورت پر بالکل عدت نہیں ہے۔اور وہ طلاق کے فوراً بعد کسی بھی شخص کے ساتھ اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے۔

ازدواجی تعلقات نہ ہوں تب بھی عدت ضروری ہے

سوال: 139

تقریباً 11 سال پہلے میرے گھر لڑکے کی ولادت کے بعد سے میرے شوہر میرے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے سے محروم ہیں، اس وجہ انہوں نے 15 دن قبل مجھے طلاق دے دی ہے، تین مرتبہ انہوں نے کہا کہ "میں نے تم کو طلاق دی" تحریری طور پر بھی دینے کو تیار ہیں۔ کیا میں فوری طور پر نکاحِ ثانی کر سکتی ہوں؟ یا مجھے عدت گذارنا ہوگی اگر عدت گذارنی ہے تو کتنے دن ؟،(شاہدہ رشید ، R-1947/2 عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو، اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثہ قروء۔

ترجمہ: "اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ: 228)"۔

صورتِ مسئولہ میں عدت پوری کیے بغیر نکاح ثانی ہر گز نہیں کیا جا سکتا اور عدت طلاق دینے کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے اور اس کی مدت تین حیض کا گزرنا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

دورانِ عدت جنازے میں شرکت

سوال: 140

میری والدہ عدت میں ہیں ان کی عمر 53 سال ہے ان کی عدت کے دوران میری چچی کے والد کی وفات ہوگئی اور بغیر کسی بڑے کے پوچھے تمام بہن بھائیوں کے منع کرنے کے باوجود وہاں چلی گئیں۔مگر وہ پورے پردے میں تھیں برقع پہن کر نقاب لگا کر گئی تھیں اور رات دس بجے واپس لوٹی تھیں۔لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں میت کے بعد دس قدم بھی نہیں نکالے،اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟اور اگر امی سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے تو اس کا اگر کوئی کفارہ ہے تو بتادیں اور یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ عدت شوہر کے لئے تحفہ ہے اسمیں کیا صداقت ہے؟اور عدت میں کیا شرعی کام کرنے چاہئیں؟،(عارفہ عباسی،دستگیر سوسائٹی F.B ایریا،کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:لاتخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینة۔

ترجمہ:تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں۔(الطلاق:1)

عورت کے لئے عدت اسی مکان میں واجب ہے،جہاں وہ شوہر کی وفات کے وقت رہتی تھی۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(طلقت) أو مات وھی زائرة (فی غیر مسکنھا عادت الیه فوراً) لوجوبه علیھا (و تعتدان) أی معتدة طلاق و موت (فی بیت وجبت فیه) ولا یخرجان منه (الا أن تخرج،أو ینھدم المنزل أو تخاف) انھدامه،أو (تلف

مالها،أو لا تجد كراء البيت)ونحو ذالك من الضرورات،فتخرج لأقرب موضع اليه۔

ترجمہ:''عورت کوطلاق دی گئی یا اس کا شوہر وفات پا گیا اور وہ اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور گئی ہوئی تھی تو اسے چاہئے کہ فوراً اپنے گھر لوٹ آئے ، کیونکہ یہ اس پر واجب ہے،عورت عدتِ طلاق گزار رہی ہو یا عدتِ وفات،ان دونوں کو چاہئے کہ اسی گھر میں عدت گزاریں جہاں پر عدت گزارنا،ان پر واجب ہوا ہے،سوائے اس کے کہ انہیں (اس گھر سے) نکال دیا جائے یا مکان گر جائے یا اس کے گرنے کا خدشہ ہو یا اس کا مال تلف ہونے کا خطرہ ہو یا (مکان کرائے کا ہونے کی صورت میں کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو)ان جیسی صورتوں (یا مجبوریوں) کی بناء پر اس کے لئے جائز ہے کہ وہاں سے نکل کر اس سے قریب ترین جگہ پر عدت گزارے،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 5 ص:180 داراحیاء التراث العربی بیروت)۔''عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے ، ہاں !اگر عدتِ وفات ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، گھر سے نکلے بغیر گذر اوقات مشکل ہو،تو وہ دن دن میں ان ناگزیر ضرورتوں کے لئے نکل سکتی ہے،اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔

علامہ علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

وأماالمتوفی عنها زوجها فلا تخرج ليلاً، ولا باس بان تخرج نهاراًفي حوائجها لانهاتحتاج الى الخروج بالنهار لاكتساب ماتنفقه لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفى بل نفقتها عليهافتحتاج الى الخروج لتحصيل النفقة۔

ترجمہ:''ایسی عورت جو عدتِ وفات میں ہے،تو وہ رات کو گھر سے (ہرگز) نہ نکلے

،البتہ دن کے وقت اپنی ضروریات کے لئے نکل سکتی ہے ،اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299 ،مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات ،ھند)''۔

صورتِ مسئولہ میں نہ تو آپ کی والدہ نفقہ اور دیگر ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہیں اور نہ ہی دورانِ عدت جنازے میں جانا ضرورتِ شرعی ہے،اور ضرورت وہ ہوا کرتی ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا گیا۔عدت حکمِ شرعی ہے جس کی پابندی ضروری ہے،شرعی کام صرف عدت ہی میں نہیں بلکہ تمام زندگی کرنے چاہئیں ،اور اس کے لئے ضروریاتِ دین کو سیکھیے اور مستند کتب کا مطالعہ کیجیے ،واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتاب الفرائض﴾

ترکہ کی تقسیم

میرے چند سوالات کا اسلامی شریعت اور حدیثوں کے حوالے سے تحریری جواب عنایت فرمائیں۔

اگر کوئی شادی شدہ عورت جو کہ تین بچوں کی ماں ہو، اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے گھر میں کسی غیر مرد سے ناجائز تعلقات کی مرتکب ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اس عورت کو طلاق دے کر اس کو گھر سے نکال دیا۔

سوال: 141

1۔کیا اس عورت کے والد اس کو اپنی جائداد سے خارج کر سکتے ہیں؟۔

2۔کیا اس عورت کے والد اپنی زندگی میں اس عورت کو اپنی جائداد میں سے کچھ حصہ دے سکتے ہیں، صلہ رحمی کے طور پر؟۔

3۔والد صاحب کے پاس ایک عدد گھر اور ایک عدد فلیٹ بھی ہے، انہوں نے جب والدہ حیات تھیں تو باقاعدہ یہ کہہ دیا تھا کہ گھر بیٹے کا ہے اور فلیٹ بیٹی کا ہے اور گھر بیٹے کے نام کئے ہوئے اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔کیا ایسی صورت میں والد صاحب بیٹے کو گھر اور بیٹی کو فلیٹ دے سکتے ہیں، جبکہ دونوں کی قیمت میں دس گنا کا فرق ہے۔اب والد صاحب کا مطالبہ ہے کہ جو گھر میں نے تم کو دیا تھا وہ مجھے واپس کر دو۔(محمد فاروق عمران، A-10، کے ڈی اے سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

ہر عاقل و بالغ شخص اپنے ہر قول و فعل کا ذمہ دار ہے۔شریعت کی رو سے بھی اور قانون کی نظر میں بھی، لہذا کسی شخص پر اپنی بالغ اولاد کے کسی فعل یا لین دین کی ذمہ

داری عائد نہیں ہوتی۔ جہاں تک اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا سوال ہے تو اس کا اختیار شرعاً والدین کو نہیں ہے، کیونکہ وراثت یا ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مر جاتا ہے۔اس متروکہ مال میں مرنے والے کو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال پر وصیت کے ذریعے تصرف کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ وفات سے پہلے اپنی زندگی میں ایسی وصیت کر چکا ہو، لیکن وصیت میں بھی یہ شرط ہے کہ وارث کے حق میں وہ معتبر ومؤثر نہیں ہوتی۔ باقی متروکہ مال پر وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رد کرنے یا اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، کسی ایک وارث کے حق میں بھی وصیت کو اس لئے نا قابلِ اعتبار اور غیر مؤثر قرار دیا گیا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے مقررہ نظام وراثت میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذی حقّ حقّه فلا وصية لوارث"

ترجمہ:"ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے،(سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسۃ الریان، بیروت)"۔

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کا کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله ﷺ: "من فرّ من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة"۔

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کر دے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

اولاد میں سے کسی کو اپنے ماں باپ سے ان کی زندگی میں یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ اپنے مال یا جائیداد یا وراثت میں سے ہمیں حصہ دو۔ ہر عاقل و بالغ زندہ شخص کو اپنے مال پر شرعی حدود میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ اور جب تک کوئی شخص زندہ ہے، اس کا مال اس کی ملکیت ہے، ترکہ یا وراثت نہیں ہے کہ کوئی وارث بن کر اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک و مختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ "ھبہ" کہلائے گا اور "ھبہ" میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک ہے:

حدثنی النعمان بن بشیر انّ امّہٗ بنتَ رواحۃَ سالَت اباہ بعضَ الموھوبۃ من مالہ لابنھا، فالتوی بھا سنۃً، ثمّ بدا لہ۔ فقالت: لا ارضی حتّٰی تُشھدَ رسول اللہ ﷺ علیٰ ماوھبتَ لابنی، فاخذ ابی بیدی، وانا یومئذٍ غلام، فاتیٰ رسول اللہ ﷺ فقال: یارسول اللہ ﷺ! انّ اُمّ ھذا، بنتَ رواحۃَ، اَعجبھا ان اُشھدک علی الذی وَھبتُ لابنھا، فقال رسولُ اللہ ﷺ: "یا

بشيرًا ألكَ ولدٌ سوىٰ هذا؟" قال: نعم، فقال: اكلّهم وهبت له مثل هذا؟ قال: لا ـ قال: فلا تشهدني إذن، فانّي لا اشهدُ علىٰ جورٍ".

ترجمہ: ''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (حضرت نعمان) کو ھبہ کردیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انھیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ھبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے ۔اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، انہوں نے کہا! یارسول اللہ ﷺ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ کرلوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ہبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ھبہ کیا ہے؟، انھوں نے کہا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4104، جلد: 7، مطبوعہ نزار مصطفیٰ الباز الریاض، مکۃ المکرمۃ)

مذکورہ حدیث سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ھبہ کرے تو تمام اولاد کے درمیان مساوات کو روا رکھے، لیکن اگر کوئی خاص شرعی وجہ موجود ہو تو اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ بھی دے سکتا ہے مثلاً زیادہ فرماں بردار ہے یا معذور ہے تو دیگر ورثاء کی رضامندی سے اسے زیادہ دے سکتا ہے ۔تاہم باپ کی زندگی میں اولاد کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی وراثت تقسیم

کر دیں، کیونکہ ابھی تو ماشاء اللہ وہ حیات ہیں، اور ان کا مال ترکہ تو ان کے انتقال پر بنے گا، اُس وقت جو شرعی ورثاء موجود ہوں گے، وہ حسبِ احکامِ شریعت اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔

ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے کو حدیث پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) العائد فی ھبته کالعائد فی قیئه۔ ''ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۶۲)''۔

(۲) مثل الذی رجع فی صدقته کمثل الکلب یقیء ثم یعود فی قیئه فیاکله۔ ''جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۵۸)''۔

ایک یا دو اشخاص کا دیگر ورثاء کی موجودگی میں تمام جائیداد پر قابض ہو جانا

سوال: 142

عرض یہ ہے کہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے والد کا فیڈرل بی ایریا میں ڈبل اسٹوری مکان ہے، جس میں اوپر نیچے دو بھائی رہتے ہیں، ہم کل آٹھ بہن بھائی (تین بھائی اور پانچ بہنیں) ہیں، باقی بھائی بہنوں کی خواہش ہے کہ انہیں ان کا حصہ دے دیا جائے جب بڑے بھائی سے میں نے کہا کہ تم ماں باپ کے مرنے کے بعد اس مکان میں ناجائز رہ رہے ہو اس میں سب کا حق ہے تو اس نے کہا کہ فتویٰ لے آؤ، آپ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دے دیں، (ارشد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں، تو ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترتیب کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ "للذکر مثل حظ الانثیین" (ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت تقسیم ہوگا۔ یہ درست ہے کہ ترکہ تمام ورثاء کے درمیان اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق جلد تقسیم ہوجانا چاہیے تھا اور اس ترکے میں تمام ورثاء کا حصہ ہے، کسی بھی وارث کونظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ متوفی کے ترکے کے گیارہ حصے ہوں گے، ہر بھائی کو دو حصے اور ہر بہن کو ایک حصہ ملے گا۔ جب تمام ورثاء اپنے حصے کے طلبگار ہوں تو کسی ایک یا دو ورثاء کا زبردستی دوسروں کے حصے پر غاصب وقابض بن کر رہنا درست نہیں ہے۔

لاوصیۃ لوارث

سوال: 143

ایک سروے زمین جس کے سروے نمبر: 522,99,96,94 ہیں، جو تقریباً 22 ایکڑ رقبے پر واقع دیھ ملھ تپودرسانو چھنومراد میمن گوٹھ ضلع ملیر کراچی میں واقع ہیں۔ جس کا اصل مالک مرحوم حاجی روزو ولدیت حاجی انگارو مرحوم ہیں، حاجی روزو کے انتقال کے بعد تین بیٹے بنام، عبد، الیاس، یوسف اور چار بیٹیاں (بشمول حاجیانی مریم) ہیں۔ گورنمنٹ سندھ (ریوینیو ڈپارٹمنٹ) کے مطابق پوری زمین صرف تین بیٹوں کے نام کردی گئی ہے اور بیٹیوں کو اپنے حق سے محروم رکھا گیا ہے اور

ریکارڈ میں یہ لکھا گیا ہے کہ حاجی روزو نے اپنی زندگی میں پوری زمین صرف اپنے بیٹوں کے نام کردی ہے۔اس کا ریکارڈ میں نہ کوئی گواہ ہے نہ ہی شہادت۔ہمیں اس بات کا خدشہ ہے کہ ریکارڈ میں غلط اندراج کیا گیا ہے۔شرعی نقطہ نظر سے حاجیانی مریم جو حاجی روزو مرحوم کی حقیقی وارث ہے اس کا مندرجہ بالا سروے نمبر میں اس صورتِ حال میں حق بنتا ہے کہ نہیں؟،(عبداللہ میمن، 814, بلاک 16 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 10 حصوں میں منقسم ہوگا۔تین بیٹوں کو 6 حصے (ہر ایک کو 2 حصے) چار بیٹیوں کو 4 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے ،گورنمنٹ سندھ (ریونیو ڈپارٹمنٹ) کے مطابق کاغذات میں جن بیٹوں کو نامزد (Nominate) کیا ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں اور اگر مرحوم نے اپنی زندگی میں بیٹوں کے نام کیا ہو تو شرعاً جائز نہیں اور اگر وصیت بھی کی ہو تو وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ یقول: انّ الله قد أعطی کل ذی حقّ حقّه فلا وصیة لوارث"۔

ترجمہ:''ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے تو

(اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، موسسۃ الریان بیروت)"۔

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کا کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلا وجہِ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله ﷺ: "من فرّ من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة" .

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کر دے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

بہر حال صورتِ مسئولہ میں مرحوم روزو خان کا ترکہ اس کے تمام ورثاء میں اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیمِ ترکہ میں مقدم کون؟

سوال: 144

چوہدری سردار خان کا انتقال 1939ء میں ہوا، ان کی اولاد اور پسماندگان میں متعدد ورثاء تھے، جن کو ایک نقشے کی صورت میں ہم نے ان سب کی تواریخ وفات کے ساتھ مرتب کر کے اس استفتاء کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ان کے پوتے وحید اسلم کا 1986ء میں انتقال ہوا، متوفی وحید اسلم کے ورثاء میں ان کے تین حقیقی چچا، دو حقیقی پھوپھیاں اور چار سوتیلے چچا اور دو سوتیلی پھوپھیاں ہیں۔لیکن وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے تینوں حقیقی چچا اور ایک حقیقی پھوپھی وفات پا چکی تھیں، ان کی وفات کے وقت ان کی چار سوتیلے (علاتی) چچا اور ایک حقیقی اور دو سوتیلی

پھوپھیاں حیات تھیں ۔اسکے علاوہ حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی چچازاد) کی اولادبھی مو جودتھی ۔یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ وحیداسلم متوفی 1986ء کے والد کے نکاح میں دو بیویا ں تھیں، وحیداسلم کی حقیقی والدہ ان سے پہلے 1948ء میں وفات پا چکی تھیں جبکہ ان کی سوتیلی والدہ رحیم جان نے وحیداسلم کے بعد 1989ء میں وفات پائی ۔ہم نے چوہدری سردارخان کے ورثاء کا مفصل نقشہ بھی منسلک کردیا ہے، کتاب وسنت اورفقہ حنفی کی روشنی میں بتائیں کہ وحیداسلم متوفی 1986ء کی وراثت کے حقدار کون کون ہیں، اورکون سے ورثاءمحروم رہیں گے؟، (محمدامجد ریٹائرڈ سیشن جج، ماڈل ٹاؤن، بہا ول پور)۔

جواب:

اگرسائل کابیان درست ہے، اورمتوفی وحیداسلم کے ورثاءوہی ہیں، جو سوال میں مذکورہیں، اوروہ لاولد ہے ،تو ازروئے شرع سب سے پہلے اس کے ترکے سے اسکی تکفین وتدفین کے مصارف وضع کئے جائیں گے، اس کے بعد اس کے ذمہ اگرکسی کاکوئی قرضہ تھا،تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگراس نے کوئی وصیت کی ہو گی تو بقیہ ترکے کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حدتک وہ نافذ العمل ہوگی ۔بعدازاں جو ترکہ بچے گا،شریعت کے قانون وراثت کے مطابق اس کے شرعی وارثوں میں تقسیم ہو گا، اس کاترکہ چارحصوں پر منقسم ہوگا اوراس کے سوتیلے چچاؤں میں سے ہرایک کو ایک ایک حصہ ملے گا (یعنی فی کس 1/4 حصہ)۔

ہمیں استفتاء میں چوہدری سردارخان کے ورثاء کا مفصل نقشہ فراہم کیا گیا ہے، لیکن اس میں جو

جواب مطلوب ہے، وہ چوہدری سردارخان مرحوم کے پوتے وحیداسلم ولدمحمد اسلم خان

متوفی 1986ء کے ترکے سے متعلق ہے۔یہ امر ملحوظ رہے کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کے حصہ میں جو موروثی مال آیا ہے وہ اس کے والد محمد اسلم خان ولد چوہدری محمد سردار خان متوفی 1984ء کا ترکہ ہے، ممکن ہے اس کا اپنا کوئی کمایا ہوا مال بھی ہو تو وہ بھی اس کے مجموعی ترکے میں شامل ہوگا، البتہ محمد اسلم خان ولد چوہدری سردار خان کا جو ترکہ وحید اسلم کو منتقل ہوگا، اس میں سے ایک 1/8 حصہ محمد اسلم خان کی بیوہ رحیم جان متوفی 1989ء (جو کہ وحید اسلم کی سوتیلی والدہ ہیں) کو ملے گا، جو محمد اسلم کی وفات کے وقت حیات تھیں، چونکہ بعد میں یہ 1989ء میں وفات پا گئیں، اس لئے ان کا ترکہ ان کے اُن شرعی ورثاء کو منتقل ہوگا، جو اِن کی وفات کے وقت موجود تھے۔وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت ان کے حقیقی چچا وفات پا چکے تھے، البتہ انکے چار سوتیلے چچا زندہ تھے، اور ان کی ایک حقیقی پھوپھی اور دو سوتیلی پھوپھیاں زندہ تھیں۔حقیقی چچا اس لئے محروم ہو گئے کہ جو وارث، مورِث (جس کی وراثت تقسیم ہو رہی ہے) کی وفات سے پہلے فوت ہو گیا ہو، وہ اسکا وارث نہیں بنتا، حق وراثت ان لوگوں کیلئے ہوتا ہے جو مورِث (وفات یافتہ شخص) کی وفات کے وقت زندہ ہوں، وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت اس کی حقیقی پھوپھی جنت بی بی متوفی 1991ء، سوتیلی پھوپھی متوفی 2003ء اور شفیقہ بیگم (بدستور حیات) زندہ تھیں، لیکن یہ سب وراثت سے محروم رہیں گی، کیونکہ یہ پھوپھیاں ذوی الارحام بنتی ہیں اور چار سوتیلے چچا عصبات، اور اسلام کے قانون وراثت کا شرعی اصول یہ ہے کہ عصبات ورثاء کی موجودگی میں ذوی الارحام ورثاء ترکے سے محروم رہیں گے، اسی طرح وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے وفات یافتہ حقیقی چچاؤں کی اولاد بھی جو کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت بقید حیات تھے، ان کے ترکے سے محروم رہیں

گے، کیونکہ اسلامی قانون وراثت کا مسلمہ اصول ہے کہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے، اور یہاں سوتیلے چچا ایک قرابت کے حامل ہونے کے باوجود حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی ابنائے اعمام) کے ذوقرابتین ہونے کے باوجود ان کے قریب سے ہیں لہٰذا سارا ترکہ سوتیلے چچاؤں کو ملے گا اور حقیقی چچازاد محروم رہیں گے۔ یہاں تک ہم نے مسئلے کا خلاصہ آسان الفاظ میں لکھ دیا ہے، اب سطور ذیل میں فنی بنیاد پر دلا ئل کے

ساتھ جواب ملاحظہ فرمالیجئے:

''برتقدیر صدق بیانِ سائل صورۃ مستفسرہ میں مرحوم وحید اسلم کی وراثت چاروں سو تیلے چچاؤں کو ملے گی۔ اور بعد ادائے حقوق مترتبہ متقدمہ، تکفین وتجہیز اور ادائے قرض اور مال کے تیسرے حصہ سے تنفیذ وصیت، کل جائیداد کے چار حصے کئے جائیں گے اور ہر ایک سوتیلے چچا کو ایک ایک حصہ آئے گا۔ حقیقی چچاؤں کی اولاد، حقیقی پھوپھی اور سوتیلی پھوپھیاں جو کہ مرحوم کے وفات کے وقت زندہ تھیں حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد تو اس لئے محروم ہوگی کہ عصبات اقرب اگرچہ اضعف ہو، ابعد کو محروم کردیتا ہے اور یہاں اگرچہ سوتیلے چچا ذوات قرابتین نہیں اور حقیقی چچاؤں کی مذکر اولا د ذوات قر ابتین ہیں لیکن سوتیلے چچے میت سے اقرب ہونے کی وجہ سے حقیقی چچاؤں کی مذکر اولا کو محروم کردیں گے اور مرحوم کی حقیقی اور سوتیلی پھوپھیاں اور حقیقی چچاؤں کی مؤنث اولاد ذوی الارحام میں سے ہیں اور عصبات کے ہوتے ہوئے ذوی الارحام محرم ہو تے ہیں۔

درمختار میں ہے:

ثم جزء جده العم لا بوین ثم لا ب ثم ابنه لا بوین ثم لا ب۔

ترجمہ: میت کے دادا کی جز یعنی چچا حقیقی پھر سوتیلا چچا پھر حقیقی چچا کا بیٹا پھر سوتیلے چچا کا بیٹا (ص: 547 مکتبہ ماجدیہ)

معلوم ہوا اگر حقیقی چچا ورثاء میں موجود نہ ہو تو سوتیلا چچا وارث ہوتا ہے اور حقیقی چچا کا بیٹا اس وقت وارث ہوگا جب سوتیلا چچا ورثاء میں موجود نہ ہوں یہ عبارت بعینہ صورت مسئولہ کا جواب ہے۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق کے متن میں ہے:

ثم الا عما م ثم اعما م الا ب ثم اعما م الجد علی التر تیب۔

ترجمہ: پھر متوفی کے چچا پھر متوفی کے باپ کے چچا پھر دادا کے چچا ترتیب پر۔

شارح علیہ الرحمہ نے فرمایا: (قولہ علی التر تیب) ای علی التر تیب الذی ذکر نا فی الاخوۃ وھو ان یقدم العم لا ب وام علی العم لاب ثم العم لا ب علی ولد العم لا ب وام کذا یعمل فی اعما م الا ب یقد م منھم ذو قرابتین عند الا ستواء فی الدرجۃ وعند التفاوۃ فی الدرجۃ یقدم الا علیٰ۔

ترجمہ: ''(ماتن کا قول علی الترتیب) یعنی چچاؤں میں ترجیحات اسی ترتیب پر ہونگی ،جس ترتیب کو ہم نے بھائیوں میں ذکر کیا، وہ یہ کہ حقیقی چچا سوتیلے چچا، سے مقدم ہوگا ،پھر سوتیلا چچا حقیقی چچا کی اولاد سے مقدم ہوگا ،اسی طرح باپ کے چچاؤں میں ان میں سے دو قرابت والوں کو مقدم رکھا جائے گا جبکہ درجے میں مساوی ہوں اور درجے میں تفاوت کی صورت میں اقرب (Nearest) کو مقدم کیا جائے گا، (تبیین الحقائق جلد 6 ص: 632، بحر الرائق شرح کنز الدقائق جلد 4 ص: 498 مکتبہ سعید ایچ ،ایم کمپنی)''۔

نیز ، البحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے: واذااستوی ابنا ن فی درجۃ من

االعصبات وفي احدهما قرابة زائدة فهي اولیٰ ،الا ان یکون الا خ اقرب الی المیت ،مثا ل القرابة الزائدة اخ لا ب وام واخ لا ب،فالا خ من الا ب والام اولیٰ،ومثا ل السبق اخ لا ب وابن اخ لا ب وام، فالاخ اولیٰ لا نه اسبق الی المیت ۔

ترجمہ:''اگر عصبات میں دو بیٹے درجے میں مساوی ہوں،اوران میں سے ایک میں زائد قرابت ہو،تو زائد قرابت والا اولیٰ ہوگا،مگر یہ کہ بھائی میت کے زیادہ قریب ہو، قرابت زائدہ کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک حقیقی بھائی ہے اور ایک علاتی (باپ شریک)بھائی ہے،تو حقیقی بھائی ،علاتی بھائی سے زیادہ قریب ہے ،اور سبقت کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک علاتی بھائی ہے اور ایک حقیقی بھتیجا ہے،''تو علاتی بھائی حقیقی بھتیجے کی بہ نسبت میت سے زیادہ سبقت رکھتا ہے''،(ص:98جلد 4)۔

درمختار کی عبارت:''ثـم لا ب ثـم ابنـــــه لا بـو یـن'' اور''تبیین الحقائق''اور ''البحرالرائق'':''ثم العم لا ب علی ولد العم لا ب وام'' ۔

صورت مسئولہ کے جواب میں نص ہے ،لہٰذا مرحوم وحید اسلم کی جائیداد چاروں سوتیلے چچاؤں میں برابر برابر تقسیم ہوگی اور باقی افراد محروم ہونگے ،واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیم ترکہ اور برتھ لاء

سوال:145

برائے مہربانی قرآن اور حدیث کی روشنی میں فتویٰ عنایت فرمائیں۔ایک شخص چوہدری سردار خان ،جس کا انتقال 1939ء میں ہوا۔اس کے سات بیٹے، چار بیٹیاں اور دو بیوہ تھیں۔جائیداد کا انتقال ان کی وفات کے بعد بیٹوں کے نام ہوگیا ،اور اس جائیداد کو پچھلے ماہ 2006ء میں فروخت کیا گیا۔بیٹے کہتے ہیں کہ چونکہ

اس وقت برٹش لاء تھا اور بیٹیوں اور بیوگان کو جائیداد میں حصہ نہیں ملتا تھا، اس لئے ان کا اس رقم میں کوئی حصہ نہیں بنتا۔ جبکہ ہماری گذارش ہے کہ قرآن اور حدیث کا قانون جو سورۂ نساء میں ہے، اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے، برائے مہربانی آپ اس کے بارے میں فتویٰ عنایت فرمائیں اور جو اس پر عمل نہیں کرے گا آخرت میں اس کی کیا سزا ہوگی؟، (ندیم الحق، اسٹاف آفیسر ٹو چیئر مین PIA، اسلام آباد)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کیے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ برٹش لاء سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا مقررہ قانون وراثت منسوخ نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کا قانون سب پر غالب ہے اور مسلمانوں کو احکامِ الٰہی پر عمل کرنا چاہئے نہ کہ برٹش لاء پر، اگرچہ برطانوی دور میں ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء نافذ تھا، اور اسلام کا قانون وراثت قانوناً نافذ العمل تھا، لہٰذا یہ موقف سراسر باطل ہے۔

صورت مسئولہ میں متوفّٰی چوہدری سردار خان کا ترکہ کل 144 حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے دو بیوگان کو 18 حصے (یعنی فی کس 9/144 حصے)، سات بیٹوں کو 98 حصے (یعنی فی کس 14 / 144 حصے)، چار بیٹیوں کو 28 حصے (یعنی فی کس

7/144 حصے) ملیں گے۔ اگر کوئی کسی شخص کا حق غصب کرے گا، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وعید ہے: "من اقتطع شبراً من الارض ظلماً، طوّقه الله ايّاه يوم القيامة من سبع أرضين"۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4055)''۔ اس کے بعد ان میں سے جو افراد وفات پا چکے ہیں تو ان کا حصۂ وراثت ان کے وارثوں کو منتقل ہو جائے گا، تا آنکہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچے گا، تقسیم وراثت کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی مورث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) کے انتقال کے فوراً بعد اس کی وراثت تقسیم نہ کی گئی ہو اور پھر اس پر کافی عرصہ گزر چکا ہو، یہاں تک کہ اس دوران کچھ ورثاء وفات پا چکے ہوں تو انہیں زندہ فرض کر کے ان کا حصۂ وراثت ان کے نام پر منتقل ہوگا، اور پھر وہی حصہ مرحلہ بہ مرحلہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچ جائے گا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

لاولد چچا کے ترکے میں بھتیجے اور بھتیجیوں کا حق وراثت

سوال: 146

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ش کی کوئی اولاد نہیں تھی، زوجہ کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور نہ ہی کوئی بھائی یا بہن ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے دو بھتیجوں کو کاروبار میں 50% کا حصہ دار قرار دیا۔ ش کا انتقال ہو چکا ہے اور دونوں بھتیجے دوسرے حصہ دار سے معاملات طے کر کے کاربار کو ختم کر رہے ہیں۔ اور دونوں بھائی ان کی جائیداد میں سے حصہ لے رہے ہیں جبکہ ان بھتیجوں کی 4 بہنیں بھی ہیں۔ ان بھتیجوں اور بھتیجیوں کی شادی بھی چچا نے کی ہے۔ کیا چچا کی اس

وراثت میں بھتیجیاں حصہ لینے کی حقدار ہیں یا نہیں ؟۔ براہِ کرم تفصیل سے قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں،(کوثر پروین،فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفیٰ شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:(1)اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے ہیں(2)اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہوتو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے(3)اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہوتو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے،بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو،یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں،ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ایسا مُورِث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) جو لاولد ہو،اس کے ماں باپ بھی اس سے پہلے وفات پا چکے ہوں،بیوی نہ ہو یا وفات پا چکی ہو،اسے قرآن کی اصطلاح میں ''کلالہ'' کہتے ہیں۔اس کی وراثت کے احکام ''سورۃ النساء'' میں بیان کئے گئے ہیں۔صورتِ مسئولہ میں اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو چونکہ متوفی کے ورثاء میں اس کے دو بھتیجے اور چار بھتیجیاں ہیں اور ذوی الفروض میں کوئی قرابت دار موجود نہیں،لہٰذا دونوں بھتیجے عصبہ بنیں گے اور کل ترکہ انہیں ملے گا،بھتیجیاں محروم رہیں گی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: الحقوا الفرائض بأھلھا فما بقی فھو لاولیٰ رجل ذکر۔

ترجمہ: ''ذوی الفروض (یعنی وہ ورثاء جن کے حصے قرآن میں مقرر ہیں) کو ان کے

مقررہ حصے دے دو، سو جو کچھ ان سے بچ رہے تو وہ قریب ترین مرد وارث کے لئے ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6735)"۔

علامہ ابن عابدین شامی بحوالہ "سراجی" لکھتے ہیں:

لا فرض لھا من الاناث واخوھا عصبة لا تصیر عصبة بأخیھا کالعم والعمة المال کله للعم دون العمة۔

ترجمہ: "وہ عورتیں جن کا کوئی فرض حصہ مقرر نہیں اوران کا بھائی عصبہ ہے تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ عصبہ نہیں بنیں گی، جیسا چچا اور پھوپھی کہ کل ترکہ چچا کو ملے گا نہ کہ پھوپھی کو، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 10، ص: 429، داراحیاء التراث العربی ،بیروت)"۔

اس کی شرح میں مفتی یار محمد قادری لکھتے ہیں: کذالك ابن العم یرث دون بنت العم وابن الاخ یرث دون بنت الاخ۔

ترجمہ: "اوراسی طرح چچا کا بیٹا وارث بنے گا نہ کہ چچا کی بیٹی اوراسی طرح بھتیجا عصبہ بنے گا نہ کہ بھتیجی، (مشکوٰۃ الحواشی فی شرح السراجی، ص: 60)"۔

لاولد پھوپھی کے ترکے میں مقدم سگے یا سوتیلے بھتیجے

سوال: 147

ایک شخص فضل دین کا انتقال ہوا اوراس کی دو بیویاں تھیں ان دونوں کا انتقال فضل دین سے پہلے ہو چکا تھا۔ایک بیوی سے دو بیٹے اورایک بیٹی دوسری بیوی سے ایک بیٹا اورایک بیٹی ہیں۔دوسری بیوی سے جوایک بیٹی سید خانم ہیں ان کے شوہر کا انتقال پہلے ہو چکا تھا وہ لاولد تھیں۔میں سید خانم کا سگا بھتیجا ہوں،اوراپنے والدین

کا اکلوتا بیٹا ہوں، میری پھوپھی سید خانم کے سگے بھائی اور دو سوتیلے بھائیوں اور سوتیلی بہن کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا۔ سید خانم کے سوتیلے بہن بھائیوں کی اولاد حیات ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سید خانم کا ترکہ صرف مجھے (حقیقی بھتیجے) کو ملے گا یا ان کے سوتیلے بھتیجوں اور بھتیجیوں کو بھی ملے گا، (محمد یوسف، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق متعلق ہوتے ہیں (1) اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کیے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ فضل دین کا ترکہ 8 حصوں میں منقسم ہوگا، اس میں سے ان کے تین بیٹوں کو 6 حصے (فی کس 2 حصے) اور 2 بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس ایک حصہ) ملے گا، لہٰذا آپ کی پھوپھی سید خانم کا اپنے والد کے ترکے میں سے 1/8 حصہ بنے گا۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کی پھوپھی لاولد تھیں آپ کے بیان کے مطابق ان کے شوہر کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا اور آپ اپنی پھوپھی کے صرف ایک ہی حقیقی بھتیجے ہیں اور باقی ان کے سوتیلے (یعنی علاتی) بھتیجے بھانجیاں ہیں، لہٰذا آپ ان کے عصبہ وارث بنیں گے اور مرحومہ سید خانم کا پورا ترکہ آپ کو ملے گا، سراجی میں ہے: وابن الاخ لاب وام اولیٰ من ابن الاخ لاب۔ ترجمہ: ''یعنی حقیقی بھتیجا، علاتی (صرف باپ شریک) بھتیجے سے ترکہ پانے میں مقدم ہے''۔

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

سوال: 148

ایک شخص نے ایک کتابیہ (عیسائی) عورت سے شادی کی ،اس سے اس کی اولاد ہوئی ۔پھر اس (شوہر) کا انتقال ہوگیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(1) کیا وہ عیسائی عورت اپنے شوہر کی وارث بنے گی؟۔

(2) اور اس کی اولاد نے اگر عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے تو کیا وہ وارث بن پائیں گے؟۔

(3) اگر بچے نابالغ ہیں تو کیا وہ وارث بنیں گے؟، (ایم،عتیق الرحمٰن سیال)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:عن اسامة بن زيد ان النبي ﷺ قال:

لا يرث المسلم الكافر ولا يرث الكافر المسلم:

ترجمہ:"حضرت اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے، نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے، (صحیح مسلم رقم الحدیث: 4028، ابی داؤد رقم الحدیث: 2901)"۔

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور جمہور صحابہ اور فقہاء، تابعین اور بعد کے علماء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا، (شرح مسلم للنووی، جلد 2 ص: 34، نور محمد اصح المطابع)"۔

میراث سے محروم کرنے والے چار اسباب ہیں، ایک سبب دین کا اختلاف ہے، یعنی میت اور وارث کا دین ایک دوسرے سے مختلف ہو۔

عن عمروبن شعیب ، عن ابیه ، عن جده عبداللّٰہ بن عمروقال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: لایتوارث اھل ملتین شتیٰ۔

ترجمہ: ''حضرت عمروبن شعیب اپنے والد اوردادا عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دومختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے، (سنن ابی داؤدرقم الحدیث: 2903)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واختلاف الدین ایضا یمنع الارث والمرادبہ الاختلاف بین الاسلام والکفرواما اختلاف ملل الکفار کالنصرانیة والیھودیة والمجوسیة وعبدة الوثن فلا یمنع الارث حتی یجری التوارث بین الیھودی والنصرانی والمجوسی واختلاف الدارین یمنع الارث کذا فی التبیین۔ولکن ھذا الحکم فی حق اھل الکفرلافی حق المسلمین۔

ترجمہ: ''اوردین کا اختلاف بھی مانع ارث ہے، اوراس سے مراد اسلام اور کفر کے درمیان اختلاف ہےاور جب اختلاف کفارقوموں کے درمیان ہو،جیسا کہ نصرانی اور یہودی اورمجوسی اوربت پرست،تو پھر وہ وراثت سے مانع نہیں ہوگا (یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں)۔یہاں تک کہ یہودی اورنصرانی اورمجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اوردار کا مختلف ہونا (یعنی دارالاسلام ودارالحرب) مانعِ وراثت ہے،جیسا کہ تبیین میں بیان کیا گیا ہےاوریہ حکم اہل کفر کے حق میں ہے نہ کہ مسلمان کے حق میں، (عالمگیری جلد6 ص: 454مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(واختلاف الدین)واسلاماً و کفراً۔

ترجمہ: ''(اور دین کا مختلف ہونا) مانعِ وراثت ہے یعنی کہ اسلام اور کفر کا اختلاف''۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قید به لأنّ الکفار یتوارثون فیما بینهم وان اختلف مللهم عندنا،لأنّ الکفر کله ملة واحدة۔

ترجمہ: ''یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفار ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں اگر چہ انکا تعلق مختلف ملتوں سے ہو،اس لئے کہ تمام کفر ملّتِ واحدہ ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 10 ص : 418،مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس مسلّمہ شرعی اصول کے تحت کتابیہ عورت (خواہ نصرانی ہو یا یہودی) اپنے متوفّٰی مسلمان شوہر کی وارث نہیں بن سکتی۔مسلمان شوہر اور کتابیہ عورت کی اولاد اگر نابالغ ہے تو وہ دین میں ''خیرالابوین'' کے تابع ہے،یعنی انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے ان کے مسلمان باپ کی وراثت میں حصہ دیا جائے اور اگر وہ بالغ ہیں تو مسلمان ہونے کی صورت اپنے باپ کے وارث بنیں گے،لیکن اگر خدانخواستہ بالغ ہونے کے بعد وہ نصرانی یا یہودی بن گئے ہیں تو مسلمان باپ کی وراثت سے محروم رہیں گے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والولد یتبع خیر الأبوین دیناً)ان اتحدت الدار ولو حکماً، بان کان الصغیر فی دارنا والأب ثمة،

ترجمہ: ''اور اولاد دین میں خیرالابوین (یعنی ماں باپ میں سے جس کا دین بہتر ہو، جیسے ایک یہودی یا نصرانی ہے اور دوسرا مسلم،تو نابالغ اولاد مسلم متصور ہوگی، اگر ایک نصرانی ہے اور دوسرا مجوسی یا مشرک ہو تو نابالغ اولاد نصرانی متصور ہوگی) کے

تابع ہوتی ہے، اگر دار ایک ہی ہو، خواہ حکماً ہی سہی، جیسے نابالغ اولاد دارالاسلام میں ہے اور باپ بھی وہیں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 4 ص: 276 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

تقسیمِ وراثت سے متعلق چند اہم اصولی امور کی وضاحت

ہمیں روزنامہ ایکسپریس کی معرفت ترکے اور وراثت کے متعدد سوالات موصول ہوئے ہیں۔ سوالات کا براہِ راست جواب دینے سے پہلے ہم چند امور کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، اور ہر ترکے کی تقسیم سے پہلے ان کا نفاذ ضروری ہے، ہم نے یہ وضاحت اس لئے مناسب سمجھی تاکہ وراثت کے ہر سوال کے جواب میں ان کا بار بار تکرار نہ ہو، وہ امور یہ ہیں: (1) کوئی شخص زندگی میں اپنا مال اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو یہ تقسیم وراثت یا تقسیم ترکہ نہیں کہلائے گی بلکہ ھبہ (Gift) کہلائے گا، یہ ایک رضا کارانہ عمل ہے، اس لئے اس شخص کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ کتنا مال تقسیم کرے اور کتنا اپنے لئے پس انداز کرے۔ (2) بیوی شوہر کو یا شوہر بیوی کو جتنا مال ھبہ کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔ (3) اولاد کو ھبہ کرنا ہو تو مستحسن اور مستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے، امتیاز نہ برتا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ (4) (الف) اگر اولاد میں سے کسی کو اس کی غیر معمولی خدمات کا لحاظ کرکے یا اس کی کسی ذہنی یا جسمانی پسماندگی کی بنا پر یا نسبتاً زیادہ ضرورت مند ہونے کے سبب یا دینی فضیلت کی بنا پر نسبتاً زیادہ دینے کا ارادہ ہو تو دوسروں کو اعتماد میں لے لیا جائے، تو بہتر ہے۔ (ب) اگر اولاد میں سے کوئی آوارہ و بدکردار ہے، حرام کاری اور عیاشیوں میں مبتلا ہے، تو اسے ھبہ کے وقت محروم رکھا جاسکتا ہے یا اس کے حصے میں کمی کی جاسکتی

ہے۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا کہ: ایک شخص کی اولاد ایک لڑکے اور تین لڑکیوں پر مشتمل ہے،لڑکا بدچلن اور بد وضع ہے، اپنی بہنوں اور باپ کو نہایت اذیت اور تکلیف دیتا ہے، زید اسے عاق کرنا چاہتا ہے کہ وہ ترکے میں سے حصہ نہ پائے۔آپ نے جواب دیا: ”عاق کرنا شرع میں کوئی چیز نہیں، نہ وہ اس کے سبب ترکے سے محروم ہوسکتے ہیں، ہاں اگر واقعی فاسق وآوارہ ہےتو یہ جائز ہے کہ اپنا سب مال بذریعہ وقف علی الاولاد یا بذریعہ بیع نامہ جدا جدا تقسیم کرکے قبضہ دے کر بذریعہ ھبہ نامہ اپنی بیٹیوں کےنام کردے،یوں بیٹے کوآپ ہی کچھ نہ پہنچے گا، (فتاویٰ رضویہ،جلد:26،ص: 364،مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)“۔ (5)اولاد کو ماں باپ کی زندگی میں تقسیم وراثت کے مطالبے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ ''ترکہ'' یا ''وراثت'' اسے کہتے ہیں ، جو مال کوئی شخص اپنی موت کے بعد پیچھے چھوڑ جائے۔ (6)میت کےترکے میں سب سے پہلے تین قسم کے مصارف ترجیح ذیل کے مطابق وضع کئے جانے لازمی ہیں: (الف) میت کی تکفین وتدفین کےمصارف، اگر کوئی ایک وارث رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے کرنا چاہےتو کرسکتا ہے۔(ب)اس کےبعد اگر میت کےذمہ کسی کا کوئی قرضہ ہےتو وہ ادا کیا جائے گا۔(ج)اگر وفات یافتہ شخص نے بیوی کا حق مہر اپنی زندگی میں ادانہیں کیا، نہ ہی بیوی نے اپنا مہر معاف کیا ہےتو ترکہ میں سے بیوی کا دینِ مہر قرض کےطور پر ہی وضع کیا جائے گا۔(د) قرض کی منہائی کےبعد،اگر میت نے کوئی وصیت (امورِ خیر،صدقۂ جاریہ وغیرہ سے متعلق) کی ہےتو اسے ترکے میں سے پورا کیا جائے گا،لیکن وصیت کی تنفیذ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک ہوگی،اس سے زائد باطل (Invalid)قرار پائے گی۔البتہ اگر کوئی ایک یا بعض یا سب ورثاء بالغ ہیں اوروہ رضا کارانہ اپنے متوفی باپ/ماں

یا عزیز کی پوری وصیت نافذ کرنا چاہتے ہیں، جو تہائی ترکے سے زائد ہے، تو وہ ایسا کرسکتے ہیں اور اس پر یقیناً انہیں بھی اجر ملے گا۔ (7) جہاں تک میت کے لئے ایصالِ ثواب کے مصارف کا تعلق ہے، تو اگر اس نے اپنی وفات سے پہلے ایسی کوئی وصیت کی ہے، تو وہ زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک نافذ العمل ہوگی۔ (8) اگر وصیت نہیں کی تو بالغ ورثاء اپنی طرف سے یا ترکے میں سے اپنے حصے سے کرنا چاہیں تو رضا کارانہ طور پر کرسکتے ہیں، انہیں بھی اس کا اجر ملے گا، کوئی وارث اس پر رضا مند نہ ہو تو اس کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کئے جاسکیں گے۔ (9) نابالغ ورثاء کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کئے جاسکیں گے۔

شوہر اور بیوی کی مشترکہ کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد اور تقسیم ترکہ

سوال: 149

ایک پلاٹ جو بیوی اور شوہر نے مشترکہ طور پر خریدا یعنی بیوی بھی فیکٹری میں کام کرتی تھی اور شوہر بھی۔ دونوں کی کمائی سے پلاٹ خریدا گیا اور شوہر نے وہ پلاٹ اپنی بیوی کے نام سے خریدا۔ بیوی کے انتقال کے بعد پلاٹ کا مالک کون ہوگا؟ جبکہ ورثاء میں اس کا شوہر اور ایک آٹھ سالہ بیٹا بھی ہے کیا بیوی کے والدین اور بھائی حصے دار یا دعوے دار بن سکتے ہیں، جھگڑا کر کے پلاٹ پر زبردستی قبضہ کرسکتے ہیں؟۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو وفات یافتہ خاتون کا ترکہ 12 حصوں میں منقسم ہوگا، جس میں اس کے والد کو 2/12 حصے، والدہ

کو 2/12 حصے،شوہر کو 3/12 حصے اور بقیہ 5/12 حصے بیٹے کو ملیں گے،اس کے بھائی محروم رہیں گے۔ پلاٹ کی خرید میں بیوی اور شوہر کے حصے کا تناسب وہی ہوگا، جو پلاٹ کی قیمت میں ان کے حصے کا تناسب تھا،اگر یہ پلاٹ شراکت کی نیت سے خریدا تھا۔اور اگر شوہر نے اپنا حصہ بیوی کو ھبہ کردیا تھا تو پھر پورے پلاٹ کی وہی مالکہ ہوگی اور اب وہ اس کے ترکے میں شامل ہوگا۔بیوی کے والدین اس کے شرعی وارث ہیں، اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے بھائی محروم رہیں گے،کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کے لئے بڑی وعید آئی ہے حدیث پاک میں ہے:

”من اقتطع شبراً من الارض ظلماً ،طوّقه الله ايّاه يوم القيامة من سبع أرضين “۔

ترجمہ:”جوشخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا،(صحیح مسلم،رقم الحدیث: 4055)“۔

بیوی کا واجب الادا قرضہ کس کے ذمے ہوگا؟

سوال: 150

کسی شخص کی بیوی کے انتقال کے بعد اس کی بیوی پر واجب الادا قرض کی ادائی کون کرے گا۔کیا شوہر اپنی جائیداد مکان وغیرہ فروخت کرکے بیوی کا قرضہ ادا کرے گا؟ان سوالات کے تفصیلی جواب ایکسپریس میں عنایت فرمائیں،بڑی نوازش ہوگی،(محمد فاروق،ملت ٹاؤن،ملیر کراچی)۔

جواب:

متوفیہ کے ترکے سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا،اگر شوہر نے اس کی زندگی

میں اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو وہ شوہر کے ذمہ اس کا قرض ہے، وہ بھی اس کے ترکے میں شامل ہو جائے گا۔ اسے بھی اس کا قرض ادا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، اگر متوفیہ کا ترکہ اس کے قرض کی ادائی کے لئے ناکافی ہو تو اس کے شوہر اور دیگر ورثاء اگر تبرّع واحسان کر کے اس کا قرض ادا کر دیں تو آخرت کے مواخذے سے اُسے نجات مل جائے گی اور ان لوگوں کو اس کا اجر بھی ملے گا، ورنہ قرض خواہوں سے درخواست کی جائے کہ رضاءِ الٰہی کے لئے اس کے ذمہ اپنا قرض معاف کر دیں یا کوئی اور صاحبِ خیر یہ قرض ادا کر دے، ورنہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی ھریرۃ انّ رسول اللہ ﷺ قال اتدرون ماالمفلس قالوا المفلس فینا من لا درھم لہ ولا متاع فقال انّ المفلس من امتی یأتی یوم القیامۃ بصلوٰۃ وصیام وزکوٰۃ ویأتی قد شتم ھذا وقذف ھذا واکل مال ھذا وسفك دم ھذا وضرب ھذا فیعطی ھذا من حسناتہ وھذا من حسناتہ فان فنت حسناتہٗ قبل ان یقضی ماعلیہ اخذ من خطایا ھم فطرحت علیہ ثم طرح فی النار۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے کہا: ہمارے نزدیک مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس درہم ہو نہ کوئی متاع ہو، آپ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا اور اس شخص نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی تھی، کسی کو تہمت لگائی تھی، کسی کا مال کھایا تھا، کسی کا خون بہایا تھا، کسی کو مارا تھا، پھر اسے اس کی نیکیاں مل جائیں گی اور اس سے اس کی نیکیاں جائیں گی اور اگر ان کے حقوق پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو ان کے

گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6457)"۔

زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی

سوال: 151

میرے سات بچے (چار بیٹے، تین بیٹیاں) ہیں، بڑے بیٹے اور تین بیٹیوں کی شادی کردی ہے۔ میرے پاس جائیداد کی صورت میں ایک مکان ہے شوہر بھی حیات ہیں۔ شرعی طور پر جائیداد کی تقسیم کس طرح ہوگی ؟، (ثریا ناز، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب :

زندگی میں جائیداد کی تقسیم بطور ترکہ ومیراث نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ دیا جاتا ہے وہ ھبہ کہلاتا ہے اور مستحسن و مستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے شوہر کو اپنی صوابدید پر جتنا چاہیں دی سکتی ہیں، اپنے لئے جو پس انداز کرنا چاہیں، یہ ان کا حق ہے، آپ کی وفات کے بعد یہ ترکہ شریعت کے مطابق تمام وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

کیا سوتیلا بیٹا اکیلا وارث بن سکتا ہے

سوال: 152

میرے والد صاحب نے پہلی شادی کی تو اس سے ہم تین بہنیں پیدا ہوئیں ہماری والدہ زندہ تھیں کہ والد صاحب نے دوسری شادی کرلی۔ دوسری بیوی کا ایک لڑکا تھا، جو اس کے پہلے خاوند سے تھا وہ بھی ہمارے والد صاحب نے ساتھ ہی لے لیا

۔بعد میں ہماری دوسری والدہ کے ہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں ۔اس طرح ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔

ہمارے والد صاحب کے لئے تقسیم جائیداد کا طریقہ کیا ہے؟۔

اگر اولاد میں جائیداد کی تقسیم نہ کی جائے تو اس کے کیا احکام ہیں؟۔

کیا اولاد میں سے کسی کو جائیداد سے محروم کیا جا سکتا ہے؟۔

کیا کسی ایک شخص کو پندرہ سال پہلے ساری جائیداد کا وارث بنایا جا سکتا ہے؟ کہ وہ اکیلا استعمال کرتا رہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں مکمل وضاحت فرمائیں ،(م ۔ا،نارووال،پنجاب)''۔

جواب:

آپ نے سوال میں اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ آپ کے والد صاحب حیات ہیں یا وہ وفات پا چکے ہیں،اگر وہ بدستور حیات ہیں تو زندگی میں ان کا ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔اسی طرح یہ بھی واضح نہیں کہ آپ کی دوسری والدہ بدستور حیات ہیں یا نہیں؟۔کسی شخص پر لازم نہیں ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اپنی اولاد پر تقسیم کرے، یہ اس کی اپنی صوابدید ہے، چاہے تو اولاد کو ھبہ کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔البتہ اولاد کے درمیان ھبہ میں رسول اللہﷺ نے مساوات کی ہدایت فرمائی ہے۔کسی شخص کی وفات کے بعد اس کا ترکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے،اس میں مرنے والے کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا ،نہ ہی وہ کسی کو وراثت سے محروم کر سکتا ہے۔کسی شخص کی بیوی کا وہ بیٹا جو کسی سابق شوہر سے ہے، اس کا وارث نہیں بن سکتا، نہ منہ بولا بیٹا وارث بن سکتا ہے،البتہ وہ اپنی ماں کا وارث ہوگا۔سوال میں درج پانچ بیٹیوں کو والد کی وفات کی صورت میں ترکے کا 2/3 حصہ

ملے گا، جس میں ہر ایک کا حصہ برابر برابر ہوگا، باقی دیگر ورثاء کا ہوگا۔ اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں، ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله ﷺ: "من فرّ من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة"۔ ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو (حقِ) میراث پانے سے فرار (کی صورتیں) اختیار کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کی میراث منقطع فرمادے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

ترکے کی تقسیم موجودہ قیمت کے مطابق

سوال: 153

ہمارے والد صاحب مرحوم نے دو شادیاں کیں، دوسری شادی پہلی زوجہ کے انتقال کے بعد کی۔ پہلی زوجہ سے والد صاحب کا ایک بیٹا تھا۔ دوسری زوجہ کا انتقال والد صاحب کے انتقال کے بعد ہوا، دوسری زوجہ سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں، لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ:

۱۔ والد صاحب کے مکان کی شرعی تقسیم کس طرح ہوگی۔

۲۔ مکان کی کون سی قیمت معتبر ہوگی، والد صاحب کے انتقال کے وقت کی یا حالیہ قیمت؟۔

مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں، (عامر عارفین شمسی، 1425/14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب :

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، مرحوم کی پہلی زوجہ کے بیٹے کو 10 حصے، دوسری بیوی کے بیٹے کو 12 حصے اور تین بیٹیوں کو 18 حصے (ہر ایک کو 6 حصے) ملیں گے، مکان چونکہ اب فروخت کیا جائے گا لہٰذا جو قیمت مکان کی اب حاصل ہوگی اسے ورثاء کے درمیان اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

غیر وارث کو ترکے سے حصہ

سوال: 154

میرے والد صاحب شیخ محمد الیاس کا انتقال 28 جولائی 2006ء کو ہوگیا ہے۔ان کے ورثاء جو حیات ہیں وہ ایک بیٹا شیخ عبدالخالق، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ ہیں، جبکہ دو بیٹوں (محمد یونس اور عبدالمالک) اور ایک بیٹی نفیسہ کا انتقال 13 سے 20 سال پہلے ہوچکا ہے۔مہربانی فرما کر تحریر فرمائیں کہ شرعی طور پر کس کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ جس اولاد کا والد کی زندگی میں انتقال ہوگیا ہے شرعی طور پر ان کے بیٹے یا بیٹیوں کا کوئی حصہ بنتا ہے یا نہیں؟۔(عبدالخالق، F-153 بلاک 5 اسکیم 5 کلفٹن، کراچی)۔

جواب :

ازروئے شرع کسی بھی شخص کی وفات کے بعد جو ترکہ وہ چھوڑ جاتا ہے، اس

میں تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کئے جاتے ہیں:
(1) مصارف تکفین وتدفین (2) اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض باقی ہے تو اس کو ادا کرنا (3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ادائے قرض کے بعد جو ترکہ بچ رہے گا، اسکی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد، بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ متوفی شیخ محمد الیاس کا ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ (محمد الیاس) کو 5 حصے، ایک بیٹا عبدالخالق کو 14 حصے، تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور متوفٰی یا متوفاۃ کی براہ راست اپنی اولاد بیٹے اور بیٹیاں بوقت وفات زندہ ہیں، تو ان کی اُس بیٹے یا بیٹی کی اولاد (پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں)، جو مُورِث (ترکہ چھوڑکر وفات پانے والے اپنے ماں یاباپ) کی وفات سے پہلے وفات پاچکی ہے، وراثت سے محروم رہے گی، کیونکہ تقسیمِ وراثت کا ایک مسلّمہ اصول ہے کہ: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے''، اسے ''اصولِ حَجب'' بھی کہتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کی وفات کے وقت اس کے والد بھی زندہ ہیں اور دادا بھی، تو والد کا رشتہ چونکہ میت سے قریب ترین ہے، اس لئے والد کو ترکے سے حصہ ملے گا اور دادا محروم رہے گا، البتہ اگر ایسی صورت ہوجائے کہ کسی شخص کی وفات کے وقت اس کا دادا تو زندہ ہے لیکن والد پہلے وفات پاچکا ہے، اب ترکے کا جو حصہ بصورتِ حیات والد کو ملنا چاہئے تھا، وہ دادا کو ملے گا۔ یہی صورتِ حال میت کے بیٹے، بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واذا حضر القسمة اولوا القربیٰ والیتٰمی والمسٰکین فارزقوھم منه وقولوا لھم قولا معروفا o

ترجمہ: ''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتامیٰ اور مساکین آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے) ہتو انہیں بھی (رضا کارانہ طور پر) ترکے میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو، (النساء:8)''۔

قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) تو نہیں ہے، استحبابی ہے، اس کی حیثیت مقاصد خیر کے لئے سفارش اور مشاورت کی ہے، لہٰذا جتنا حصہ ان یتیم نواسے نواسیوں کی والدہ کے حیات ہونے کی صورت میں انہیں ملنا چاہئے تھا، اگر تمام ورثاء اتفاق رائے سے اتنا یا اس سے کچھ کم تبرُّعاً اور استحساناً رضاکارانہ طور پر تقسیم ترکہ سے پہلے ان بچوں کو بطور ھبہ دیدیں تو یہ ایک مستحسن امر ہوگا، صلہ رحمی کا باعث ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوگا، اور اس کا اجر انہیں ملے گا۔ قرآن مجید حکیمانہ انداز میں ارشاد فرماتا ہے: ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذرّیّة ضعٰفاً خافوا علیھم فلیتّقوا اللّٰه ولیقولوا قولاً سدیداً o ترجمہ: ''اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ (اپنی وفات) کے بعد (خدانخواستہ) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے ہتو انہیں ان کے (رُلنے اور بے یارومددگار ہونے کا کتنا) خوف ہوتا ہتو انہیں چاہئے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء: 9)''۔ تو قرآن نے بتایا کہ اپنے پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کر کے غیر وارث نادار اور کمزور رشتے داروں پر ترس کھا کر تقسیم وراثت کے وقت ان کی مدد کر لیا کرو۔

تقسیم ترکہ

سوال: 155

میرے شوہر کا تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور ان کے ورثاء میں ایک بیوہ (یعنی میں) چار بیٹے، تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کے ترکے میں ایک دکان ہے اور ایک مکان جس میں ہم رہائش پذیر ہیں یہ مکان مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل میرے والد سے میرے ہی نام پر خرید کر مجھے ہبہ کر دیا تھا اور اس کے کاغذات میرے نام سے میرے پاس موجود ہیں اور اس مکان پر میرا قبضہ بھی ہے۔ دکان جو کہ میرے شوہر کے نام ہے اور اب بیٹے اس میں کاروبار کرتے ہیں۔ میرے بیٹوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں مکان اور دکان دونوں میں سے حصے دیئے جائیں۔ برائے مہربانی ہر ایک کے حصوں کے وضاحت فرمائیں، (توفیقاً، 958/14 ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدق بیان سائلہ چونکہ مکان ان کے شوہر نے انہیں ہبہ کر دیا تھا اور بعد ہبہ اس پر قبضہ بھی پایا گیا چونکہ ہبہ مکمل ہو گیا لہذا وہ مکان مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہو گا۔ اور جب میراث تقسیم کی جائے گی تو اس ہبہ کئے ہوئے مکان کو چھوڑ کر جتنا مال وفات کے وقت ان کی ملکیت میں ہوگا، وہی تقسیم کیا جائے گا۔ اور جو ورثاء ان کی وفات کے وقت موجود ہوں گے، وہ اس کے حق دار ہیں، ہر ایک وارث کو قانونِ وراثت کے شرعی اصول کے مطابق اس کا حصہ دیا جائے گا۔ اور جو کچھ مرحوم اپنی زندگی میں دے چکے ہیں، اسے شمار نہیں کیا جائے گا۔ اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور مرحوم کے شرعی ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں تو

تقسیمِ وراثت سے قبل جو امور ضروری ہیں (یعنی مصارفِ تدفین، ادائیگی قرض (اگر کوئی ہو) ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذِ وصیت (اگر کی ہو)، ان کی تنفیذ کے بعد بقیہ ترکہ 88 حصوں میں تقسیم ہوگا۔بیوہ کو 11 حصے، چار بیٹوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

Inheritance

Q:156 **Dear Mufti Saheb!**

This is to request you to answer the following question for submission to a court outside Pakistan:

Question:Mr S.K.S.Hassan died last year leaving behind him wife,a son and a daughter and no other legal heirs.What will be the share (in percentage)of his wife,son and daughter in his movable and immovable proparties according to shariah?.

K.M.Zubair,Supplements Editor,Dawn.

Ans:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

In the name of Allah,the Beneficent,the Merciful

Answer to question

If S.K.S.Hassan's legal--Islamic law (shariah)--heirs are the same as mentioned in the question, then before division of the assets it as important to meet funeral expenses,pay loan, if any, and execute will, if any, to the extent of one-third.There after the remaining assets will be shared by the heirs in the following proportion,according to shariah:

Widow......................3/24...................12.5 0 percent

Son.......................14/24...................58.33 percent

Daughter ....7/24.....................29.17 percent

ترکے میں سوتیلی اولاد کا حصہ نہیں

سوال: 157

میرے والد صاحب نے میری والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی ،میری سوتیلی والدہ کے پہلے شوہر سے چار بچے (دولڑکے ،دولڑکیاں) ہیں ،اوران سب کی شادیاں ہم نے کیں سوتیلی والدہ کا انتقال 1982ء میں ہوا،میری والدہ سے پانچ بیٹے،اورچار بیٹیاں ہیں۔میرے والد کا انتقال 1992ء میں ہو

ا،والد کے انتقال کے بعد کیا ان چاروں کا میرے والد صاحب کے ترکے میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟،(معراج الدین،68/10 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل تجہیز تکفین مقدمہ علی الارث مرحومین کا ترکہ ان کی اولاد کے درمیان اصول وراثت کے قوانین کے تحت تقسیم ہوگا،کل ترکہ 14،حصوں میں منقسم ہوگا۔ "للذکر مثل حظ الانثیین" (ایک لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے،النساء:11) کے تحت پانچ بیٹوں کو دس حصے(فی کس دو حصے) چار بیٹیوں کو چار حصے(فی بیٹی ایک حصہ)ملیں گے۔دوسری والدہ کی جواولاد ان کے پہلے شوہر سے ہے اسے آپ کے والد کے ترکے میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

پنشن ترکے میں شامل نہیں

سوال:158

ایک شخص نے کل وراثت میں ایک مکمل مکان جس کی بالائی منزل پر دوکمرے ایک کچن اور غسل خانہ بھی تعمیر ہے،اس کے علاوہ ایک ماہانہ آمدنی کی پنشن چھوڑی ہے،وارثوں میں ایک بیٹا اور سات بیٹیاں ہیں۔مرحوم کی وصیت میں تحریر ہے کہ اوپر کی منزل جسے بیٹے نے مکمل طور پر اپنے خرچ پر تعمیر کروایا ہے،اسی وصیت میں بڑی بیٹی جس کی شادی نہیں ہوئی ہے اسکو مکان کا آدھا حصہ دینے کی وصیت کی ہے ایک اورتحریر جو صرف بیٹے کو دی اور بیٹا اسکے اصل ہونے کا حلف اٹھا رہا ہے اسکے مطابق اوپر کی منزل کی قیمت بیٹے کو ملنی چاہیئے اور نیچے کی منزل کی آدھی قیمت اس طرح تقسیم کی جائے کہ دو حصے بیٹے کو اور ایک حصہ ہر بیٹی کو دیا جائے،ماسوائے اس بیٹی کے جس کو نیچے

کی منزل کا آدھا حصہ دیا جارہا ہے اسکے علاوہ باپ کی جو ماہانہ پنشن آتی ہے وہ بڑی بیٹی پہلے ہی اکیلے وصول کرتی ہے اور کوئی حصہ کسی بھائی یا بہن کو نہیں دیتی مکان کی قیمت اس وقت ایک کروڑ روپے ہے۔جس وقت تحریر لکھی گئی مکان کی قیمت پندرہ لاکھ روپے تھی جس کی تقسیم مرحوم نے اس طرح کی کہ بیٹے کو اوپر کی منزل کے دو لاکھ ملنے چاہئیں ایک لاکھ ٹیکس ،بل وغیرہ کی قیمت میں رکھے جائیں ٦ لاکھ روپے بڑی بیٹی کو دیے جائیں باقی ٦ لاکھ روپے کے آٹھ حصے کئے جائیں دو حصے بیٹے کو یعنی ڈیڑھ لاکھ روپے اور ایک ایک حصہ چھ بیٹیوں کو یعنی ٧٥ ہزار روپے ہر بیٹی کو دیا جائے ۔اب مکان کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے،بہنوں کا اصرار ہے کہ بیٹے کو اس قیمت کی تبدیلی کے حساب سے اوپر کی منزل کے پیسے نہ دیے جائیں،مگر بڑی بیٹی کو موجودہ قیمت کے حساب سے مکان کا آدھا حصہ ضرور دیا جائے ۔براہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں وراثت کی تقسیم واضح فرمایئے،(سید حسن ندیم،1E/10/10 ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں ،جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین ،ادائیگی قرض اگر کوئی تھا ،اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کسی صدقہ جاریہ یا غیر وارث کیلئے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 9 حصوں میں منقسم ہوگا۔" للذکر مثل حظ الانثیین "(ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے،النساء:11) کے تحت ایک بیٹے کو دو حصے اور سات بیٹیوں کو سات حصے (فی بیٹی ایک حصہ) ملیں گے،جیسا کہ مرحوم کے تحریر کردہ وصیت نا

مہ اور سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم نے وصیت نامہ میں اپنے ورثاء کو اپنی جائیداد کے مختلف حصوں میں نامزد (Nominate) کیا ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں بن جاتے اور ورثاء کے حق میں وہ وصیت معتبر نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذى حقّ حقّه فلا وصية لوارث"

ترجمہ:''ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے،تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے،(سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ،مؤسسۃ الریان،بیروت)''۔

پنشن حکومت کی طرف سے تبرع ہے، یہ ترکہ نہیں ہے،لہٰذا حکومت اپنے قواعد وضوابط اور قانون کے مطابق ورثاء میں سے جسے چاہے دے سکتی ہے۔بیٹے کا مکان کی بالائی منزل پر جو خرچ ہوا ہے۔وہ اس کا حق ہے۔اگر والد نے دو لاکھ روپے اس کیلئے طے کر دیئے تھے تو وہ ان کا حق دار ہے باقی ترکہ سب ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا،جس کی تفصیل اوپر درج کر دی ہے،البتہ تمام ورثاء باہمی رضامندی سے اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے غیر شادی شدہ بہن کو تقسیم وراثت سے قبل مجموعی ترکے سے کچھ رقم نکال کر دینا چاہیں تو اب وہ ایسا کر سکتے ہیں،فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے

سوال: 159

میرے ایک دوست نوید جنہیں 22 جنوری 2006ء کو شہید کر دیا

گیا، میں نے ان سے ایک لاکھ روپیہ بطور قرضہ لیا تھا منافع ہوا تو چند ماہ انہیں منافع سے حصہ بھی دیا مگر بعدۂ منافع کا سلسلہ بند کردیا، میرے دوست نوید نے مجھ سے رقم کی واپسی کا تقاضہ کیا تھا اور یہ کہ مجھے اپنی رہائش کے لئے فلیٹ خریدنا ہے رقم تیار رکھنا میں نے کسی وقت بھی وہ رقم تم سے واپس لینی ہے، وہ مع اپنی بیوی اور ایک ڈیڑھ سالہ بیٹی کے کرایہ کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے اسکے علاوہ ان کے ہمراہ اور کوئی نہ رہتا تھا، خیر اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں فلیٹ بھی نہ خرید سکے اور نہ ہی میں ایک لاکھ کی رقم واپس کرسکا۔ میں ایک لاکھ کی رقم واپس کرنے کو تیار ہوں طریقہ کار کیا ہونا چاہئے، مرحوم کے ورثاء میں بیوہ، ایک بیٹی، ایک بیٹا (جو مرحوم کی شہادت کے تین ماہ بعد پیدا ہوا) مرحوم کی والدہ، 5 بھائی اور 5 بہنیں ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مرحوم کے سسر مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں نے نوید مرحوم کو ایک لاکھ روپے بطور قرضہ دیئے تھے کہ اپنی سہولت کے مطابق جب چاہو واپس کر دینا انہوں نے مجھے اس قرضے کا ثبوت بھی دکھایا بینک سے ایک لاکھ روپے کا چیک نوید کے نام پر تھا بیوہ بھی اس قرضہ کی تائید کر رہی ہے۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا یا سب سے افضل طریقہ میرے لئے کیا ہوگا؟ یہ بھی واضح رہے کہ بیوہ کی عدت پوری ہو چکی ہے اور بیوہ نے اپنے والدین کے گھر ہی عدت کے ایام پورے کیئے اب مستقلاً وہیں رہ رہی ہیں، (محمد رحمت، دستگیر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ مذکورہ میں مذکورہ قرض کی ایک لاکھ رقم مرحوم کے مجموعی ترکے میں شامل کی جائے گی، امور، متقدمہ علی الارث (مصارفِ تکفین و تدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو)

شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد ترکے کے تہائی حصہ سے مرحوم کا قرض ادا کیا جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی قرض باقی رہے تو دیگر ورثا بطور فضل و احسان رضا مندی سے اگر اپنے حصوں سے دست بردار ہوں تو انکے حصوں سے ادا کیا جائے گا، ترکہ کی تقسیم درج ذیل طریقے پر ہوگی۔

ادائیگی قرض کے بعد کل ترکے کے 24 حصے ہوں گے، مرحوم کی والدہ کو 6 حصے، بیوہ کو 3 حصے، ایک بیٹے کو 10 حصے اور بیٹی کو 5 حصے ملیں گے، مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے، واللہ اعلم بالصواب۔

قتلِ خطا

سوال: 160

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ماں حالتِ خواب میں اپنے شیر خوار بچے کے اوپر آجائے جس کے دم گھٹنے سے بچہ مرجائے کیا ماں پر دیت وکفارہ ہے کیا یہ قتل قائم مقام خطا ہے۔نیز یہ قتل قائم مقام خطا ہےتو کیا یہ نوع صرف احناف کے مذہب میں ہے یا جمہور کا مسلک ہے اوراس کے دلائل قرآن وحدیث یااجماع وقیاس سے کیا ہے؟،(ماجد خان، ضلع راولاکوٹ تحصیل عباس پور)۔

جواب :

آپ نے استفتاء میں جوصورت بیان کی ہے،احناف کےنزدیک یہ ''قتل قائم مقام خطا'' کی صورت بنتی ہےاورجمہورکےنزدیک یہ قتلِ خطاہے،لیکن اس پر جو حکم مرتب ہوتا ہے،وہ ایک ہی ہے۔ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:القتل الخطاء کما عرفنا:ھو أن لا یقصد بہ الضرب ولا القتل،مثل لو سقط شخص علی غیرہ فقتلہ،أورمی صیدا فاصاب انسانا،فھو نوع واحد عندالجمھور ونوعان عندالحنفیۃ؛ لانھم یعتبرون حالۃ سقوط النائم علی غیرہ،مماجری مجری الخطأ۔

ترجمہ:''قتلِ خطا جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ ہے کہ نہ تو کسی شخص کو مارنے پیٹنے (Beating) کاارادہ کیا جائے اورنہ جان سے مارڈالنے کا،اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص (غیرارادی طورپر)دوسرے شخص پرگر پڑااوراس طرح اس کی جان لے لی،

یا ایک شکار کونشانہ بنا کر تیر چلایا (یا گولی چلائی) اور وہ (اچانک) کسی انسان کو جا لگا (اور اس طرح اس کی جان چلی گئی) تو یہ جمہور فقہاء کے نزدیک ایک ہی قسم ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک قتلِ خطا کی دو قسمیں ہیں: (ایک خطاء فی القصد اور دوسری خطاء فی الفعل) کیونکہ وہ اسے اس صورت پر قیاس کرتے ہیں، جیسے ایک سویا ہوا شخص نیند کی حالت میں دوسرے شخص پر گر جاتا ہے (اور اس طرح اس کی موت واقع ہو جاتی ہے)یہ قائم مقام خطا کی قسم سے ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد: 6، ص: 328،مطبوعہ: دار الفکر، دمشق)''۔

علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: ''علامہ ابو بکر رازی کی تعریف کے مطابق قتل قائم مقام خطا یہ ہے کہ مثلاً نیند میں کوئی شخص کسی پر گر پڑے اور اس کو قتل کر دے یہ عمد ہے نہ خطا کیونکہ سونے والے شخص کا قصد (ارادہ)متصور نہیں ہے،لیکن اس کا کروٹ بدل کر کسی شخص پر گرنا اس شخص کی ہلاکت کا موجب ہے،اس کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہوگا،اور اگر وہ مقتول کا وارث تھا تو اس کی وراثت سے بھی محروم ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی کوتاہی کی ہو یا وہ نیند میں نہ ہو اور اس نے جلد میراث حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا ہو، (المبسوط، جلد: 26،ص: 68،مطبوعہ: دار المعرفۃ، بیروت، بحوالہ شرح صحیح مسلم علامہ غلام رسول سعیدی، ج: 4،ص: 676 فرید بک اسٹال، لاہور)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: و أما ما جری مجری الخطا فھو مثل النائم ینقلب علی رجل فیقتلہ فلیس ھذا بعمد ولا خطا کذا فی الکافی۔ و کمن سقط من سطح علی انسان فقتلہ أو سقط من یدہ لبنۃ أو خشبۃ و أصابت انساناً وقتلتہ أو کان علی دابۃ فوطئت دابتہ انساناً ھکذا فی المحیط۔ وحکمہ

حكم المخطأ من سقوط القصاص ووجوب الدية والكفارة وحرمان الميراث كذافي الجوهرة النيرہ ۔
ترجمہ: ''اور ''قتل قائم مقام خطا'' مثال اس کی یہ ہے کہ کسی سونے والے شخص پر کوئی شخص گرا، جس سے وہ (سونے والا شخص) ہلاک ہوگیا پس نہ یہ قتل عمد ہے اور نہ ہی قتلِ خطا، ''کافی'' میں بھی اسی طرح ہے۔اسی طرح چھت سے کوئی شخص کسی انسان پر گرا اور اس طرح اسے ہلاک کر دیا ،یا ایک انسان کے ہاتھ سے اینٹ یا لکڑی گر گئی، اور وہ دوسرے شخص پر آگئی اور اس کی ہلاکت واقع ہوگئی ،یا وہ سواری پر تھا اور اس کے جانور نے کسی شخص کو روند ڈالا ، ''محیط'' میں بھی اسی طرح سے ہے۔اور اس کا حکم بھی قتلِ خطا کے حکم کی طرح ہے، کہ قصاص ساقط ہو جائے گا اور دیت اور کفارہ واجب ہوگا ،اور قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا، ''جوہرۃ النیرہ'' میں اسی طرح مذکور ہے،(فتاویٰ عالمگیری ،جلد 6،ص:3،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔
مفتی وقارالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب میں لکھا :قتل کی اقسام میں سے یہ قسم ''قائم مقام خطا'' ہے اس کی مثال یہ ہے کہ سوئے ہوئے شخص پر کوئی گرے اور وہ سونے والا مر جائے ،تو اس کا حکم یہ ہے کہ قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت اور قاتل میراث سے بھی محروم ہوتا ہے۔قتل کا گناہ نہیں ہوتا ہے۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ماں کو کفارہ دینا ہوگا اور وہ یہی ہے کہ دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے،(وقارالفتاویٰ ،جلد سوم،ص: 338، مطبوعہ بزمِ وقارالدین، کراچی)''۔
قتل خطا میں قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت لازم ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وما كان لمؤمنٍ ان يّقتُل مؤمناً الّا خطأً ج ومن قتل مؤمناً خطأً فتحرير رقبةٍ مّؤمنةٍ وّدية مُّسلّمةٌ الٰٓى اهله الّآ ان يّصّدّقوا ط

ترجمہ: ''اور کسی مؤمن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ (اس سے) خطاء (یہ فعل سرزد ہو جائے)، (تو اس کا کفارہ) ایک مؤمن غلام کا آزاد کرنا ہے، (اور مزید یہ کہ) اس کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہے سوائے اس کے کہ وہ معاف کردیں، (النساء: 92)''۔

آیت کے اختتام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین توبة من اللّٰه ۔

ترجمہ: ''یعنی جو شخص (بطور کفارہ آزاد کرنے کے لئے غلام) نہ پائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیتِ توبہ کے لئے دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔''

قتلِ شبہ عمد

سوال: 161

مسمّی محمد فاروق نے کسی بات پر تنازع کرتے ہوئے غصہ میں آکر حاکم ولد محمد یوسف (مرحوم) کو ڈنڈے مار کر قتل کر دیا، اس کے بعد یہ مقدمہ عدالت میں پہنچا لیکن اس دوران قاتل اور مقتول کے ورثاء میں صلح ہو گئی اور مقتول کے ورثاء نے قاتل کو خون معاف کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ مقتول کا خون معاف کرنے کا کس وارث کو حق حاصل ہے۔

یاد رہے کہ مقتول غیر شادی شدہ تھا اور مقتول کا والد پہلے ہی انتقال کر چکا ہے اس وقت صرف مقتول کی ماں اور پانچ بھائی ہیں جو موجود ہیں کیا قاتل کو مقتول کی ماں خون معاف کر سکتی ہے یا نہیں؟ ۔ برائے مہربانی تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں،

(جھاڑو، ولد یوسف خان کوٹھ گڈاب ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ سوال میں جو صورت قتل کی بیان کی گئی ہے اسے قتل شبہ عمد کہا جاتا ہے۔

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

واما شبہ العمد فھو ماتعمدت ضربہ بالعصااو السوط او الحجر او لید ۔

ترجمہ: ''شبہ عمد وہ قتل ہے جس میں لاٹھی، کوڑے، پتھر یا ہاتھ سے ضرب لگانے کا قصد کیا جائے، (المبسوط جلد: 26 ص: 60 مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت)''۔

قتل شبہ عمد میں قاتل گناہ گار ہوگا اور اس پر کفارہ واجب ہے ایک غلام آزاد کرے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور اس کے بعد عاقلہ (عصبات) پر دیت مغلظہ یعنی سو اونٹ واجب ہے جس کو وہ تین سال میں ادا کریں گے۔ عاقلہ عصبات کو کہتے ہیں یعنی باپ کی طرف سے رشتے دار جو قاتل کی جانب سے مقتول کی دیت ادا کرتے ہیں۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وشبہ العمد أن یتعمد الضرب بمالیس بسلاح ولا ماجری مجری السلاح عند أبی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ وقال أبویوسف ومحمد رحمھما اللہ تعالیٰ اذا ضربہ بحجر عظیم أو خشبۃ عظیمۃ فھو عمد وشبہ العمد أن یتعمد ضربہ بما لا یقتل بہ غالباو الصحیح قول أبی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کذا فی المضمرات ☆ وموجبہ علی القولین الا ثم والکفارۃ و کفارتہ تحریر رقبۃ مؤمنۃ فان لم یجد فصیام شھرین متتابعین ودیۃ مغلظۃ علی

العاقلة كذافي الكافي۔

ترجمہ:"اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جو اسلحہ (برائے قتل) نہ ہو اور نہ ہی اسلحہ کے قائم مقام ہو، اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمھما اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جب وہ کسی بڑے پتھر کے ساتھ یا کسی بڑی لکڑی کے ساتھ مارے تو وہ بھی قتل عمد ہے اور ان کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ وہ کسی ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جس سے عام طور پر قتل نہ کیا جاتا ہو، اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہی صحیح ہے، جیسا کہ مضمرات میں ہے۔ اور دونوں اقوال کے مطابق "قتلِ شبہ عمد" کے مرتکب پر گناہ اور کفارہ لازم آتا ہے اور اس قتل شبہ عمد کا کفارہ ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے پس اگر وہ نہ پائے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے اور قاتل کے عصبات پر دیت مغلّظہ (سو اونٹ) واجب ہے، کافی میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیر جلد:6 ص:3۔2 مکتبہ رُشیدیہ کوئٹہ)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

عفو الولی عن القاتل افضل من الصلح ،والصلح افضل من القصاص و كذا عفو المجروح ۔لاتصح توبة القاتل حتى يسلم نفسه للقود۔

ترجمہ:"ولی مقتول کا قاتل کو معاف کر دینا صلح سے افضل ہے، صلح قصاص سے افضل ہے اور اسی طرح مجروح کا معاف کر دینا افضل ہے اور قاتل کی توبہ (عند اللہ) تب صحیح ہوگی جب وہ خود کو (ورثاء کے پاس) قصاص کے لئے پیش کرے، (ورنہ عند اللہ توبہ معتبر نہیں ہے)۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قولہ(عفو الولی عن القاتل افضل)ویبرأ القاتل فی الدنیا عن الدية و القود

لانهما حق الوارث ـ يبری ـ قوله:(لاتصح توبة القاتل حتی يسلم نفسه للقود)أی لاتكفيه التوبة وحدها ـ قال فی "تبيين المحارم واعلم ان توبة القاتل لاتكون بالاستغفار والندامة فقط بل يتوقف علی ارضاء اولياء المقتول ،فان كان القتل عمدالابدّ أن يمكنهم من القصاص منه ،فان شاؤ قتلوه وان شاؤ عفوا عنه مجانا،فان عفوا عنه كفته التوبه۔ اه ملخصا۔

ترجمہ:"(ولی کا قاتل کومعاف کردینا افضل ہے)اورقاتل دنیا میں دیت اورقصاص سے بری ہو جائے گا کیونکہ یہ دونوں (دیت اور قصاص)وارث کا حق ہے ،علامہ علاؤالدین حصکفی کا یہ قول کہ: (قاتل کی تو بہ اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ وہ خودکو قصاص کے لئے پیش نہ کرے)یعنی صرف اس کا توبہ کرلینا کافی نہیں ہے ۔ "تبیین المحارم" میں فرمایا: جاننا چاہئے کہ قاتل کی توبہ فقط اس کی ندامت اورطلب مغفرت سے (مکمل)نہیں ہوگی، بلکہ یہ مقتول کےورثاء کی رضامندی پر موقوف رہے گی،پس اگراس نے قتل عمد کیا ہوتو (قبولیتِ توبہ کے لئے)ضروری ہے کہ اس مقتول کے ورثاءکواپنے اوپرقصاص کی قدرت دے کہ اگر چاہیں تو اسے (قصاص میں)قتل کردیں اوراگر وہ چاہیں تو اسے معاف کردیں ،پس اگر وہ اس کو معاف کردیں تو اس کے لئے توبہ کافی ہے ،(روالمختارعلی الدرالمختارجلد:10ص:151مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی،بیروت)"۔

ولایت کے چاراسباب ہیں:

قرابت ،ملک ،ولاء،امامت ۔قرابت کی وجہ سے ولایت عصبہ بنفسہ کے لئے ہے یعنی وہ مرد جس کواس سے قرابت کسی عورت کی وساطت سے نہ ہو یا وارث کے ذوی الفروض کے بعد جوترکہ بچے ،وہ سب لے لے ،اوراگر ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا

مال یہی لے لے، ایسی قرابت والا ولی ہے، یہاں بھی وہی ترتیب ملحوظ ہے جو وراثت میں معتبر ہے یعنی سب سے مقدم بیٹا، پھر پوتا، پھر پر پوتا اگر کوئی پشت کا فاصلہ ہو یہ نہ ہوں تو پھر باپ، دادا و غیرھم اگر چہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی۔

شرعاً قاتل کو معاف کرنے کا حق اولیاءِ مقتول کا ہے اور صورتِ مسئولہ میں یہ حق اس کے بھائیوں کو حاصل ہے، یہ "قتلِ شبہ عمد" کا کیس ہے، اور ورثاء کی جانب سے معافی کے باوجود اس (قاتل) پر دو ماہ کے روزوں کا کفارہ ہے، اور معاف کرنے کے بعد قاتل سے دنیا میں مطالبہ نہیں ہوسکتا نہ قصاص لیا جاسکتا ہے اور نہ ہی دیت لی جاسکتی ہے، لیکن مواخذۂ اخروی سے بری نہیں ہوسکتا کیونکہ قتل ناحق میں تین حق اس کے ساتھ متعلق ہیں ایک حق اللہ، دوسرا حق مقتول، تیسرا حق ولی، ولیٔ مقتول کو اپنا حق معاف کرنے کا اختیار تھا سو اس نے معاف کردیا مگر حق اللہ اور حق مقتول بدستور باقی ہیں، ولی کے معاف کرنے سے وہ معاف نہیں ہوئے۔

غیر مسلم کا چیف جسٹس یا قائم مقام بننا

سوال: 162

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک اسلامی حکومت میں کسی غیر مسلم (ہندو) کو چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) مقرر کرنا جائز ہے؟

،(محمد شمیم خان فیڈرل بی ایریا، شوکت صدیقی، منور احمد نعیمی، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں، ایک خالص دستوری اور قانونی اور دوسری خالص اسلامی جہاں تک مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے دستور کا تعلق ہے، تو اسکی رو سے نظام مملکت میں صرف دو مناصب کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، ایک صدر کا منصب اور

دوسرا وزیرِ اعظم کا عہدہ ، کیونکہ ان دونوں عہدوں کے حلف نامے میں ، جو دستور پاکستان کے شیڈول میں دیا گیا ہے، مسلمان ہونا اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا اقرار شامل ہے ۔ان کے علاوہ کسی اور عہدے کے لئے (خواہ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے جج ہوں یا چیف جسٹس ہوں ، مسلح افواج کے سربراہان ہوں یا گورنر ، وزراءاعلیٰ اور وفاقی وصوبائی وزراء ہوں) مسلمان ہونا شرط نہیں ہے ،لہٰذا دستورِ پاکستان کی رُو سے کسی غیر مسلم کے چیف جسٹس آف پاکستان یا اس کا قائم مقام بننے کی گنجائش ہے، ماضی میں بھی جسٹس اے آر کارنیلیس ، جو مذھباً عیسائی تھے، چیف جسٹس آف پاکستان رہ چکے ہیں ۔اگر چہ ہماری رائے میں یہ دستور کی روح کے منافی ہے ، کیونکہ دستورِ پاکستان کی رُو سے کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بن سکتا اور کسی بھی قانون کو اس حوالے سے پاکستان کی سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن وسنت کے خلاف ہے اور اس کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی تعبیر وتشریح حتمی اور قطعی متصور ہوگی ،اب جج یا چیف جسٹس خود غیر مسلم ہے اور از روئے عقیدہ اس کا قرآن وسنت کی حقانیت پر یقین ہی نہیں ہے (کیونکہ اگر قرآن وسنت کی حقانیت پر اس کا یقین ہوتا تو اسلام قبول کرلیتا)،لہٰذا صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ اسے قرآن وسنت سے آگاہی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝
ترجمہ:''اور اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں کے خلاف (غلبہ کی) ہرگز کوئی سبیل نہیں بنائے گا،(النسآء:141)''۔

اس آیت سے فقہاءِ احناف نے جو مسائل اخذ کئے ہیں ان میں دو اہم باتیں یہ ہیں کہ: (1) کافر کو مسلمان کا قاضی (جج) بنانا جائز نہیں ہے ۔(2) کافر کو مسلمان کے لشکر کا

امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف) بنانا جائز نہیں ہے، الشیخ احمد بمعروف مُلا جیون علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: جعله ذا عسکر و خدمته ورئیسا له غیر جائز۔

ترجمہ: ''کافر کو مسلمان کے لشکر کا امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف) بنانا جائز نہیں ہے، (التفسیرات احمدیہ ص: 322,223 مکتبہ حقانیہ، پشاور)''۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابی بکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں: واما بیان من یصلح للقضاء فنقول الصلاحیة لها شرائط ۔ منها : العقل۔ و منها :البلوغ ۔ و منها: الاسلام ۔و منها :الحریة ۔ و منها: البصر ۔و منها: النطق ۔و منها: السلامة عن حد القذف لما قلنا فی الشهادة ۔

ترجمہ: ''ان شرائط کے بیان کے بارے میں جو اہلیتِ قضاء کے لئے ضروری ہیں، حسب ذیل ہیں: (1) عقل، (2) بلوغ، (3) اسلام، (4) حریت (آزاد ہونا)، (5) بصر (بینا ہونا)، (6) نطق، یعنی گویائی و گفتار کی صلاحیت رکھتا ہو، (7) اس شخص پر حد قذف نہ لگی ہو، (بدائع الصنائع جلد: 7، ص: 3، مرکز اہلسنت برکاتِ رضا، گجرات، ہند)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ان الکافر یجوز تقلیده القضاء لیحکم بین أهل الذّمّة ذکره الزّیلعی فی التّحکیم الخ

ترجمہ: ''(حاکمِ اسلام) اگر کسی غیر مسلم کو غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کیلئے قاضی (جج) مقرر کرے، تو جائز ہے، اسے ''زیلعی'' نے بابِ تحکیم میں ذکر کیا ہے، (مگر مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اُسے اختیار نہیں)، اس کی شرح میں ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (لیحکم بین أهل الذّمّة) أی حال کفره ، والا فقد

علمت أن الکافر یصح تولیته مطلقاً لکن لا یحکم الا اذا أسلم ۔
ترجمہ:'' تا کہ (غیر مسلم قاضی) غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرے)یعنی جب تک وہ حالتِ کفر میں ہے، مگر یہ معلوم ہے کہ(دیگر امور میں) کافر کو حق ولایت مطلقاً حاصل ہے، لیکن جب تک وہ اسلام نہ لائے اسے منصبِ قضا تفویض نہیں ہوگا، مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں، ۔۔۔۔۔۔۔۔پھر آگے'
مطلب فی حکم القاضی الدّرزی والنّصرانی "کے تحت بیان کرتے ھیں :
تنبیہ :ظھر من کلامھم حکم القاضی المنصوب فی بلاد الدروز فی القطر الشامی ، ویکون درزیاً ویکون نصرانیاً فکل منھما لایصح حکمہ علی المسلمین ، فان الدرزی لا ملة لہ کاالمنافق والزندیق وان سمی نفسہ مسلماً ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ والظاھر أنہ یصح حکم الدرزی علی النصرانی وبالعکس ۔
ترجمہ:''ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ شام کے خطے میں دُرزی اور نصرانی (کو اگر) قاضی (مقرر کردیا گیا ہو)تو ان کا مسلمانوں کے امور میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ دُرزی کا تو کوئی دین ہی نہیں ہوتا، جیسے منافق اور زندیق، اگر چہ وہ اپنے آپ کو(بظاہر)مسلمان کہے (اور آگے چل کر لکھا)، ظاہر یہ ہے کہ غیر مسلم کا ایک دوسرے کے لیے جج بنایا جانا درست ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار ج:8،ص: 24دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔
علامہ امجد علی اعظمی سے سوال ہوا کہ: مسائلِ شرعیہ عبادات میں غیر مسلم کے فیصلہ کی طرف رجوع کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے باوجودیکہ امیرِ شریعت موجود ہیں؟ جواب میں انہوں نے لکھا کہ:''کفار کے پاس فیصلہ لے جانا ممنوع ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے

:الم تر الی الذین یزعمون انّهم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یّتحاکموا الی الطاغوت وقد أُمروا ان یکفروا به ویرید الشیطان ان یضلهم ضلالًا بعیدًا، ترجمہ:''کیا آپ نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اوران (کتابوں) پر (ایمان لائے ہیں) جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ انہیں گمراہ کرکے بہت دور کی گمراہی میں ڈال دے، (النساء: 60) ،واللہ تعالیٰ اعلم ، (فتاویٰ امجدیہ ، جلد سوم، ص:246، مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)''۔

محافلِ میلاد کے بارے میں یہ کہنا کہ''اس میں حضور ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں اوراس میں وحدہٗ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''

سوال: 163

بارہ ربیع الاول کو جشن عید میلادالنبی ﷺ کے موقع پر ایک مقرر نے آقا ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے کہا''آج کی اس محفل ،اس جشن اوراس بزم کے جانِ محفل ذات مصطفیٰ ﷺ ہیں اور شرکاء محفل میں خود خداوند کریم بھی شریک ہے۔یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو محفل بھی آقا ﷺ کے نام پر کی جائے آقا ﷺ اس میں شریک ہوتے ہیں اور جس محفل میں خدا کا حبیب ﷺ بھی خود شریک ہواس میں وحدہ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''۔

اس پرایک علامہ صاحب نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی ذات شریک ہونے سے پاک ہے۔لہٰذا یہ کفریہ کلمات ہیں۔مقرر کوتو بہ تائب ہونا چاہئے۔براہِ کرم اس مسئلہ پر

قرآن وحدیث اوراقوال صحابہ وائمہ کی روشنی میں اپنے فتویٰ سے نوازیں، (ڈاکٹر محمد حامد رضا، ایم ڈی، رضامیڈیسن کمپنی مین بازار چشتیاں)۔

سوال: 164

کیافرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مقرر نے اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہا "شرکاءِ محفل میں خود خداوند کریم بھی شریک ہے"۔ مقرر نے شریک ہونے کی تفصیل بیان نہیں کی ۔کہ اللہ تعالیٰ کس طرح شریک ہے۔آپ سے دریافت کرنا ہے کہ:

(1) کیااس جملہ پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے یا نہیں؟۔(2) کیاایسے جملوں کو عوام الناس میں استعمال کرنا چاہئے؟ ۔قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، (میاں طاہر حسین، چشتیاں شریف)۔

جواب:

نوٹ: اس موضوع پر ہمارے پاس چشتیاں، پنجاب سے دو الگ الگ استفسارات آئے، ہم نے دونوں درج کر دیئے ہیں۔ایک مستفتی ڈاکٹر محمد حامد رضا نے تین مفتیانِ کرام (مفتی عبدالقیوم خان، جامعہ منہاج القرآن، لاہور، مفتی محمد تنویر القادری، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہوراور ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری، جامعہ رضویہ ،لاہور) کے جوابات بھی منسلک فرمائے ہیں۔ان مفتیان کرام نے اس عبارت کی تاویل وتوجیہہ کر کے جواز کا قول کیا ہے۔اس مسئلے میں ہماراموقف درج ذیل ہے:

قرآن وحدیث میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اللہ جل شانہٗ اورمخلوق کے لئے ایک ہی صیغے کا اطلاق کیا گیا ہے، جیسے: (۱) اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ الخ (ب) فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (القرآن) (ج) اَنَا جَلِیْسُ عَبْدِیْ حِیْنَ

يَذْكُرُنِيْ وَ اَنَامَعَهٗ إِذَا دَعَانِي (الحديث) (د)اَنَـا عِـنْدَ ظَنِّيْ عَبدِي بِي اَنَـا مَعَـهٗ إِذَا ذَكَـرَنِي ،فَـإِنْ ذَكَـرَنِي فِي نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ،وَمَنْ اَتَانِيْ يَمْشِـيْ اَتَيْتُـهٗ هَـرْوَلَةً، وَغَيْـرِهَـا مِنَ الْاٰيَـاتِ الْكَـرِيْمَةِ وَالْاَحَادِيْـثِ الْـمُبَــارَكَةِ۔ میری عاجزانہ رائے میں ان اطلاقات کوانہی مقامات تک محدود رکھنا چاہئے ،جیسے: فَثَمَّ وَجـهُ اللهِ ، يَومَ يُكشِف عن ساق، يَدُاللهِ فوق أيدِيهِم وغیرها من الآیات الکریمه ،ان مواقع پر یہ کہا جائے کہ ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے یا جو معنیٰ اس کی ذات کے شایان شان ہے۔ہمارے لئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اس پر مزید قیاسات کریں کہ ید اللہ،وجہ اللہ ہوسکتا ہے تو "قدم اللہ" اور "رأس اللہ" کیوں نہیں ہوسکتا۔ان اطلاقات کوان کے محل تک محدود رکھا جائے۔بلکہ ترجمہ کرتے وقت لکھ دیا جائے کہ اس کا حقیقی مفہوم جو اللہ کی مراد ہے،اس پر ہمارا ایمان ہے اوراس کی تعیین کے ہم شرعاً مکلّف نہیں ہیں،اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ترجمہ کے موقع پر یہ لکھ دیا جائے:"جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے"۔حقیقی مفہوم کی تعیین کے اعتبار سے ایسی احادیث وآیات کو متشابہات میں سے سمجھنا چاہئے اوراس کے درپے نہیں ہونا چاہئے۔آج کل اکثر مقررین اور نعت خواں حضرات بڑی جرأت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ:"اس محفل میں حضور تشریف لائے ہوئے ہیں"،ہمارا ایمان وعقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مبارک محافلِ میلاد میں ازراہِ لطف وکرم جب اور جہاں چاہیں تشریف لاسکتے ہیں اور"شمائم امدادیہ" میں مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہ درج کیا ہے،لیکن تعیین کے ساتھ یہ کہنا کہ:"ہماری اس محفل میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں"،اگر غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر الجیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ یا مسلّمہ طور پر بلند مرتبہ اولیاءِ کاملین یہ دعویٰ فرمائیں تو بجا ہے اور بارگاہِ الوہیت جلّ وعلا اور بارگاہِ

رسالت میں تقرّب کی وجہ سے انہیں یہ مرتبہ ومقام حاصل ہے کہ وہ یقین کے ساتھ حضور انور ﷺ کی تشریف آوری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ہر ایرے غیرے کو اتنا بڑا دعویٰ کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسا دعویٰ یا تو غیب دانی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، اور بالذات علمِ غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے یا جن مقرّب ومحبوب بندوں کو اپنے کرم سے وہ مطلع فرما دے یا وہ اپنے لئے عام لوگوں کی قوتِ مشاہدہ اور صاحبِ بصیرت وبصارت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ بہت بڑی خودستائی ہے جو اس کے لئے جائز نہیں ہے، اگر قرآن وحدیث میں ایسے کلمات (مثلاً لفظِ صلوٰۃ) آئے ہیں، جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور مومنین پر بیک وقت کیا گیا ہے، تب بھی ان کے معانی کا تعین ہر ایک کے اعتبار سے الگ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے وہی معنیٰ مراد ہوگا جو اس کی شان کے لائق ہے اور اشتراکِ لفظی کے باوجود اشتراکِ معنیٰ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیتِ درود پر کلام کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ اور فرشتوں کو ایک فعل میں شریک کیا ہے اور فرمایا ہے: اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں، اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے غیر کو ایک فعل میں شریک کرنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، حدیث میں ہے: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے کہا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہوگیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم بُرے خطیب ہو یوں کہو جس نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ گمراہ ہوگیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر ایک ضمیر میں جمع کریں، کیونکہ اس سے سننے والوں کو یہ وہم ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو برابر سمجھتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر الگ الگ صیغوں میں کیا جائے، البتہ اللہ تعالیٰ کسی حکم یا کسی قاعدے کا پابند نہیں ہے، وہ ایک صیغہ اور ایک ضمیر میں اللہ اور اس کے غیر کا ذکر کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ایک صیغہ میں دونوں کا ذکر کرنے کی مثال یہ آیت ہے اس میں فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہ وملٰئکتہ یصلون: اللہ اور اس کے فرشتے درود پڑھتے ہیں، اور ایک ضمیر میں دونوں کے ذکر کے مراد لینے کی مثال یہ آیت ہے: وما نقموا الا ان اغنٰھم اللہ ورسولہٗ من فضلہ۔ ترجمہ: ''اور ان (منافقین کو) صرف یہ ناگوار ہوا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کردیا، (التوبہ: 74)''۔ اس آیت میں ''من فضلہ'' کی ضمیر واحد اللہ اور رسول دونوں کی طرف راجع ہے، اسی طرح یہ آیت ہے: واللّٰہ ورسولہٗ احق ان یرضوہ۔ ترجمہ: ''اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے، (التوبہ: 62)''۔ اس آیت میں ''یرضوہ'' کی ضمیر واحد اللہ اور اس کے رسول دونوں کی طرف راجع ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ بھی اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور آپ نے بھی اللہ اور اس کے رسول کو ایک ضمیر میں فرمایا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہوں وہ ایمان کی مٹھاس کو پالے گا، ایک یہ ہے کہ: ان یکون اللہ ورسولہ احبَّ الیہ مما سواھما۔ ترجمہ: ''اللہ اور اس کا رسول اس کو ان کے ماسوا زیادہ محبوب ہو، (صحیح البخاری: ،رقم الحدیث: 16)''۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ادب اور اس کی تعظیم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر دونوں کا ایک ضمیر میں ذکر کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ

اوراس کے رسول ﷺ اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے غیر کو بھی جمع کر دیتے ہیں، کیونکہ جب دوسرے لوگ ایک صیغہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر کریں گے تو ان کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو ہم مرتبہ اور مساوی سمجھتے ہیں، اس لئے دونوں کا ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں ذکر کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اگر وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں دونوں کا ذکر کریں ، تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، (تبیان القرآن ،جلد:9،ص:532,533)''۔محفل میلاد النبی ﷺ کے حوالے سے ہمارے خطباء کرام فرطِ محبت، جوشِ عقیدت اور عوام سے داد و تحسین پانے کے شوق میں بعض کلمات ارشاد فرما دیتے ہیں ۔ جیسے سوال میں مذکور ہیں کہ: ''اس میں وحدہ' لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''۔اگر چہ شرعاً اس کی تاویل و توجیہ کی گنجائش ہے، جیسا کہ منسلکہ فتاویٰ میں مفتیانِ کرام نے فرمائی ہے، لیکن میری مؤدّبانہ اور عاجزانہ رائے ہے کہ اس طرح کے اندازِ بیان سے اجتناب اولیٰ ہے، اللہ تعالیٰ کی اَحدِیَّت اور تَنزِیہ کا جتنا پاس رکھا جاسکے، اتنا ہی افضل و اولیٰ ہے ۔خاص طور پر آجکل بڑے خطباءِ کرام کی تقاریر کے کیسٹ عام ہو جاتے ہیں اور پھر علم سے عاری لوگ بھی ان کو اپنی مجالس میں دہراتے رہتے ہیں ۔تاویلات و توجیہات کی تو ہر جگہ گنجائش رہتی ہے، مثلاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ترجمہ: ''ہم اس کی (بندے کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں، (سورۃ ق:16)''اور وھو معکم این ما کنتم ۔ ترجمہ: ''تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ (اللہ تعالیٰ) تمہارے ساتھ ہوتا ہے، (سورۃ الحدید:4)''۔اب ان آیات کی روشنی میں کوئی شخص یہ کہے کہ

میں جس مجلس میں بھی رہوں، اللہ تعالیٰ میرے ساتھ شریک ہوتا ہے،تو یہ انداز میرے نزدیک بارگاہِ الوہیت کے شایانِ شان نہیں ہے، اگر چہ توجیہ وتاویل کی گنجائش موجود ہے، کیونکہ یہاں بندے اور رب کے درمیان جس معیت کا ذکر ہے اس سے معیتِ جسمانی یا معیتِ مکانی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم اور قدرت ہر چیز کو محیط ہے اور اسی معنیٰ میں معیت مراد ہے، بعض مُقربین کے لئے مَعیّتِ خاصّہ مراد ہوسکتی ہے، اس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور برکات کا بندے کے شاملِ حال رہنا ہے۔ باقی جن علامہ صاحب نے کہا ہے کہ: ''یہ کفریہ کلمات ہیں، مقرر کو تو بتائب ہونا چاہئے''۔ یہ درست نہیں ہے اور بعض علماء کے نزدیک غیر کفر کو کفر قرار دینا بجائے خود مستلزم کفر ہوتا ہے۔ ہم نے اظہارِ رائے کے لئے یہ فتویٰ محترم مفتی محمد رفیق حسنی (جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، کراچی) کو پیش کیا، تو انہوں نے اپنی عبارتِ ذیل کے اضافے کے ساتھ اس کی تائید کی: "حضرت مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے فتوے کی تائید کرتا ہوں بلکہ میرے نزدیک صورتِ مسئولہ کی عبارتیں اور اسی قسم کے عام مقررین اور نعت خوانوں کی عبارتیں کفر تو نہیں مگر عام مجالس میں بیان کرنا حرام ہیں بلکہ متشابہات آیات اور احادیث کا بغیر تاویل اور توضیح کے بھی عام مجالس میں بیان کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے کلمات سے عوام کو جو پیغام پہنچتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تجسیم اور تمثیل جسمی کا ہوتا ہے چنانچہ ایسی تقریریں سننے والے میرے ایک طالبِ علم کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جسم کا قائل ہو چکا ہے۔ اسی طرح شانِ رسالت بیان کرتے وقت یہ کہنا کہ ''اللہ تعالیٰ جو لاشریک ہے وہ درود میں ہمارے ساتھ شریک ہے''، سے عوام کا یہ عقیدہ بنتا ہے شاید اللہ تعالیٰ ہماری طرح ہاتھ میں تسبیح لیکر'' اللھم صل علی الخ یا الصلوٰۃ والسلام علیك

یارسول اللہ "پڑھتا رہتا ہے جبکہ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف صلاۃ کی نسبت ہوتو رحمت مراد ہوتی ہے۔ الغرض مذکورہ کلمات اگرچہ تاویل کی وجہ سے کفر نہیں ہیں مگر عوام کو پیغام پہنچانے اور ان کے عقیدوں کے فساد کے خطرے کے پیش نظر ناجائز ہیں آئندہ علماء کو یہ کلمات نہیں کہنا چاہئے، واللہ تعالیٰ اعلم"۔ **اسی طرح محترم مفتی محمد اسماعیل نورانی (جامعہ انوار القرآن، کراچی) نے یہ تائیدی کلمات لکھے:** "قبلہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب مدظلہ نے جو جواب تحریر فرمایا ہے اور اس پر مفتی رفیق الحسنی دام ظلہ نے جو اضافہ فرمایا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ فی زمانہ مقررین اور واعظین کے مذکورہ جملوں کی سخت حوصلہ شکنی اور تردید کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جس طرح نعت خوانی کی فیلڈ میں جاہل اور چھچھلے نعت خوانوں نے نظریاتی طور پر اہل سنت کو نقصان پہنچایا ہے اسی طرح غالی قسم کے واعظین اور مقررین نے بھی اپنی بے بنیاد نکتہ آفرینیوں سے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اللہ عزوجل ہدایت خیر عطا فرمائے"۔

خاتون مبلغہ کا غیر شرعی طرز عمل

سوال :165

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اہلِ سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والی ایک مقرر خاتون (جو تنظیم المدارس سے ملحق فوقانی درجے کے ایک ادارے کی مہتمم ہیں) نے اپنی تقاریر پر مشتمل کیسٹ کی سرعام فروخت شروع کررکھی ہے جن میں ترنم کے ساتھ نعتیہ اشعار بھی پڑھے گئے ہیں موصوفہ سے جب دریافت کیا گیا کہ کچھ عرصہ پہلے تو آپ اپنے اجتماع کے آس پاس بھی کسی مرد کی موجودگی پسند نہیں کرتی تھیں کہ انکے کانوں تک آواز نہ چلی جائے ، اوراب آپ اپنی کیسٹیں ہر جگہ پہنچانے کے لئے کوشاں ومشتاق ہیں ہیں تو ان کا جواب یہ تھا کہ یہ دورِ

حاضر کی اہم ضرورت ہے میں فرحت ہاشمی (الھدیٰ سینٹر، اسلام آباد) کی کیسٹ کے توڑ کے لئے ایسا کر رہی ہوں۔

ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا یہ عمل قانونِ شرع میں کس نظر سے دیکھا جائے گا؟ کیا فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے اہلِ سنت میں ''مرد علماء'' نا کافی تھے۔ برائے مہربانی پہلی فرصت میں اس پر مدلّل فتویٰ تحریر فرما کر ارسال فرمائیں، کیونکہ اس سے مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والی طالبات، معلمات و منتظمات ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ بعض خوش الحان خواتین اپنی قراءت نعت و تقاریر پر مشتمل کیسٹ منظرِ عام پر لانے کے لئے تیار ہو رہی ہیں، یاد رہے کہ مذکورہ خاتون تقاریر کے حوالے سے خواتین میں خاصی مقبول ہیں، اگر اس بات کا فوری نوٹس نہ لیا گیا تو عنقریب مرد علماء کے خطابات سننے والے مفقود ہو جائیں گے۔ اور ہر جگہ اہل سنت کی خواتین کی کیسٹیں بجتی سنائی دیں گی، (سحر سیفی، جامعہ سیفیہ خراسانیہ لبنات الاسلام، مدینہ کالونی بُھسہ روڈ بڑیلہ شریف، گجرات)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: إن اتّقيتنّ فلا تخضعن بالقولِ فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولاً معروفا ج

ترجمہ: ''اگر اللہ سے ڈرتی ہو (اور یقیناً ڈرتی ہو) تو (پسِ پردہ مردوں سے بضرورت) بات کرنے میں (ایسا) نرم لہجہ اختیار نہ کرنا کہ جس کے دل میں (شہوانیت کا) روگ ہے وہ (اپنی خواہش نفس کی تکمیل کا) طمع کرنے لگے اور دستور کے مطابق (اچھی) بات کرنا، (القرآن، سورۃ الاحزاب: 32)''۔

عن يحيى بن سعيد، عن عمرة عن عائشة رضي الله عنها قالت: لو ادرك

رسول اللہ ﷺ ما أحدث النساء لمنعهنّ، كما منعت نساء بنى اسرائيل ۔قلت لعمرة: أو منعن ؟ قالت: نعم۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ، فرماتی ہیں: اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کو اس حال پر پاتے، جو آپ کے بعد ہوا، تو آپ ان کو مسجد آنے سے منع فرما دیتے، جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا، یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے عَمرہ سے پوچھا! کیا بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا؟، انہوں نے کہا: ہاں!، (صحیح بخاری رقم الحدیث :869، سنن ابی دواؤ، رقم الحدیث:570)''۔

عن عبداللہ، عن النبی ﷺ قال: "صلاة المرأة فی بيتها افضل من صلاتها فی حجرتها، و صلاتها فی مخدعها افضل من صلاتها فی بيتها"۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت کا دالان میں نماز پڑھنا، صحن میں پڑھنے سے بہتر ہے اور کوٹھری میں دالان سے بہتر ہے، (سنن ابی دواؤ، رقم الحدیث: 571)''۔

عن ابی موسی، عن النبی ﷺ قال: "كل عينٍ زانية، والمرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهی كذا و كذا۔ يعنی زانية"۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے (یعنی جو اجنبی کی طرف شہوت بھری نظر سے دیکھے) اور بے شک عورت عطر لگا کر کھلی مجلس میں جائے تو ایسی اور ایسی ہے یعنی زانیہ ہے، یعنی وہ محرکات واسباب زنا اختیار کر رہی ہے، جس کے باعث گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2786)''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ولا یضربن بارجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن۔

ترجمہ: اورعورتیں اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اس زینت کا لوگوں کو علم ہوجائے جوانہوں نے چھپا رکھی ہے، (القرآن، سورۃ النور: 31)۔"

علامہ ابوبکر جصاص حنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ عورت کو اتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو اجنبی مرد سن لیں، کیونکہ پازیب کی آواز سے اس کی اپنی آواز زیادہ فتنہ انگیز ہے، اسی وجہ سے ہمارے فقہاء نے عورت کی اذان کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس میں آواز بلند کرنی پڑتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے، (احکامِ القرآن جلد 3 ص: 319 مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)۔"

علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی لکھتے ہیں:

"علامہ ابن ہمام حنفی نے کہا ہے کہ نوازل میں تصریح ہے کہ عورت کی آواز عورت (واجب الستر) ہے اور اس پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورت کا عورت سے قرآن مجید پڑھنا مستحب ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے، (فتح القدیر جلد 6 ص: 374 مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر)"۔

علامہ ابوعبداللہ خطاب مالکی لکھتے ہیں:

"عورتوں کا آواز بلند کرنا مکروہ ہے، عورتوں کا اذان دینا، بلند آواز سے نماز پڑھنا اور بلند آواز سے حج میں تلبیہ (اللہم لبیک) کہنا سب مکروہ ہے، علامہ لخمی نے کہا ہے کہ عورتوں کی اذان ممنوع ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے، علامہ خطاب مالکی کہتے ہیں کہ علامہ ابن یونس اور علامہ ابن ناجی وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے کہ عورت کی آواز عورت ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ عورت کا آواز بلند کرنا عورت ہے، کیونکہ صحابہ کرام امہات المؤمنین اور دیگر صحابیات سے احادیث روایت کرتے تھے، (مواہب الجلیل

جلد 1 ص:435 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔"

امام رازی شافعی لکھتے ہیں:

أن المرأة منهية عن رفع صوتها بالكلام بحيث يسمع ذالك الأجانب اذ كان صوتها اقرب الى الفتنة من صوت خلخالها، ولذالك كرهوا أذان النساء لانه يحتاج فيه الى رفع الصوت والمرأة منهية عن ذالك۔

ترجمہ: "عورت کواتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کواجنبی مرد سن لیں، کیونکہ عورت کی اپنی آواز پازیب کی آواز سے زیادہ فتنہ انگیز ہے اسی وجہ سے عورت کواذان دینے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اذان میں آواز بلند کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے ،(تفسیر کبیر جلد 8 ص: 367 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

علامہ بیضاوی شافعی لکھتے ہیں:

"پازیب کی آواز سنانے سے منع کرنا عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت پر زیادہ دلالت کرتا ہے ،انوار التنزیل علی ہامش عنایۃ القاضی جلد، 6 ص: 374 مطبوعہ دار صادر، بیروت)"۔

جس طرح قرآن مجید میں عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت بطور کنایہ اور مبالغہ ہے،سو اسی طرح حدیث میں بھی عورت کے آواز بلند کرنے کو کنایہ اور مبالغہ سے منع کیا ہے،امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عن ابی هريرة رضی الله عنه ،عن النبی ﷺقال: " التسبيح للرجال ، والتصفيق للنساء "۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا:(امام کو سہو پر مطلع کرنے لئے)مردوں کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہنا) اور عورتوں کے لئے تصفیق (یعنی دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا) ہے،(صحیح بخاری رقم الحدیث:1303)"۔

اسی کی مثل حضرتِ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے (صحیح بخاری رقم الحدیث 1304 روایت ہے،اس حدیث کوامام مسلم اورامام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی 681 ہجری لکھتے ہیں:

(ویکرہ الجمع بینھما) ای بین الاشارۃ والتسبیح (لأن بأحدھما کفایۃ) وھذا فی حق الرجال،أما النساء فیصفقن یضربن بظھور أصابع الید الیمنی علی صفحۃ الکف الیسری لما مر أن لھن التصفیق لأن فی صوتھن فتنۃ فلا یستحب لھن التسبیح۔

ترجمہ:"(اور تسبیح وتصفیق کا جمع کرنا مکروہ ہے)اور تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنامردوں کا حق ہے،رہاعورتوں کا معاملہ پس وہ تصفیق کریں دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر ماریں،جیسا کہ گزرا کہ ان کے لئے تصفیق ہے اس لئے کہ ان کی آواز"فتنہ" ہے پس ان کے لئے تسبیح (یعنی سبحان اللہ کہنا) مستحب نہیں ہے،(فتح القدیر جلد 1 ص: 419 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکاتِ رضا، گجرات ھند)"۔

نماز میں امام کو متنبہ کرنے کے لئے بلند آواز سے سبحان اللہ کہا جاتا ہے اور چونکہ عورت کا نماز میں آواز بلند کرنا شرعاً ممنوع اور مذموم ہے اس لئے نبی ﷺ نے عورت کو سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے ،علامہ بدرالدین عینی حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

شارع علیہ السلام نے عورت کے سبحان اللہ کہنے کو اس لئے مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کی

آواز فتنہ ہے اس لئے اس کو اذان ، امامت ، اور نماز میں بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے ، (عمدۃ القاری جلد 7 ص: 279 مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ مصر)"۔

علامہ علی قاری حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

عورت کو تصفیق (ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے) کا حکم اس لئے دیا کہ اس کی آواز عورت ہے ، (مرقات جلد 3 ص:10 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)"۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں عورت کو زمین پر پیر مارنے سے منع کیا ہے تاکہ اس کی پازیب کی آواز سن کر اجنبی مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہوں اور حدیث میں عورت کو نماز میں سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے ، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عورت کا آواز کو بلند کرنا بھی ممنوع ہے ، فقہاء احناف کے نزدیک عورت کی آواز عورت ہے ، اور جس طرح ماسوائے ضرورت کے وہ اجنبیوں پر چہرہ ظاہر نہیں کرسکتی ، اسی طرح وہ بغیر ضرورت کے اجنبی مردوں پر اپنی آواز بھی ظاہر نہیں کرسکتی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "عورتوں کا بیانِ میلاد شریف آنحضرت ﷺ " زنانی محفل میں بآوازِ بلند نثر و نظم پڑھنا اور نظم خوش آوازی و لحن کے ساتھ پڑھنا اور مکان کے باہر سے ہمسایہ کے مردوں اور نامحرموں کا سننا تو ایسا پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا:

عورت کا خوش الحانی سے بآواز ایسا پڑھنا کہ نامحرموں کو اس کے نغمہ کی آواز جائے حرام ہے۔ نوازل للامام فقیہ ابو اللیث میں ہے:

نغمة المرأة عورة۔ ترجمہ: "عورت کا اونچی آواز سے شعر پڑھنا "عورت" یعنی محل

ستر ہے"۔

کافی امام ابوالبرکات نسفی میں ہے:لا تلبی جھر الان صوتھا عورۃ۔

ترجمہ:عورت بلند آواز سے (حج کی) تلبیہ نہ پڑھے اس لئے کہ اس کی آواز قابلِ ستر ہے۔

امام ابوالعباس قرطبی کی کتاب السماع پھر بحوالہ علامہ علی مقدسی امداد الفتاح علامہ شرنبلالی پھر ردالمحتار علامہ شامی میں ہے:

لا نجیزلھن رفع اصواتھن ولا تمطیطھا ولا تلیینھا وتقطیعھا لما فی ذٰلک من استمالۃ الرجال الیھن وتحریک الشھوات منھم ومن ھذا لم یجز ان تؤذن المرأۃ ۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

عورتوں کو اپنی آوازیں بلند کرنا ، انہیں لمبا اوردراز کرنا ،(لہجے کو)نرم(اور پرکشش)بنانا اوران میں تقطیع کرنا(یعنی ایک ایک لفظ جدا کر کے تحلیلی عروض کے مطابق پڑھنا)،ہم عورتوں کوان باتوں کی اجازت نہیں دیتے ،کیوں کہ ان کے سبب مردوں کاان کی طرف میلان ہوتا ہے اوران کے جنسی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں ،اسی وجہ سے عورت کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اذان دے،واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ت)(فتاویٰ رضویہ ج 22،ص:43-242 رضافاؤنڈیشن،لاہور)۔

مصنف بہارِ شریعت علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ "غنیۃ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"عورت کوعورت سے قرآن مجید پڑھنا غیر محرم نابینا سے پڑھنے سے بہتر ہے کہ اگر چہ وہ اسے دیکھتا نہیں مگر آواز تو سنتا ہے اور"عورت کی آواز بھی عورت ہے"،یعنی غیر محرم کو بلاضرورت سنانے کی اجازت نہیں(بہارِ شریعت جلد 1 ص:207 مکتبۃ

رضویہ آرام باغ روڈ کراچی)''۔

سوال میں جس خاتون مبلغہ کا تذکرہ ہے، آپ کے بقول شروع میں ان کا رویہ درست تھا، مگر پھر شاید نمود ونمائش کی خواہش غالب آ گئی، اور فرحت ہاشمی صاحبہ کے غیر شرعی طرزِ عمل کو اپنے لئے جواز کی دلیل بنایا۔ یہ کہاں کا اصول ہے کہ برائی کا مقابلہ کرنے کے لئے خود برائی کا ارتکاب کیا جائے؟۔ دین کا مبلغ ہونے کے ناطے احکامِ شرع ودین کی پاسداری کرنا اوّلین فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

ترجمہ: ''کیا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو؟ اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم نہیں سمجھتے؟، (القرآن، سورۃ البقرۃ: 44)''۔

موصوفہ کو چاہئے کہ احکامِ شرع کی پابندی کریں اور سستی ودنیاوی شہرت کے حصول اور خودنمائی کے لئے احکامِ شرع کی پامالی سے اجتناب کریں اور دین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے بجائے خود کو دین میں ڈھالنے کی عادت بنائیں اور دین میں فتنے برپا نہ کریں۔

فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے علماء موجود ہیں اور الحمد للہ ہم نے ''عصمتِ آدم علیہ السلام'' سے متعلق فرحت ہاشمی کے گستاخانہ طرزِ عمل پر اس کا رَد کیا ہے، فتویٰ کی نقل آپ کو ارسال کی جارہی ہے۔

(نوٹ): عصمتِ آدم علیہ السلام سے متعلق فتویٰ ''تفہیم المسائل جلد سوم'' میں شامل کیا جا چکا ہے۔

مرد پر ریشم کا لباس حرام ہے

سوال : 166

کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ہذا میں کہ مرد کو ریشم کا لباس حرام ہے، لیکن ایسا کپڑا جس میں تھوڑی بہت ملاوٹ ہو ریشم کی جیسا کہ چائنا کا بوسکی کپڑا۔ سوال یہ ہے کہ کتنی مقدار میں ریشم مکس ہو تو حرام ہے؟۔ (عبدالقیوم، نورانی مسجد، جہانگیر روڈ، کراچی)۔

جواب:

احادیث مبارکہ میں ریشم پہننے پر سخت وعید فرمائی ہے، حدیث پاک میں ہے: عن ثابت قال: سمعت ابن الزبیر یخطب یقول: قال محمد ﷺ: "من لبس الحریر فی الدنیا لن یلبسه فی الآخرة۔

ترجمہ: "حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن زبیر کو فرماتے ہوئے سنا: محمد ﷺ نے فرمایا: کہ جو دنیا میں ریشم پہنے آخرت میں وہ ہرگز ریشم نہیں پہنے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5833)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اس مسئلے پر احادیث نقل فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لا تلبسوا الحریر فانه من لبسه فی الدنیا لم یلبسه فی الآخرة۔ رواه الشیخان عن امیر المؤمنین عمر والنسائی وابن حبان والحاکم وصححه عن ابی سعید الخدری والحاکم عن ابی هریرة وابن حبان عن عقبة بن عامر رضی الله تعالیٰ عنهم اجمعین۔

ترجمہ: ریشم نہ پہنو جو اسے دنیا میں پہنے گا آخرت میں نہ پہنے گا (اس کو بخاری ومسلم

نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ۔نسائی ،ابن حبان اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن حبان نے حضرت عامر بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی، (صحیح بخاری باب لبس الحریر)۔

نسائی کی ایک روایت میں ہے فرماتے ہیں ﷺ :من لبسه في الدنيا لم يدخل الجنة ،رواه عن امير المؤمنين عمر رضی الله عنه ، ترجمہ: جو دنیا میں ریشم پہنے گا جنت میں نہ جائے گا، امام نسائی نے اس کو امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 22 ص: 156 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

فتاویٰ عالمگیری میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:يجب ان يعلم ان لبس الحرير وهو ما كانت لحمته حريرا وسداه حريرا حرام على الرجال في جميع الاحوال عند ابی حنيفة رحمه الله تعالیٰ۔

ترجمہ: "امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک تمام حالتوں میں، اگر کپڑے کا تانا اور بانا ریشم کا ہو تو وہ امام اعظم ابو حنیفہ (رضی اللہ عنہ) کے نزدیک تمام صورتوں میں مرد پر حرام ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص: 330 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

صاحبِ بہارِ شریعت علامہ امجد علی رحمۃ اللہ علیہ عالمگیری کے حوالے سے لکھتے ہیں: تانا ریشم ہو اور بانا سوت مگر کپڑا اس طرح بنایا گیا ہے کہ ریشم ہی ریشم دکھائی دیتا ہے تو اس کا پہننا مکروہ ہے، (بہارِ شریعت جلد دوم ص: 620 مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)۔

مالک کو بتائے بغیر بھی حقوق ادا کرنے سے انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے

سوال: 167

ایک شخص نے کسی ادارے میں کام کیا، وہاں سے کچھ مال چرالیا اور اسی

ادارے میں نوکری کے دوران بھی پوراوقت نہیں دے پایا۔ مالک کووقت نہ دینے کے بارے میں معلوم تھا،مگر وہ تنخواہ دے دیا کرتا تھا۔اب وہ شخص اس ادارے کوایک ایسی چیز دے رہا ہے، جس سے اس ادارے کوبھرپور فائدہ پہنچے گا، مثال کے طور پر اس شخص نے اس ادارے سے 200000/= دولاکھ روپے کا مال غائب کیا اور وہ بہت توبہ بھی کرتا ہے اوراس ادارے کے سامنے اپنے اس گناہ کا اظہار کرے گا تو بہت رسوائی کا سامنا ہوگا۔اب جب کہ وہ شخص اس ادارے کواگر وہ جو چیز دینا چاہتا ہے، اس کے بدلے کوئی ایسے الفاظ کے ساتھ حیلہ شرعی کرلے کہ اس کا یہ معاملہ عزت کے ساتھ حل ہوجائے۔

برائے مہربانی جتنا ممکن ہو آسان رہنمائی فرمائیں۔

سوال: 168

گناہ کے سبب جن لوگوں کی رقم کھالی یا چرالی اب ان لوگوں سے معافی مانگنا چاہتا ہے، برائے مہربانی ان سے کس طرح معاف کروایا جائے یا معافی مانگی جائے کہ عزت بھی بنی رہے اور کام بھی ہوجائے اور وہ لوگ معاف بھی کرسکتے ہیں، برائے مہربانی کچھ ایسے الفاظ کا شرعی حیلہ بتائیں کہ اس سے کہا جائے اور وہ معاف کردیں، (محمد ندیم قادری، بلاک 6 لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین امنوا لھم عذاب الیم فی الدنیاو الاخرۃ ج

ترجمہ: ”بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، ان کیلئے دنیاو آخرت میں دردناک عذاب ہے، (النور: 19)“۔

اگر چہ قرآن مجید میں ''فاحشہ'' اور ''فحشاء'' کا لفظ بطور استعارہ کے بالعموم زنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس سے عام بے حیائی اور برائی اور اخلاق ذمیمہ بھی مراد ہیں، لہٰذا اس آیت کی رو سے گناہ، برائی، اور بدی کی اشاعت اور اظہارِ گناہ ازروئے قرآن معیوب اور ناپسندیدہ فعل ہے، یہی وجہ ہے کہ قومِ لوط کے جرم کی قبح وشناعت کو عیاں کرنے کیلئے قرآن نے فرمایا کہ:

ولوطا اذ قال لقومہ انکم لتاتون الفاحشۃ ماسبقکم بھامن احدمن العلمین، ائنکم لتاتون الرجال و تقطعون السبیل و تاتون فی نادیکم المنکر ط

ترجمہ: ''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، بے شک تم بے حیائی کا کام کرتے ہو، جو تم سے پہلے جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا، کیا تم (قانون فطرت کے خلاف) مردوں سے شہوت پوری کرتے ہو اور راہزنی کرتے ہو اور تم اپنی مجلسوں میں اعلانیہ برے کام کرتے ہو، (العنکبوت:28,29)''۔

ان آیات میں قومِ لوط کے اعمال بد کا یہ رخ اجاگر کیا کہ وہ منکر، بے حیائی اور بدی کو چھپا کر کرنے کے بجائے، اس کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور اس کو ذریعۂ تفاخر سمجھتے تھے، اور یہ کیفیت تب پیدا ہوتی ہے، جب کسی معاشرے میں اجتماعی ضمیر مرجاتا ہے، بدی کی قوتیں غالب آجاتی ہیں اور خیر کی قوتیں مغلوب ہو جاتی ہیں، یعنی بدی کا اعلان واظہار اس کی شناعت وقباحت میں اضافے کا باعث ہے، شریعت کی اصل روح یہ ہے کہ ''بدی'' کو حتی الامکان مستور رکھا جائے، حدیث پاک میں ہے:

(1) عن یزیدبن نعیم عن ابیہ ان ماعزاً اتی النبی ﷺ فاقرعندہٗ اربع مرات فامربرجمہ وقال لھزال لوسترتہٗ بثوبك كان خیرالك، قال ابن المنکدران

هزالا امرماعزاً ان یاتی النبی ﷺ فیخبرہٗ۔

(ترجمہ): یزید بن نعیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ماعز نے نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوکر اپنے جرم (زنا) کا چار بار اعتراف کیا، تو آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا، اور آپ ﷺ نے ہزال سے فرمایا: کاش کہ تم نے اس کے جرم کی پردہ پوشی کی ہوتی یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا، ابن منکدر کہتے ہیں کہ ھزال نے ماعز کو کہا تھا کہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوکر انہیں اپنے گناہ کے بارے میں بتائے، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 43784377, مطبوعہ مؤسسۃ الریان، بیروت)"۔

(2) عن عبداللہ بن صفوان عن ابیہ انہ نام فی المسجدو توسدرداءہٗ فاخذ من تحت راسہ۔ فجاء بسارقہ الی النبی ﷺ ۔ فامر بہ النبی ﷺ ان یقطع۔ فقال صفوان یا رسول اللہ! ،لم اردھذا، ردائی علیہ صدقۃ، فقال رسول ﷺ "فھلا قبل ان تاتینی بہ"۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن صفوان نے اپنے والد (صفوان) سے روایت کیا کہ وہ مسجد میں اپنی چادر کا تکیہ بنا کر سوئے ہوئے تھے کہ (کسی شخص نے) ان کے سر کے نیچے سے (چادر چرالی)، تو وہ اپنے چور کو پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے، حضور نے (اعتراف جرم کے بعد) اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا، تو (اس موقع پر) صفوان نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا ارادہ یہ نہیں تھا (کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے)، میری یہ چادر اس پر صدقہ ہے (یعنی اسے معاف کردیجئے)، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو تم نے مقدمہ میرے پاس لانے سے پہلے ایسا کیوں نہ کردیا''، (سنن ابن ماجہ 2595:)''۔

چونکہ ''حد شرعی'' کا مقدمہ جب قاضی کے سامنے پیش ہوجائے تو پھر اعتراف جرم یا

گواہوں کے ذریعے جرم ثابت ہونے کے بعد مقدمہ واپس نہیں لیا جاسکتا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حد نافذ فرمادی، لیکن آپ نے اس بات کو پسند فرمایا کہ مدعی، قاضی کی عدالت میں مرافعہ سے پہلے اپنے قصوروار اور ملزم کو معاف کردے اور اس کی ستر پوشی کرے۔ بلکہ اسلام نے مسلمان کی ستر پوشی کو بہت بڑی نیکی قرار دیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(1)من سترمسلماستره الله يوم القيمه۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیوب کو (اپنی عفو ومغفرت اور رحمت میں) مستور فرمائے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2442)''۔

(2)من رأى عورة اخيه فسترها كمن احيا موؤدة۔

ترجمہ: ''جس شخص نے اپنے (کسی دینی بھائی) کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی، تو وہ (اللہ تعالیٰ کے ہاں) اس شخص کی مانند اجر پائے گا، جس نے کسی زندہ درگور بچی کو (نکال کر) اسے (نئی) زندگی عطا کردی ہو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث 4855)''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین وشریعت کی اصل روح یہ ہے کہ خطا کار کی پردہ پوشی کی جائے، الا یہ کہ کسی خاص صورت حال میں شریعت کا تقاضا اس کے برعکس ہو۔ اب صورت مسئولہ میں چونکہ آپ پر اللہ کا کرم ہوا اور آپ نے ماضی کی معصیت کی زندگی کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور حقوق العباد کی جو حق تلفی آپ سے ہوئی ہے، آپ اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ''ستارالعیوب'' ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور جتنا مال

آپ نے ادارے یا افراد کا ناحق لیا ہے، اتنی مالیت آپ ان کو لوٹا دیں، اس طرح کہ وہ اس پر مالکانہ تصرف کرسکیں، خواہ آپ اسے عطیہ کا نام دیں، ھبہ کا نام دیں یا اعانت کہیں، جو بھی حالات کے تحت مناسب ہو، ان کو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ آپ نے ان کا اتنا مال ناجائز طریقے سے لیا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اللہ تعالٰی سے دعا بھی کرتے رہیں کہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے ظلِ رحمت اور اپنے حبیب کریم ﷺ کے دامان رحمت میں پناہ عطا فرمائے اور دنیا و حشر میں رسوائی سے محفوظ فرمائے۔ اور ان افراد سے یہ کہیں کہ مجھے احساس ہے کہ دانستہ یا نادانستہ مجھ سے آپ کی حق تلفی ضرور ہوئی ہوگی، خواہ آپ کو یاد ہو یا نہ ہو، میری ان سب تقصیرات کو معاف فرمادیں تاکہ میں اپنے ضمیر کو مطمئن کرکے اور احساس گناہ کے بوجھ سے ہلکا ہوکر سفرِ حج پر روانہ ہوسکوں اور اللہ تعالٰی کے اس اجر و ثواب کا یقینی امیدوار بن سکوں، جو رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور کیلئے بیان فرمایا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (ویبرأ بردها ولو بغیر علم المالك) فی "البزازیة" غصب دراهم انسان من کیسه ثم ردها فیه بلاعلمه برئ۔

ترجمہ: "اور (جس نے کسی کی کوئی چیز غصب کرلی ہو یا باطل طریقے سے لے لی ہو تو) اسے مالک کے علم میں لائے بغیر اسے لوٹا دینے سے وہ غاصب بری الذمہ ہوجائے گا، اور "بزازیہ" میں ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کی کچھ رقم، اس کے پرس سے نکال لی اور پھر اسے بتائے بغیر واپس رکھ دیا (یا اسے لوٹا دیا) تو وہ بری الذمہ ہوجائے گا، (ردالمحتار علی الدر المختار: جلد: 9، ص: 220 ,219، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ولو سالہ سلطان عن فاحشة وقعت منه سرا کزنا

او شرب فله ان يقول ما فعلته لان اظهارها فاحشة اخرى ۔

ترجمہ: ''اگر حاکم کسی شخص سے اس کے جرم کے متعلق پوچھے، جو اس نے چھپا کر کیا ہے، جیسے شراب پینا یا زنا کرنا تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ کام میں نے نہیں کیا، چونکہ بے حیائی کا اظہار بھی بے حیائی ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار: جلد: 9، ص: 525، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی

سوال: 169

والدہ کے انتقال کے بعد میرے چھوٹے بھائی طارق نے مجھ پر غلط قسم کے الزامات لگائے اور میرے بچوں سے تمام بات کی، مجھے بعد میں معلوم ہوا تو میں نے اس سے پوچھا اس بات پر میرے ساتھ مار پیٹ کی جھگڑا بڑھ گیا اس کی بیوی نے بھی میرے ساتھ تشدد کیا۔ جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی۔ اب آپ شرع حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ یہ قسم کیسے توڑی جائے گی؟، (جہاں آراء، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

آپ نے اپنے سوال میں لکھا ہے: ''جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی''، اس میں آپ کے قسم کھانے کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور ''اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی'' یہ شرعی قسم کے کلمات نہیں ہیں، لغو کلمات ہیں، اگر چہ بندۂ مومن کو اس طرح کے کلمات ادا

نہیں کرنے چاہئیں ۔لہٰذا اگر آپکا سوال درست ہے، حقیقت واقعہ کے مطابق ہےتو اس سے شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی، آپ اپنے بھائیوں سے مل سکتی ہیں، اس میں کوئی کفا رہ عائد نہیں ہوتا، اور آپ کے بیٹے کو بھی اپنے ماموں سے ملنا چاہئے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:"لا يحلّ لرجلٍ أن يهجر أخاه فوق ثلاث ليالٍ"۔

ترجمہ:''مؤمن کیلئے یہ جائز نہیں کہ اپنے (دینی) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق (Boycoh) کرے،(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6077)''۔

نیز آپ کے بھائی نے اگر غلط الزامات لگائے ہیں تو انہیں بھی آپ سے اور اللہ سے معافی مانگنی چاہئے۔

پرائز بانڈز اور شیئرز کا شرعی حکم

سوال: 170

کیا Shares اور Prize Bond کا رکھنا جائز ہے؟،

(کامران، کراچی)۔

جواب:

جن اداروں/کمپنیز کے کاروبار میں سودی لین دین شامل ہے یا کسی حرام چیز کا کاروبار ہے، تو اس کے شراکتی حصص (Shares) رکھنا یا اس کا شراکت دار بننا جائز نہیں ہے، اور جن اداروں/کمپنیز کے کاروبار میں سودی لین دین شامل نہیں ہے یا وہ شرعی طور کسی ممنوع وحرام چیز کا کاروبار نہیں ہے، تو اس کا شراکت دار (Share Holder) بننا جائز ہے ۔انعامی بانڈز (Prize Bond) کی خرید وفروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے، بانڈ پر درج قیمت (Face value) پر خرید وفروخت میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی انعامی رقم کے جواز پر علماء کا

اختلاف ہے، ہمارے علماء اہلسنت و جماعت کے نزدیک یہ انعامی رقم لینا جائز ہے،اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے، میں ماضی میں ایکسپریس کے صفحات پر اس موضوع پر قدرِ تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں، یہ اختلاف فقہی دلائل کی بنیاد پر ہے، یہ مسلکی نوعیت کا، اصولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔ دورِ حاضر کے ایسے مسائل جو ''مجتہد فیہ'' ہیں، یعنی جن پر اس عہد کے اہلِ فتویٰ اور اہلِ علم نے دلائل شرعیہ کی روشنی میں جواز یا عدمِ جواز کا حکم لگانا ہوتا ہے،اور علماء کی فقہی آراء ان بارے میں مختلف ہوتی ہیں ہتو ایسی صورت میں عامۃ المسلمین کو میرا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ جن علماء کی فقاہت اور اجتہادی اہلیت پر انہیں زیادہ اعتماد ہو، ان کی رائے پر عمل کرلیا کریں، لیکن یہ ترجیح دیانت کی بنیاد پر ہو محض اتباعِ نفس میں نہ ہو۔

ٹریفک سگنل توڑنے کا شرعی حکم

سوال: 171

ٹریفک سگنل جو کہ عوام کی بھلائی کے لئے بنایا گیا ایک قانون ہے اور عمومی طور پر اس کی پاسداری عوام میں نظر نہیں آرہی ہے ہسوال یہ ہے کہ کیا سگنل کا توڑنا گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے؟، (کامران، کراچی)۔

جواب:

اسلام نے حلال وحرام کی حدود مقرر کردی ہیں، جن امور کی حرمت قرآن وسنت میں منصوص ہے، وہ قطعی ہیں ان کی حرمت پر اجماع ہو چکا ہے، ان کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے باقی ایسے تمام امور جو اپنی اصل کے اعتبار سے تشریعی نہیں ہیں، ان کے بارے میں ہمارا مسلمہ فقہی اصول ہے کہ: ''اشیاء میں اصل اباحت ہے'' تاوقتیکہ کسی دلیل شرعی سے اس کی حرمت ثابت نہ ہو جائے۔ان مباح

امور کا دائرہ کافی وسیع ہے،ان کے بارے میں حاکم وقت (اس کی حیثیت حاکمہ حالات وزمانہ کے اعتبار سے جو بھی ہو)،مقننہ (Legislature) یا پارلیمنٹ کو اجتماعی مفاد میں قانون سازی کا حق حاصل ہے،''Traffic Signal'' یا یکطرفہ ٹریفک، دائیں یا بائیں مڑنے کی ممانعت یا پارکنگ کی ممانعت سب قوانین اسی کے ذیل میں آتے ہیں،حکومت عوامی مفاداور انسانی زندگی کو نقصان یا ہلاکت سے بچانے کے لئے تعزیر بھی مقرر کرسکتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:لان طاعة الامام فیمالیس بمعصیة واجبة ۔

''یعنی ایسے امور میں حاکم وقت کی اطاعت،جن میں ازروئے شریعت معصیت لازم نہ آتی ہو، واجب ہے،اورترک واجب گناہ صغیرہ ہوتا ہے،مومن کو ویسے بھی عزت نفس کا پاس رکھنا چاہئے''۔

کامرس یا اکاؤنٹنگ کی تعلیم میں سودی اندراج

سوال: 172

کالجوں میں عام طور پر حساب وکتاب کے حوالے سے سود کا درج کرنا اور اس کو وصول کرنا وغیرہ وغیرہ سکھایا جاتا ہے،کیا اس کی لکھت پڑت جائز ہے حالانکہ یہ عمل صرف سکھانے کی حد تک ہوتا ہے؟اور یہ بھی بتائیں کہ کیا اس کا سکھانا گناہ کے کس درجے میں ہوگا(کبیرہ/صغیرہ)؟،(کامران،کراچی)۔

جواب:

حصول علم کی حد تک یہ جائز ہے،کیونکہ کامرس،اکاؤنٹینگ اور آڈٹنگ کے نصابی وتربیتی کورسز کا یہ لازمی حصہ ہوتے ہیں،سودی کاروباری ادارے میں ملازمت جائز نہیں ہے۔

بجلی کی چوری

سوال: 173

آپ جانتے ہوں گے کہ عموماً حکومت کے محکموں کی نااہلی کی وجہ سے جیسا کہ بجلی کے بل جو کہ صارف کو بھیجے جاتے ہیں ان میں بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ بل بنا کر بھیج دیا جاتا ہے، جبکہ اس پر اتنا بل لازم نہیں ہوتا وہ صارف اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے بجلی کے میٹر میں کچھ کمی بیشی کرواتا ہے اگرچہ قانوناً یہ جرم ہے لیکن مجبوری میں ایسا کیا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟، ناجائز ہونے کی صورت میں صارف اس رقم کی ادائی کس طرح کرے جو کہ چوری کی تھی اور اس چوری کے دوران جتنی عبادات کی تھیں کیا وہ سب ثواب سے محروم ہو گئیں؟یا ان کا لوٹانا واجب ہے؟، (کامران،کراچی)۔

جواب:

بجلی کے میٹر میں ردوبدل کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح بجلی کے محکمے کا میٹروں کو تیز کر کے صارفین سے زائد بل لینا، یہ بھی خیانت ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صریح خلاف ورزی ہے کہ: ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ ترجمہ:''آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ(النساء:29)''۔لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا ظلم ہمارے لئے ظلم کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، یہ شیطان کے بہکاوے اور تزویرات ہیں، جو انسان کے نفس کو گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ○ ولو القیٰ معاذیرۃ۔ ترجمہ:''بلکہ انسان اپنے نفس (کے حسن وقبح اور خیر وشر) پر خوب آگاہ ہے، خواہ وہ (فریبِ نفس کے لئے

) کتنے ہی عذر تراشتا رہے،(سورۃ القیامۃ :15-14)''،اورارشادِ باری تعالیٰ ہے:ان کلُّ نفسٍ لما علیھا حافظ ترجمہ:''ہرنفس اپنےاوپرنگہبان ہے، (الطارق:4)''۔حدیث پاک میں ہے: عن النواس بن سمعان أن رجلاً سأل رسول اللہ ﷺ عن البر و الاثم "فقال النبی ﷺ : "البرُّ حسن الخلق ، والاثم ماحاك فی نفسك و کرھت أن یطلع علیه الناس "۔

ترجمہ:''نواس بن سمعان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اورگناہ (کی پہچان) کی بابت دریافت کیا،تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے،اور برائی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے(یعنی جس پرتمہارے دل میں چبھن اورکسک محسوس ہو)اور تجھے یہ بات نا گوار ہو کہ لوگوں کواس کا پتہ چل جائے ،(سنن ترمذی،رقم الحدیث:2389)''۔

حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ نیکی اورگناہ کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ،تو قبل اس کے کہ وہ اپنے دل کی بات کہتے ،رسول اللہ ﷺ نے اس کے دل کا حال بیان کرتے ہوئے خود ہی فرمایا: کہ تم نیکی اور گناہ کی بابت پوچھنے آئے ہو؟،انہوں نے عرض کیا:جی ہاں،پھرآپ نے فرمایا:اے وابصہ !اپنے دل سے پوچھو،نیکی وہ ہے،جس پرتمہارے دل کواطمینان وقرارنصیب ہوجائے اورگناہ وہ ہے جوتمہارے دل میں کھٹکےاورتمہیں دل میں تردُّد ہو(کہ کروں یا نہ کروں)،اگرچہ لوگ تمہیں (اپنے من پسند)فتوے دیتے رہیں، (مسند احمد،جلد 4،ص:228)''۔

عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پرمحرمات کا اثر پڑتا ہے اوراس سلسلے میں احادیث موجود ہیں:عن ابن عمر ، عن النبی ﷺ قال: "لا تقبل صلاۃ بغیر طھور ،

ولا صدقة من غلول "۔ ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1)''۔

عن ابی هريرة قال :قال رسول الله ﷺ : "ايهاالناس ! ان الله طيب لا يقبل الا طيبا ـ وان الله أمر المؤمنين بما امربه المرسلين ـ فقال: ﴿ياايهاالرسل كلوا من الطيبت واعملوا صالحا أنى بماتعملون عليم﴾ وقال : ﴿ياايها الذين امنوا كلوا من طيبات مارزقنكم﴾ ثم ذكر الرجل يطيل السفر اشعث اغبر ـ يمد يديه الى السماء ـ يارب! يارب! ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام وغذى بالحرام ، ـ فانى يستجاب لذالك ؟ ـ

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ صرف پاک (صدقات کو) مقبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسولو! پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو، مجھے اس کا بخوبی علم ہے، (المومنون: 51)''۔ پھر آپ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ غبار آلود ہے، بال پراگندہ ہیں، طویل سفر کرکے آیا ہے، اور اپنے ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگا! اور اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام سے ہے اور لباس حرام کا ہے اور اسے حرام ذرائع سے غذا دی جاتی ہے، تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2308)''۔

انجکشن کے ذریعے جانوروں کی افزائشِ نسل کا جواز

سوال: 174

جانوروں کی نسل بڑھانے کے لئے انجکشن لگانے والا طریقہ جائز ہے یا نہیں؟،(اسد رؤف بلوچ، کراچی)۔

جواب:

جانوروں کی افزائشِ نسل (Breeding) کے لئے نر جانور (Male Animal) کے مادۂ منویہ (Semon) کے تولیدی جرثومے (Sperm) کو انجکشن کے ذریعے مادہ جانور (Female Animal) کی بچہ دانی (Uterus) میں پہنچانا جائز ہے،اس کے نتیجے میں حلال جانوروں (بھیڑ، بکری ،گائے، بھینس،اونٹنی وغیرہ) کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی حلال ہوتے ہیں،ان کی قربانی بھی ہر قسم کی کراہت سے پاک ہے اور جائز ہے ۔احکامِ شرعیہ اور رشتۂ ازدواج اور عقد نکاح کی حِلّت (Permission) اور حُرمت (Prohibition) کے احکام کا تعلق انسانوں سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمتِ عقل عطا کر کے خیر وشر اور حلال وحرام میں تمیز کا ملکہ اور فطری استعداد اور جبلّت بھی عطا فرمائی ہے اور انبیاء کرام ورُسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور کتب سماوی کے ذریعے خارجی ہدایت کا بھی اہتمام فرمایا ہے، جانور احکام کے مکلّف نہیں ہیں ۔

روحانی علاج کی شرعی حیثیت

سوال: 175

روحانی علاج کا حکم قرآن پاک سے ثابت ہے۔تو قرآن پاک اور حدیث کی روشنی میں اور مستند کتابوں کے حوالوں سے روحانی علاج کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

سوال: 176

روحانی علاج جوکہ کلام الٰہی سے کرتے ہیں اوراس کا ہدیہ مبارک لیتے ہیں یہ جائز ہے؟تو قرآن پاک اورحدیثوں کے حوالوں سے اومستند کتابوں کے حوالے سے فتویٰ عنایت فرمائیں،تا کہ ہماری دینی اصلاح ہوجائے ،(صوفی محمداقبال قادری چشتی ناصری جلالی،مکان 135/10 سیکٹر 11/D نیو کراچی)۔

جواب:

کسی کے لئے دعائے خیر،آیاتِ الٰہی یا کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنا یا اسمائے مبارکہ اور آیات لکھ کر تعویذ کی صورت میں باندھنا یا لٹکانا شرعاً جائز ہے۔امراض جس طرح جسمانی وطبعی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی ،اخلاقی اور اعتقادی بھی ہوتے ہیں،اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے"شافی الامراض بالذات" صرف اورصرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اوراس کی مشیت کےبغیر شفاء کاملنا ناممکن ہے،لیکن یہ عالم اسباب ہے اورہم شرعاً اسباب کواختیار کرنے کے مکلّف ہیں یا یہ کہ اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے۔جیسے بیماری کی صورت میں ہم ڈاکٹر سے رجوع کر تے ہیں اوردواؤں کا استعمال کرتے ہیں ،لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اوردوا کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔اسی طرح دعا، دم اورتعویذ وغیرہ ازالۂ مرض وشر کے روحانی اسباب ہیں جیسے دوا مادی سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:

وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين لا ولا يزيد الظّٰلمين الّا خسارا○

ترجمہ:"اورہم قرآن میں ایسی چیز نازل فرماتے ہیں جو اہل ایمان کے لئے

(وسیلہ) شفاور حمت ہے اور ظالموں کے لئے تو صرف نقصان ہی میں اضافہ کر رہا ہے، (بنی اسرائیل:80)"۔

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ قرآن اخلاقی اور اعتقادی امراض کے لئے شفا ہے، تاہم جمہور مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آیات قرآنی پڑھ کر دم کرنے یا آیات واسمائے الٰہی کا تعویذ باندھنے سے اللہ تعالیٰ جسمانی امراض سے بھی شفا عطا فرماتا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد اور مسند احمد میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور ایک شخص جو بچھو کے کاٹنے سے تڑپ رہا تھا اسے شفا مل گئی، انہوں نے اس پر بکریوں کا ریوڑ معاوضہ بھی لیا۔ لیکن صحابہ کا آپس میں اختلاف ہو گیا کہ آیا یہ اجرت، جسے آج کل کی اصطلاح میں نذرانہ کہتے ہیں، جائز ہے یا نہیں؟ لہٰذا انہوں نے توقف کیا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر حضورﷺ سے اس کا شرعی حکم دریافت کیا تو آپ نے نہ صرف اسے جائز قرار دیا بلکہ فرمایا کہ اس میں سے مجھے بھی دو۔ یہ بعض مواقع پر حضورﷺ اس لئے کرتے تھے تا کہ صحابہ کرام کو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ آیات قرآنی اور کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنے (نظر بد یا موذی جانوروں کے ایذا یا جنات وغیرہ کے اثر یا مرگی کے دورے سے تحفظ کے) کا ثبوت وجواز متعدد احادیث مبارکہ اور رسول اللہﷺ کے اپنے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید کی ضمنی اور اضافی برکات ہیں۔ بنیادی طور پر قرآن مجید کتاب ہدایت اور ضابطۂ عمل ہے جس پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس کے احکام پر عمل بھی اور قرآن پاک کی اسی جہت کو غالب حیثیت حاصل ہے۔ جن احادیث مبارکہ میں تعویذ یا دم کی ممانعت آئی ہے وہ اس پر محمول ہے کہ (1) وہ دم یا منتر کلمات شرک وکفر یا کلمات ضلالت پر مشتمل ہو اور (2) یا یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کو فراموش کر کے محض اسباب کو مو

ثر بالذات مانے۔ بلا شبہ موثر بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسباب میں تاثیر اسی نے پیدا فرمائیں اور وہ جب چاہے اسے سلب فرما سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حوالہ جات بالا سے روحانی علاج اور اس پر ہدیہ و نذرانہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿متفرق﴾

والدین کی خدمت کے وسیلے سے دعا کرنے پر اجرِ آخرت باطل نہیں ہوتا

سوال: 177

کسی نے بتایا تھا کہ والدین کی خدمت کا بہت اجر ہے۔سوال یہ ہے کہ ''اگر ہم اس خدمت کے واسطے سے دعا کریں،تو اس کا اجر کم تو نہیں ہوگا، کہ یہاں مل جائے تو آخرت میں اللہ کہے کہ اجر تو دنیا میں ہی لے لیا ہے،اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو''۔قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں،(حماد خان،بذریعہ ای میل معرفت روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب:

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: یاایھا الذین امنو استعینوا بالصبر والصلوۃ۔ ترجمہ:''اے ایمان والو!صبر ونماز(کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی)مدد طلب کرو،(البقرۃ:153)''۔اس ارشادِ باری تعالیٰ سے معلوم ہوا کہ اعمالِ خیر کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے استعانت کا وسیلہ بنایا جاسکتا ہے،آیت میں صبر اور نماز کا ذکر ہے اور بعض مفسرین کرام نے صبر سے روزہ مراد لیا ہے۔ظاہر ہے کہ وہی عملِ خیر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول وماجور ہے جو دنیوی صلہ وستائش کی تمنا کیے بغیر محض اجرِ آخرت اور رضاءِ الٰہی کے لئے کیا جائے اور حدیثِ مبارک''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' یعنی اعمال(پر جو جزا مرتب ہوتی ہے اس کا)مدار(اس کی)نیت اور ارادے پر ہوتا ہے(جو اس عمل کا محرک بنتی ہے)،سے بھی یہی مراد ہے۔اور اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے:

ومـاامروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين۔ترجمہ:’’اورانہیں فقط اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس حال میں کریں کہ اطاعت خالص اسی کی ذات کے لئے ہو،(البیّنۃ: 5)‘‘۔

حدیث پاک میں ہے:امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جسے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کے کسی بندے سے کوئی حاجت درپیش ہوتو اسے چاہئے کہ وضو کرے اور نہایت اچھے طریقے سے وضو کرے،پھر دو رکعت نماز نفل (صلوٰۃ الحاجت) پڑھے،پھر اللہ تعالیٰ کی ثنا پڑھے،پھر نبی ﷺ پر درود پڑھے اور پھر یہ دعا پڑھے:لَآاِلٰـہَ اِلااللّٰـہُ الْـحَلِیْمُ الْکَرِیْمُ،سُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ،اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، اَسْئَلُکَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِکَ،وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِکَ،وَالْغَنِیْمَۃَ مِنْ کُلِّ بِرٍّ،وَالسَّلَامَۃَ مِنْ کُلِّ اِثْمٍ، لَا تَدَعْ لِیْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَہٗ، وَلَا ھَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَہٗ،وَلَا حَاجَۃً ھِیَ لَکَ رِضًا اِلَّا قَضَیْتَھَا یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

ترجمہ:’’اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں،بہت بُردبار نہایت کرم فرمانے والا ہے،اللہ (ہرعیب اور نقص سے) پاک ہے،عرش عظیم کا مالک ہے،تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پرودگار ہے،اے اللہ!میں تجھ سے (ان اعمالِ خیر کی توفیق چاہتا ہوں) جو تیری رحمت کا باعث ہوں،اور ایسے نیک پختہ ارادوں کا طلب گار ہوں جو تیری مغفرت کا سبب بنیں،اور تجھ سے تمام نیکیوں کی توفیق کا سوال کرتا ہوں اور ہر گناہ سے حفاظت کا طلبگار ہوں،(میرے) ہر گناہ کو بخش دے،ہر غم (اور رنج والم) میں کشادگی عطا فرما،اے سب سے بڑے رحم فرمانے والے!میری ہر اس حاجت کو پورا فرما جو تیری رضا کا باعث ہے، (سنن ترمذی، رقم

الحدیث: 479)''،اس حدیث کوامام ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے،لیکن فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیثیں بھی معتبر ہوتی ہیں۔اسی طرح صحیح بخاری رقم الحدیث: 2215 میں تین آدمیوں کے غار میں پھنس جانے کا ذکر ہےاور پھر وہ باہمی مشورے سے باری باری اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان نیک اعمال کا ذکر کرتے ہیں ،جوانہوں نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کئے تھے،ان میں سے ایک شخص نے ماں باپ کی اس خدمت کاوسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا،جواس نے رضاءِالٰہی کے لئے کیا تھا،اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے اعمالِ خیر کے وسیلے کواپنی بارگاہ میں مقبول فرمایااوروہ چٹان جس نے ان کی غار کادہانہ بند کردیا تھااوروہ اس میں پھنس کررہ گئے تھے،آہستہ آہستہ سرکتی گئی اورآخرکار غار کا دہانہ کھل گیااوروہ صحیح سلامت باہر نکل آئے۔اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جوعملِ خیرانجام دیا جائے،اس کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے استعانت (مدد مانگنے) کاخوداللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم فرمایا ہے،یہ صیغۂ امر کے ساتھ ہے جوکم درجے میں استحباب کے معنیٰ میں ضرور ہے۔اسی طرح قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ سے دعامانگنے کی ترغیب دی گئی ہے،کوئی بھی نیک عمل جو رضاءِالٰہی کے لئے کیا گیا ہو،اس کے وسیلے سے دعا مانگنا،خواہ عذابِ آخرت سے نجات کی دعا ہو،یاکسی دنیوی مصیبت سے نجات کی،اس سے اس عملِ خیر کا اجرِآخرت ضائع نہیں ہوتااوراللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی امید قائم رکھنی چاہئے، اسی طرح آپ نے سوال میں جووالدین کی خدمت کی بابت دریافت کیا ہے،اگراس کے وسیلے سے کسی دنیوی مصیبت کوٹالنے کی دعا کی جائے،تواس سے اس کا اجر باطل نہیں ہوتا بلکہ قائم رہتا ہے،بشرطیکہ والدین کی یہ خدمت کسی دنیوی طمع وغرض سے نہ کی ہو بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے کی ہو۔

پرائیویٹ اسکولوں / کالجوں میں ایامِ تعطیلات کی فیس کا شرعی حکم

قوم کا اصل مسئلہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے

سوال: 178

کچھ عرصہ قبل نیو کراچی میں ایک مفتی صاحب حلال وحرام کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسکولوں میں چونکہ ماہ جون اور جولائی میں تدریس نہیں ہوتی لہٰذا ان مہینوں کی فیس لینا اسکول والوں کے لئے جائز نہیں۔ مفتی صاحب کی تقریر نے اس علاقہ میں اسکول مالکان کے لئے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ قانون کے مطابق اسکولوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسٹاف کو جون اور جولائی کی تنخواہیں پوری پوری ادا کریں، مزید یہ کہ جو اسکول کرائے کی عمارتوں میں قائم ہیں انہیں ان مہینوں کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جون، جولائی کی فیسیں وصول نہیں کی جائیں تو اسٹاف کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟ جناب سے التماس ہے کہ اس مسئلے پر روشنی ڈالیں اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمائیں، (انتظامیہ نالج انگلش اسکول، 25/12 سیکٹر 5-E نیو کراچی)

جواب:

معاہدات وعقود بعض مشروط ہوتے ہیں اور یہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس سے بعد میں کوئی تنازع پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسکول کی انتظامیہ کو چاہئے کہ داخلہ فارم کی شرائط میں واضح طور پر لکھ دے کہ طالب علم کو بارہ ماہ کی فیسیں پوری ادا کرنی ہونگی۔ سالانہ تعطیلات اس لئے نہیں ہوتیں کہ اسکول کی انتظامیہ یا اساتذہ پڑھانا نہیں چاہتے، بلکہ ان تعطیلات کا نظام حکومت کی طرف سے جبری ہوتا ہے اور یہ ایک عالمی

روش ہے۔اگر داخلہ فارم کے معاہدے میں لکھا نہ بھی ہو تب بھی یہ معہود (Under stood) ہوتا ہے اور فقہی قاعدہ ہے کہ "المعہود کالمشروط" یعنی یہ ایک ایسی شرط ہے جو فریقین کے ذہن میں بھی تقریباً طے شدہ ہے اور خارج میں بھی تعاملِ عام (General practice) اسی پر ہے۔لہٰذا اسکولوں کے لئے ایامِ تعطیلات کی فیس لینا جائز ہے اور اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔اس تنازع کے حل کے لئے فریقین یہ بھی کرسکتے ہیں کہ سالانہ بارہ ماہ کی فیسوں کی جو مجموعی رقم بنتی ہے، اسے دس ماہانہ قسطوں میں تقسیم کردیں اور اس طرح تعطیلات کے مہینوں کے بارے میں یہ نزاع پیدا ہی نہیں ہوگا۔اور یہ بات بھی درست ہے کہ اسکول کی انتظامیہ کو اپنے عملے کو بارہ ماہ کی تنخواہ دینی ہوتی ہے ،اور اسی طرح بلڈنگ کا کرایہ اور دیگر واجبات بھی ادا کرنے ہوتے ہیں ،لہٰذا مفتی صاحب کا حقائق کو معلوم کیے بغیر اس پر حرمت کا فتویٰ لگانا درست نہیں ہے، البتہ ان اعلیٰ کیٹگری کے تعلیمی اداروں کے خلاف آواز اٹھانا درست ہے، جو غیر معمولی فیسیں اور مختلف عنوانات کے تحت دیگر رقوم بھی بٹورتے ہیں، جس کی وجہ سے تعلیم صنعت بن چکی ہے، بلکہ یہ سب سے کامیاب اور منافع بخش صنعت ہے، اور یہی سبب ہے کہ اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے صرف اُمراء، صنعت کاروں، اعلیٰ مراتب کے بیوروکریٹ اور اہلِ ثروت کے بچوں کے لئے مختص ہوکر رہ گئے ہیں ۔اور اس طرح تموّل وغربت پر مبنی یہ ایک طبقاتی نظام بن چکا ہے، جس میں دولت سے محروم طبقات استحقاق، اہلیت ،محنت اور قابلیت کے باوجود وافر دولت نہ ہونے کے سبب مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں، اولین مرحلے ہی میں حاکم ومحکوم کی منزلیں جدا ہوجاتی ہیں۔

استخارہ کا مفہوم، شرعی حیثیت اور استخارہ کے نام پر ماضی کے احوال بتانا

سوال: 179

استخارہ کا معنی ومفہوم کیا ہے اور حدیث کی روشنی میں اس کا صحیح طریقہ کیا ہے، کیا ہر معاملے میں استخارہ کرنا ضروری ہے، کسی کام سے پہلے استخارہ نہ کرنے والا یا استخارہ کرنے کے بعد اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کرسکے تو گنہگار تو نہیں ہوگا؟، (منور احمد نعیمی، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

استخارہ کے لفظی معنٰی ہیں: خیر طلب کرنا اور اس کے جامع معنٰی ہیں: وہ معاملہ جس کے نفع بخش یا نقصان دہ ہونے کا انسان اپنی عقل کی روشنی میں فیصلہ نہ کرسکے اور تردُّد میں مبتلا ہوجائے کہ اسے کروں یا نہ کروں، تو اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرے، اس کا تعلق ماضی کے معاملات سے نہیں ہے، مستقبل میں درپیش ایسے معاملات سے ہے، جن کو کرنا ہے۔ ایسے تمام معاملات جن کا خیر ہونا شریعت میں ثابت ہے، ان کے لئے استخارہ نہیں کیا جائے گا، جیسے نماز، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ، فارسی کا مقولہ ہے ع درکارِ خیر حاجتِ استخارہ نیست۔ ہاں البتہ کسی کارِ خیر کے لئے شریعت میں وقت مقرر نہیں ہے بلکہ توسُّع ہے، تو تعیینِ وقت کے لئے استخارہ کرسکتے ہیں۔ بنیادی طور پر استخارہ مباح امور میں ہوتا ہے، جیسے نکاح اپنی اصل کے اعتبار سے مشروع ہے اور سنت ہے اور بعض اشخاص کے لئے ان کے بشری احوال کے مطابق واجب کے درجے میں ہے، لیکن نکاح کے لئے کس کا انتخاب کیا جائے، اس کے لئے اگر کوئی پیغام یا پیشکش آئے تو اس کے لئے استخارہ کیا جاسکتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

عن جابر رضي الله عنه قال كان النبي ﷺ يعلمنا الاستخارة في الامور كلها كالسورة من القرآن اذاهم احدكم بالامر فليركع ركعتين من غير الفريضة ثم يقول اللهم اني استخيرك بعلمك وأستقدرك بقدرتك وأسئلك من فضلك العظيم فانك تقدر ولااقدر، وتعلم ولااعلم، وانت علام الغيوب، اللهم ان كنت تعلم ان هذاالامر خيرلي في ديني ومعاشي وعاقبة امري۔او قال في عاجل امري وآجله۔ فاقدره لي وان كنت تعلم أن هذاالامرشرلي في ديني ومعاشي وعاقبة امري اوقال في عاجل أمري وآجله فاصرفه عني واصرفني عنه واقدرلي الخير حيث كان ثم ارضني به ويسمي حاجته۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ہمیں تمام امور میں ''استخارہ'' کی تعلیم فرماتے تھے، اس اہتمام کے ساتھ، جیسے قرآن کی کسی سورت کی تعلیم فرمایا کرتے تھے، (تو استخارہ یہ ہے کہ) جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے، تو اسے چاہئے کہ دو رکعت نفل پڑھے، پھر کہے: اے اللہ! میں تیرے علم کی روشنی میں خیر کی طرف رہنمائی چاہتا ہوں، اور تیری قدرت سے (حصولِ خیر کے لئے) قدرت کا طلبگار ہوں اور میں تیرے فضلِ عظیم سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تو قدرت والا اور میں عاجز و بے بس ہوں، اور تو (ہر معاملے کے انجام کو) جانتا ہے، اور میں کچھ بھی نہیں جانتا اور تو تمام غیبی امور کا بہت زیادہ جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ (جو مجھے درپیش ہے) میرے دین، میرے معاش اور انجامِ کار کے اعتبار سے، اور فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے، تو تو اسے میرے لئے مقدر فرما۔ اور (اے اللہ!) اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ

(جو مجھے درپیش ہے) میرے دین، میرے معاش اور انجامِ کار کے اعتبار سے، فوری اور دیر پا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے برا ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے اور مجھے اس سے دور کر دے، اور (اس کے بدلے میں) خیر جہاں بھی ہے، وہ میرے لئے مقدر فرما، پھر اس پر میری طبیعت کو راضی کر دے (یعنی مجھے اس کے بارے میں قلبی اطمینان اور قرار و سکون نصیب ہو جائے کہ بس یہی میرے لئے خیر ہے)، اور "ہٰذا الامر" (یعنی یہ معاملہ) کے بجائے (چاہے تو) اپنی حاجت کا نام لے کر دعا کرے (جیسے شادی، کاروبار، کسی کے ساتھ شراکت وغیرہ، الغرض جو بھی مسئلہ درپیش ہو، اس کا نام لے)، (صحیح البخاری، جلد 4 ص: 2004، رقم الحدیث: 6382 مطبوعہ المکتبۃ العصریہ، بیروت)۔ اس حدیث کو امام مسلم کے سوا محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے، مثلاً امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام بیہقی وغیرہم۔

"علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ومنها رکعتا الاستخارة۔

اور ان مستحب نمازوں میں دو رکعت نماز استخارہ ہے، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی الحلیة ویستحب افتتاح هذا الدعاء وختمه بالحمدلة والصلوة وفی الاذکار انه یقرء فی الرکعة الاولیٰ الکافرون وفی الثانیة الاخلاص وعن م بعض السلف انه یزید فی الاولی "وربك یخلق ما یشاء ویختارُ ط ما کان لهم الخیرة ط سبحٰن الله وتعالیٰ عما یشرکون o وربك یعلم ماتکن صدورهم وما یعلنون" وفی الثانیة وما کان لمؤمن ولا مؤمنة۔ الایه۔ وینبغی ان یکررها سبعا کما روی ابن السنی یاانس اذاهمت بأمر فاستخر ربك فیه

سبع مرّات ثم انظر الى الذی سبق الیٰ قلبك فان الخیر فیه ولو تعذرت علیه الصلوٰۃ الستخارۃ بالدعاء ا ہ ملخصاوفی شرح الشرعة المسموع من المشائخ انه ینبغی ان ینام علی طهارۃ مستقبل القبلۃبعد قرا ء ۃ الدعاء المذکورفان رایٰ فی منامه بیاضا او خضرۃ فذالك الامر خیر و ان رایٰ فیه سوادا أو حمرۃ فهو شر ینبغی ان یجتنب اه۔

اور''حلیہ'' میں ہے اوراس دعاءِ استخارہ کی ابتدا اورآخر میں حمد وصلوٰۃ پڑھنا مستحب ہے،اور''الاذکار'' میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ''الکافرون''پڑھےاوردوسری میں سورۂ''اخلاص''اوربعض بزرگوں سے روایت ہے کہ پہلی رکعت میں "وربك یخلق ما یشاء ویختارُ ط ماکان لهم الخیرۃ ط سبحٰن الله وتعٰلیٰ عما یشرکون o وربك یعلم ماتکن صدورهم وما یعلنون o(القصص:69-68) تک ان کلمات کا اضافہ کرے اور دوسری رکعت میں سورۂ احزاب،آیت:36 کا اضافہ کرے۔(اوراگر درپیش مسئلہ کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قلبی اطمینان حاصل نہ ہوتو) سات دن تک مسلسل یہ نماز پڑھے،جیسا کہ ابن السنی نے روایت کیا ہے:(ترجمہ:)''اے انس:!جب تو کسی کام کاارادہ کرے،تو اپنے رب سے اس میں سات بار رہنمائی کی دعا کرتا رہے،پھر غوروفکر کر کہ تیرے دل میں جو بات قرار پاگئی ہے(یعنی اس کام کا کرنا یا نہ کرنا)،بس خیر اسی میں ہے''،اوراگراس کے لئے نماز پڑھنا دشوار ہوتو صرف دعا کر کے استخارہ کر لے،(یہ''اذکار'' کی عبارت کا)خلاصہ ہے،اور''شرح الشرحۃ'' میں ہے کہ(ہم نے اپنے)مشائخ سے سنا ہے کہ مذکورہ دعا پڑھنے کے بعد باوضو ہو کر قبلہ روسو جائے،اگراپنی خواب میں سفید یا ہرا رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں خیر ہے،(اوراس کام کو کر لے)اوراگر کالا یا سرخ رنگ دیکھے

تو سمجھ لے کہ اس میں شر ہے،پھر اس کام سے اجتناب کرے،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد نمبر 2 صفحات 409 - 410 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حدیث پاک میں خواب میں کسی چیز کے نظر آنے یا نہ آنے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی خواب کا آنا ضروری ہے، یہ بزرگوں اور اہل خیر کے اپنے اپنے تجربات ہیں،لیکن اگر خواب نظر آجائے تو اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔مگر اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جب دل کو کسی ایک جانب سکون وقرار نصیب ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے اس کام کو کرلے،اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا۔اور اگر خدانخواستہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی ناکامی کا سامان ہو تو یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھنے میں مجھ سے خطا ہوگئی ہے،اور یا یہ سمجھے کہ اگر اس کے برعکس کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ (خدانخواستہ) اس سے بڑی ناکامی یا نقصان کا سامنا کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیرلکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وھو شرلکم۔

ترجمہ:''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے حق میں ناپسندیدہ سمجھو، (مگر)وہ (درحقیقت)تمہارے حق میں بہتر ہو اور (یہ بھی)ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لئے پسندیدہ سمجھو(مگر درحقیقت)وہ تمہارے لئے بری ہو،(البقرۃ:216)''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک دعا کسی نازل شدہ مصیبت کے لئے بھی مفید ہے (کہ اگر وہ صبر وتحمل کا پیکر بن کر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس مشکل سے اسے نجات دے دے گا یا صبر وتحمل پر اسے اجر عظیم سے نوازے گا)، اور ان مصیبتوں کے لئے بھی

دعا مفید ہے، جو ابھی نازل نہیں ہوئی ہیں (یہ دعا ان کے لئے ردِ بلا کا سبب بن جائے گی)، سواے اللہ کے بندو! دعا کو اپنا لازمی شعار بناؤ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی، ص: 195)۔صرف نبی کا خواب یا الہام ،''حُجتِ قطعیہ'' ہوتا ہے۔اور غیر نبی کا خواب یا الہام ایک ظنّی امر ہے ،لہٰذا اگر کسی نے کسی مسئلے میں استخارہ کرلیا اور کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کیا تو اس سے گنہگار نہیں ہوگا، نہ ہی اس پر کوئی وبال آئے گا۔

''استخارہ'' کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگیِ دل ،حضوریٔ قلب ،تضرُّع و عاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہوسکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہوسکتی۔حدیث میں ہے: رب ذوالجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت ومحبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں، (الاسرار الرفوعہ، رقم الحدیث: 249، کشف الخفاء ج1 ص: 232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج1 ص: 78)''۔

جو شخص اپنے درپیش مسئلے میں پانچ سات بار عاجزی سے اپنے رب کے حضور التجا اور طلبِ خیر و دعا کے لئے ذہنی ،فکری اور عملی طور پر آمادہ نہ ہو، وہ استخارے کی روح اور حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔باقی وہ لوگ جو استخارے کے نام پر ماضی کے احوال بتاتے ہیں کہ کسی پر کالا جادو ہوگیا ہے، سفلی عمل کردیا گیا ہے، چند سیکنڈ میں یہ تمام غیبی امور ان پر منکشف ہوجاتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ان کا حل بھی نکل آتا ہے، اس کا مجھے علم نہیں ہے، اس سے لوگ توہُّم پرستی اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں، تقدیر الٰہی پر رضا جو مومن کا شعار ہونا چاہئے، اُس میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔پھر لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں، جب انہیں کوئی فیصلہ کن راہ

سجھائی نہ دے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے براہِ راست رجوع کرنے اور اس کے حبیب

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توسّل کے بجائے، اِس روش کو ترک کر کے، اِس طرح کے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔استخارہ تو مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنے کا نام ہے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ درپیش معاملات اور مباح امور میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لئے یا کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں استخارہ کرنا افضل اور مستحب ہے، لیکن یہ واجب نہیں ہے کہ نہ کرنے پر گنہگار ہوگا۔اور ویسے کسی مسئلے کے بارے میں دستیاب معلومات اور قرائن وشواہد کی روشنی میں یا اہل فن واہل نظر اور اہل اللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ذہن میں یہ امر واضح ہو جائے کہ یہ کام کر لینا چاہئے تو اللہ پر توکل کر کے کرلے، اور اللہ تعالیٰ سے اس میں کامیابی اور سرخ روہونے کی دعا کرتا رہے۔

قیامِ تعظیمی کا شرعی حکم

سوال: 180

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی محفل میں اگر کوئی بڑی عمر کا فرد یا بزرگ آجائے تو اپنی جگہ سے تعظیم کے طور پر اٹھنا نہیں چاہئے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنی مجلس میں تشریف لاتے تھے اور محفل میں موجود لوگ (صحابہ) تعظیماً اٹھتے تھے تو نبی پاک ﷺ انہیں منع فرماتے تھے؟، (سید عابد علی، انچارج ڈی پی ڈپارٹمنٹ، روزنامہ ایکسپریس کراچی)

جواب:

اس موضوع پر گفتگو سے پہلے چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن سعد قال: سمعت أبا امامة قال: سمعت أبا سعيد الخدري رضي الله

عنه يقول : نزل أهل قريظة على حكم سعد بن معاذ، فأرسل النبي ﷺ الى سعد فأتى على حمار ، فلما دنا من المسجد قال للانصار : "قوموا الى سيّدكم ـ أو خيركم ـ فقال: "هؤلاء نزلوا على حكمك "ـ فقال : تقتل مقاتلتهم ، وتسبى ذراريهم ، قال: "قضيت بحكم الله ـ وربّما قال: بحكم المَلِكِ "ـ

ترجمہ:''حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں نے ابو امامہ سے سنا،وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ:حضرت سعد بن معاذ کے حکم پر بنی قریظہ قلعہ سے نیچے اتر آئے تھے، پس نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کو بلوایا، وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کے لئے دراز گوش (گدھے)پر سوار ہوکر آئے ،پس جب وہ مسجد کے قریب پہنچے تو آپ نے انصار سے فرمایا: اپنے سردار یا اپنے بہترین فرد کے لئے (احتراماً) کھڑے ہوجاؤ۔پھر آپ نے فرمایا:یہ لوگ تمہارے فیصلے پر قلعہ سے اتر آئے ہیں (اب ان کا فیصلہ کردو) ،انہوں نے کہا: ان کے جوافراد لڑنے کے قابل ہیں،وہ قتل کردیئے جائیں اوران کے اہل وعیال کوقیدی بنالیا جائے ۔آپ نے فرمایا: تم نے حکمِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور کبھی آپ یہ فرماتے کہ یہ ایک بادشاہ (یاسردار) کے فیصلے کے مطابق ہے،(صحیح بخاری رقم الحدیث:4122،صحیح مسلم،رقم الحدیث:4515)''۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن عائشة أم المؤمنين قالت: مارأيت احدا أشبه سمتاً و دلاً وهديا برسول الله في قيامها وقعودها من فاطمة بنت رسول الله ﷺ ـ قالت و كانت :اذا دخلت على النبي ﷺ قام اليها فقبّلها وأجلسها في مجلسه، و كان النبي

ﷺ اذا دخل علیها قامت من مجلسها فقبّله و أجلسته فی مجلسها(الحدیث)۔

ترجمہ: ''ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صاجزادی حضرت فاطمہ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ کی عاداتِ مبارکہ کے مشابہ نہیں دیکھا۔ جب حضرت فاطمہ نبی ﷺ کے پاس جاتیں،تو آپ ان کے لئے (ازراہِ شفقت) کھڑے ہوجاتے ،پھران کو بوسہ دیتے اورانہیں اپنی جگہ بٹھاتے ،اور جب نبی ﷺ حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ (احتراماً) اپنی نشست سے کھڑی ہوجاتیں ، پھرآپ کو بوسہ دیتیں اور آپ کو اپنی جگہ بٹھاتیں ، (سنن ترمذی،رقم الحدیث:3872،سنن ابو داؤد،رقم الحدیث : 5175)''،اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے(الادب المفرد،ص:204)۔

امام بخاری نے''قیام الرجل لاخیہ'' کاباب قائم کیا ہےاوراس کے تحت حضرت سعد والی حدیث کےعلاوہ مندرجہ ذیل حدیث بیان کی ہے:

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن کعب کی روایت سے غزوۂ تبوک میں کعب بن مالک کی توبہ کی قبولیت کی تفصیلی حدیث بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں:واذن رسول اللّٰہ ﷺ بتوبۃ اللہ علینا حین صلیٰ صلاۃ الفجر فتلقانی الناس فوجاً فوجاً یھنونی بالتوبۃ یقولون لتھنك توبۃ اللہ علیك حتی دخلت المسجد فاذا برسول اللہ ﷺ حولہ الناس فقام الیّ طلحۃ بن عبیداللہ یھرول حتی صافحنی وھنانی ۔

ترجمہ: ''اورجب رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی تو ہماری توبہ کی قبولیت کا

اعلان کیا،تو پھر صحابہ مجھے (قبولیت) توبہ پر فوج درفوج مبارک باد دینے لگے، وہ کہتے تھے اللہ کی بارگاہ میں تمہیں توبہ کی قبولیت مبارک ہو، یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہوا،تو (منظر کچھ یوں تھا کہ) رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے گرد صحابہؓ کرام موجود تھے، اِس موقع پر طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہوئے، دوڑ کر آئے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 4418، الادب المفرد ص: 243)"۔

امام بیہقی لکھتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ قال: کان رسول اللہ ﷺ فی المسجد یحدثنا فاذا قام قمنا قیاماً حتی نراہ وقد دخل بعض بیوت ازواجہ۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہم سے گفتگو فرما رہے تھے، پھر جب آپ کھڑے ہوئے تو ہم بھی (احتراماً) کھڑے ہوگئے، یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ آپ اپنی ایک زوجۂ مطہرہ کے گھر میں داخل ہوگئے، (المدخل الی السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم الحدیث: 717، مکتبہ دار الخلفاء، کویت)"۔

قیامِ تعظیمی کے بارے میں اور بھی روایات ہیں، ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تعظیماً واحتراماً بزرگوں اور بڑوں کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اور صحابۂ کرام سے خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے لئے قیامِ تعظیمی ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ خود حضرتِ سعد کے لئے احتراماً صحابۂ کرام کو کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ ہمارے ہاں قومی ترانے کے موقع پر سب کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ بھی احترام کی ایک صورت ہے اور مسلمہ بین الاقوامی اقدار میں سے ہے اور کسی مکتبۂ فکر کے کسی عالم نے اسے شرک وبدعت قرار

نہیں دیا۔قومی سیرت کانفرنس کے موقع پر جب صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم تشریف لاتے ہیں تو ہال میں موجود تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔حال ہی میں سعودی عرب کے نائب وزیرِ مذہبی امور کراچی کے ایک مقامی ہوٹل میں ایک دعوت میں تشریف لائے تو دیوبندی واہلحدیث مکاتبِ فکر کے تمام علماء نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور مصافحہ ومعانقہ کیا۔

بعض روایات میں قیامِ تعظیمی سے منع فرمایا گیا ہے،لیکن یہ ممانعت علی الاطلاق نہیں ہے،ان کا محمل اور مصداق جدا ہے۔ذیل میں ہم ان احادیث کو ذکر کر کے ان کے محامل بیان کریں گے۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:عن ابی امامة قال: خرج علینا رسول الله ﷺ متوکئاًعلیٰ عصیً، فقمنا الیه فقال: لاتقوموا کما تقوم الاعاجم یعظم بعضها بعضاً۔

ترجمہ:ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عصا پر ٹیک لگائے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے،ہم آپ کے لئے کھڑے ہو گئے،تو آپ نے فرمایا:عجمیوں کی طرح مت کھڑے ہو،جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے تعظیماً کھڑے ہوتے ہیں ،(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 5187)"۔

یہ حدیث اس درجے کی نہیں ہے،جو ہم نے قیامِ تعظیمی کے جائز ومستحب ہونے کے بارے میں ذکر کی ہیں،جن میں رسول اللہ ﷺ سے قیام کا حکم ثابت ہے،خود آپ کا بھی قیام فرمانا ثابت ہے اور حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابۂ کرام کا آپ کے لئے قیام ثابت ہے،جس میں آپ نے اس قیامِ تعظیمی پر کوئی نکیر نہیں فرمائی،نہ کسی ناگواری کا اظہار فرمایا۔قیامِ تعظیمی کی ممانعت کی یہ حدیث ضعیف ہے،اس کی سند

میں اضطراب ہے، اس کے راوی مجہول ہیں اور اس میں اُس قیام کی ممانعت ہے جو عجمیوں کی طرح ہو، جس میں ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا رہتا ہے اور باقی ہاتھ باندھے تعظیماً کھڑے رہتے ہیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں: عن جابر قال: اشتکی النبی ﷺ فصلینا وراءہ وھو قاعد وابو بکر یسمع الناس تکبیرہ، فالتفت الینا فرانا قیاماً فاشار الینا فصلینا بصلاتہ قعوداً فلما سلم قال ان کدتم لتفعلوا فعل فارس والروم یقومون علی ملوکھم وھو قعود ھم فلا تفعلوا۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ: نبی ﷺ بیمار ہوگئے، آپ نے بیٹھ کر ہمیں نماز پڑھائی، حضرت ابو بکر آپ کے مکبّر کے فرائض انجام دے رہے تھے (دورانِ نماز) آپ ہماری جانب متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ ہم سب (آپ کی اقتدا میں) کھڑے ہوکر پڑھ رہے ہیں، آپ نے ہمیں (بیٹھنے کا) اشارہ فرمایا، پھر ہم بیٹھ گئے، پھر ہم نے بیٹھ کر آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی، پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا: مجھے خدشہ ہے کہ تم اہلِ روم اور فارس کی طرح کام کرنے لگو گے کہ ان کے بادشاہ بیٹھے رہتے ہیں اور وہ ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں، پس تم ایسا نہ کرو، (الادب المفرد، ص: 144)''۔

ابتدا میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت تھی، یہ حدیث اسی سے متعلق ہے، بعد میں بلاعذر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت منسوخ ہوگئی۔

قرآن وسنت سے کسی حکم کے اثبات کا عادلانہ طریقہ یہ ہے کہ اس حکم سے متعلق تمام آیات واحادیث کو پیشِ نظر رکھ کر نتیجہ اخذ کیا جائے، ایک ہی مسئلے کے بارے میں ثبوت وممانعت کے احکام میں اگر ممکن ہے تو تطبیق کی جائے، مواضع ثبوت کو الگ

واضح کیا جائے اور مواضع منع کو الگ واضح کیا جائے، دونوں کی توجیہ اور محمل بیان کیا جائے یا اگر ایک منسوخ ہے اور دوسرا ناسخ تو دلائل سے واضح کیا جائے۔

ہماری رائے میں قیامِ تعظیمی کے جواز واستحباب اور ممانعت کی حدیثوں کو ہم یکجا کر کے دیکھتے ہیں تو مندرجہ ذیل قیامِ تعظیمی کی صورتیں جائز ہیں:

(1) مشائخ، اساتذہ، علمائے دین، والدین اور محسن ومربی کی تعظیم کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(2) کوئی شخص فی نفسہ تو قیامِ تعظیمی کے لائق نہیں ہے، لیکن کسی دینی مصلحت کے تحت بطور مدارات اس کے لئے قیام کرنا جائز ہے۔

(3) محض دنیوی مفاد کی خاطر بطور مداہنت وخوشامد کسی شخص کے لئے قیام تعظیمی مکروہ تحریمی ہے۔

(4) جو شخص سفر سے واپس آئے، اس کے استقبال کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(5) کسی شخص کو کوئی نعمت ملی ہو اس کو مبارک باد دینے کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(6) کسی شخص کو کوئی مصیبت پہنچی ہو تو اس کی تعزیت کے لئے قیام کرنا بھی مستحب ہے۔

(7) عہدِ رسالت کے عجمیوں کے طریق پر قیام کہ ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا ہو اور دوسرے مستقل ہاتھ باندھے کھڑے ہوں، ایسا قیام مکروہِ تحریمی ہے، کیونکہ یہ اکرامِ انسانیت کے منافی ہے۔

(8) جو شخص بطورِ تکبر اپنے لئے قیام کرائے یا اس کے تکبر میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے قیام کرنا مکروہ ہے۔

(9) اگر کوئی مجلسِ ذکر یا درس وتدریس جاری ہو تو کسی آنے والے بزرگ کے لئے

اسے معطل نہیں کرنا چاہئے اور ایسے موقع پر قیام فی نفسہ اپنے جواز کے باوجود مناسب نہیں ہے۔

ان میں سے بعض اقسام کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے قاضی ابوالولید ابن الرشد مالکی کے حوالے سے بیان کیا ہے اور بعض اقسام کو علامہ بدرالدین عینی حنفی نے بیان کیا ہے اور ان تمام صورتوں کو علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد: خامس میں یکجا کیا ہے،فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نیاز کا مفہوم اور جواز

سوال: 181

نیاز کا مطلب اور مفہوم سمجھائیں اور کیا نیاز کا کرنا جائز ہے؟،(کامران، کراچی)۔

جواب:

سب سے پہلے معروف اردو لغات کے حوالے سے لفظ نیاز کے معنی ملاحظہ کیجئے:

نیاز: تبرُّک، تحفۂ درویشاں، نذر بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فیروز اللغات) آرزو، غنا، میل، خواہش، اظہارِ محبت، عاجزی، مسکینی، انکسار، تحفۂ درویش، تبرُّک، درود فاتحہ، بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فرہنگ آصفیہ جلد 4)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لغت میں نیاز کے متعدد معانی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ: ''بھینٹ چڑھاوا'' (یعنی وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کے تقرُّب، رضا اور بندگی کے علاوہ کسی اور کے تقرُّب کے لئے کیا جائے، خواہ مالی صدقہ ہو یا قربانی) اس معنی میں اس کا استعمال غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے، ہمارے ہاں عرف میں ''نیاز'' جن معانی میں استعمال ہوتا ہے، وہ یہ ہیں: تبرُّک، درود فاتحہ وغیرہ مثلاً کہا جاتا ہے کہ: ''یہ گیارہویں شریف کی نیاز ہے''، یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے

ایصالِ ثواب اور فاتحہ کا کھانا ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے تبرُّک بھی کہہ دیتے ہیں، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، علم معانی کا مُسلّمہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ''ذومعنی'' کلمہ ہے، تو اس کے معنی کا تعین قائل کے اعتبار سے ہوتا ہے، مثلاً کافر کہے کہ: ''انبت الربیع البقل ''موسم بہار نے سبزہ اگایا، یہ کلمہ اگر کافر کہے تو کلمۂ کفریہ ہوگا، اور اگر یہی کلمہ مومن کہے تو کلمۂ توحید ہوگا، کیونکہ مومن کا ایمان اس امر کی دلیل ہے کہ وہ حقیقت میں اگانے والا اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو مانتا ہے،

بارش اور بہار کو سبب مانتا ہے، اس کو اسناد مجازی کہتے ہیں، جو روزمرہ گفتگو میں ہم استعمال کرتے رہتے ہیں، مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے فلاں دوا سے شفا ملی، حالانکہ اس کا ایمان ہے کہ دوا وسیلۂ شفا ہے، اصل شفا دینے والا اللہ ہے۔

رجب کے کونڈے اور ''تبارک'' کی روٹیاں

سوال: 182

(1) ہمارے ہاں بعض لوگ رجب کی بائیس تاریخ کو ''کونڈے'' (جو ایک خاص قسم کی سوجی، میدے اور دودھ کی میٹھی ٹکیہ ہوتی ہے) پکاتے ہیں، یہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے نام پر نیاز ہوتی ہے، ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ رات کو پکائے جاتے تھے اور ایک خاص جگہ بٹھا کر کھلائے جاتے تھے، انہیں باہر نہیں نکالا جاتا تھا، بعض جگہ اس موقع پر ''عجیب داستان'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی پڑھا جاتا تھا، جس میں لکڑہارے کی منظوم داستان ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ بعض لوگ اسے ناجائز اور حرام کہتے ہیں۔

(2) رجب ہی کے مہینے میں بعض لوگ میٹھی روٹیاں پکا کر بانٹتے ہیں، انہیں ''تبارک'' کی روٹیاں کہا جاتا ہے، غالبًا ان پر سورۂ ''تبارک الذی'' (سورۃ الملک) پڑھ کر

ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟،(محمد شمیم خاں،عزیز آباد،کراچی)۔

جواب:

22 رجب نہ امام جعفر صادق کی تاریخ پیدائش ہے اور نہ تاریخ وصال،ان کی ولادت کے بارے میں دو اقوال ہیں:(1)مشہور قول یہ ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت 17 ربیع الاوّل 80ھ (2)ماہِ رجب،لیکن تاریخ مذکور نہیں ہے۔اسی طرح وصال کے بارے میں بھی دو قول ہیں:زیادہ معروف ماہِ شوال 148ھ ہے اور ایک قول رجب کا بھی ہے،(جلاء العیون،ملا باقر مجلسی،ج:2،ص:693)۔لہٰذا 22 رجب کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کوئی خاص نسبت نہیں ہے،البتہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وصال 22 رجب 60ھ ہے۔جہاں تک ایصالِ ثواب کا تعلق ہے،یہ فی نفسہٖ مشروع ہے،مستحسن امر ہے،قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور ایصالِ ثواب کے لئے خاص قسم کی ٹکیاں یا روٹیاں پکانا لازمی نہیں ہے، میٹھی ٹکیاں یا روٹیاں بھی ایصالِ ثواب کی نیت سے بانٹی جاسکتی ہیں یا فقراء کو کھلائی جاسکتی ہیں اور کوئی دوسری صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے،البتہ یہ شرط،کہ خاص جگہ پر ہی بٹھا کر کھلایا جائے،فاسد ہے۔''عجیب داستان'' کے نام سے جو کتاب پڑھی جاتی ہے،اس کی بھی کوئی اصل نہیں ہے،ہاں،اگر کوئی چیز اپنی اصل کے اعتبار سے خلافِ شرع ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ختم کردیا،حدیث پاک میں ہے:عن انس قدم النبی ﷺ المدینة ولھم یومان یلعبون فیھما، فقال ماھذا ن الیومان؟، قالوا کنا نلعب فیھما فی الجاھلیة، فقال رسول اللہ ﷺ قد ابدلکم اللّٰہ بھما خیرا منھما یوم الاضحی ویوم الفطر۔

ترجمہ: ''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو (آپ نے دیکھا کہ) اہلِ مدینہ سال میں دو دن کھیل تماشے کیا کرتے تھے، آپ نے ان سے پوچھا: یہ کیسے دو دن ہیں؟، انہوں نے جواباً عرض کیا: ہم زمانہ جاہلیت میں ان دنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان دو دنوں کے بدلے میں تمہیں دو بہتر دن عطا فرمائے ہیں، اور وہ ہیں، عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن، (مشکوٰۃ بحوالہ: سنن ابی داؤد)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سالانہ میلے ٹھیلے کے دو دنوں کو منع فرمادیا اور فرمایا کہ ان کے عوض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عیدین کے مبارک دن عطا فرمائے ہیں۔

اس کے برعکس ایک حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما انّ رسول اللّٰہ قدِمَ المدینۃ، فوجد الیھودَ صیاماً یومَ عاشوراء، فقال لھم رسول اللّٰہ ﷺ: ماھذا الیوم الذی تصومونہٗ؟، فقالوا: ھذا یومٌ عظیمٌ انجی اللّٰہ موسیٰ وقومَہٗ وغرّق فرعونَ وقومَہٗ، فصامَہٗ موسیٰ شکراً، فنحن نَصُومہٗ فقال رسول اللّٰہ ﷺ: فنحن اَحقُّ و اَولیٰ بموسیٰ منکم، فصامہٗ رسولُ اللّٰہ ﷺ وامَرَ بصیامہٖ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟، تو انہوں نے جواب دیا: یہ وہ عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم (بنی اسرائیل) کو (فرعونیوں سے) نجات دی، اور فرعون اور اس کی قوم کو (سمندر میں) غرق کردیا، تو انہوں نے (اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے) شکر کے

طور پر عاشورہ کا روزہ رکھا،تو (ان کی اتباع میں) ہم بھی (اس دن کا) روزہ رکھتے ہیں،تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم تمہارے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام (کی سنت کی اتباع) کے زیادہ حق دار ہیں اور ہم تمہاری بہ نسبت ان سے زیادہ قربت رکھتے ہیں،تو رسول اللہ ﷺ نے خود بھی یومِ عاشورہ کا روزہ رکھا اور صحابۂ کرام کو بھی اس کا حکم فرمایا، (صحیحین بحوالہ:مشکوٰۃ) ۔ایک اور حدیث مبارک ہے:

عن ابن عباس قال حین صام رسولُ اللّٰہ ﷺ عاشوراءَ وَاَمَرَ بصیامہٖ قالوا یارسول اللّٰہ: اِنَّہٗ یومٌ یُعَظِّمُہٗ الیھودُ والنصاریٰ فقال رسول اللّٰہ ﷺ لَئِن بَقِیْتُ اِلٰی قابلٍ لَاَصُومَنَّ التاسعَ ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس ہی سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور اسے رکھنے کا حکم دیا تو (صحابۂ کرام نے) عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم: یہ ایک ایسا دن ہے جس کی یہود و نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں،تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال حیات رہا تو ضرور (یومِ عاشورہ کے ساتھ) 9 محرم کو بھی روزہ رکھوں گا، (صحیح مسلم)۔اس کی رو سے علماء فرماتے ہیں کہ دو دن کا نفلی روزہ رکھنا افضل ہے یعنی 9، 10 محرم الحرام یا 10، 11 محرم الحرام۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ فی نفسہٖ شرعاً یومِ عاشورہ کی تقدیس ثابت ہے اور نفلی روزہ بھی اپنی اصل کے اعتبار سے مستحسن ہے،اس لئے آپ نے اسے برقرار رکھا اور محض یہود و نصاریٰ سے مشابہت کی بنا پر اصلاً مشروع امر کو منع نہیں فرمایا، بلکہ ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے عاشورہ کے ساتھ ساتھ 9 محرم کے روزے کو بھی شامل فرمالیا۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''رجب میں حضرت امام جعفر صادق کو

ایصالِ ثواب کے لئے پوریوں کے کونڈے بھرے جاتے ہیں، یہ جائز ہیں، اس میں جگہ کی پابندی اور نیاز کو تقسیم نہ کرنے کی پابندی بے جا ہے۔ اس موقع پر ایک کتاب "عجیب داستان" کے نام سے پڑھی جاتی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ نہ پڑھی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کرنا جائز ہے" ، (بہارِ شریعت ، حصہ شانزدہم ، ص: 230، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی)۔

مولانا مفتی محمد خلیل خان برکاتی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"ماہِ رجب میں امام جعفر صادق کو ایصالِ ثواب کے لئے کھیر پوری پکا کر کونڈے بھرے جاتے ہیں اور فاتحہ دلا کر لوگوں کو کھلاتے ہیں، یہ جائز ہے۔ اس میں ایک بات بڑی غلط رواج پا گئی ہے کہ جہاں کونڈے بھرے جاتے ہیں، وہیں کھائے جاتے ہیں، یہ ایک غلط حرکت ہے اور یہ غیر شرعی اور جاہلانہ رسم ہے۔ اور یہ ایک کتاب "عجیب داستان" پڑھی جاتی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ نہ پڑھی اور نہ ہی سنی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کریں۔ اللہ کے نیک بندوں کی کرامات برحق ہیں، (سنی بہشتی زیور، حصہ سوم، ص: 318)"۔

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے کونڈوں کی شرعی حیثیت کے حوالے سے سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا: "اہلسنت کے نزدیک جیسے ہر فاتحہ جائز ہے، اسی طرح کونڈوں کی فاتحہ بھی جائز ہے، لکڑہارے کی کہانی من گھڑت ہے۔ کھانے کی ہر چیز کے متعلق ادب سکھایا گیا ہے۔ حدیث میں فرمایا: "دستر خوان پر جو گر جائے اسے اٹھا کر کھالو"۔ فاتحہ کے کھانے پر قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لئے مسلمان اس کا زیادہ ادب کرتے ہیں، اسی وجہ سے لوگوں نے یہ شرط لگالی کہ وہیں بیٹھ کر کھالیں، باہر نہ لے جائیں اس شرط کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں، وہاں بھی کھاسکتے ہیں اور باہر بھی

لے جا سکتے ہیں، (وقار الفتاویٰ، جلد: اوّل، ص: 202، بزم وقار الدین، کراچی)''۔

جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا، 22 رجب المرجب 60ھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات ہے، (دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ کے معاندین اور ان سے بغض رکھنے والوں نے ان کی وفات پر (معاذ اللہ) خوشی منانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا اور چونکہ وہ بنی امیہ کے اقتدار کا دور تھا، اس لئے اسے پوشیدہ رکھنے کے لئے گھر کے کسی خاص گوشے میں کھلایا جاتا تھا، لیکن ہمیں اس کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملا۔ اسی طرح ''تبارک الذی'' یعنی سورۃ الملک میٹھی روٹیوں پر پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا شرعاً درست ہے، بشرطیکہ اپنی طرف سے کوئی خلافِ شرع امر اس میں شامل نہ کر دیا گیا ہو، کیونکہ ایصالِ ثواب فی نفسہٖ ایک مشروع اور مستحسن امر ہے، خواہ کسی خاص بزرگ کو ایصالِ ثواب کیا جائے یا تمام مومنین و مومنات کی ارواح کو، بہر صورت درست ہے۔

قیامت کے دن اعمال کا وزن کس طرح ہوگا

سوال: 183

قرآن مجید میں قیامت کے دن حساب و کتاب اور سوال و جواب کے موقع پر جزا و سزا کا فیصلہ کرنے انسان کے اعمال کے وزن کئے جانے کا ذکر ہے، سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مادّہ وزن رکھتا ہے، وزن مادّی اشیاء اور جسمانی اشیاء کا ہوتا ہے، اعمال تو غیر مادی ہیں، اگر ان کا وزن ہونا ہے تو کس طرح ہوگا، اور اگر نہیں ہوتا تو پھر قرآنی آیات و احادیث کا کیا جواب اور کیا توجیہ ہوسکتی ہے، جو نقل و روایت کے بھی مطابق ہو اور عقل سلیم کے لئے بھی قابل قبول ہو، (حارث محبوب، بگرام)۔

جواب :

یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ اسی بات کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ۔

(1) ترجمہ: ''اور آج (قیامت) کے دن (اعمال کا) وزن برحق ہے، سو جس کے (نیکیوں کا) پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہوں گے o اور جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنے والے ہیں، اس سبب کہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے۔(الاعراف:9-8)''۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔

(2) ترجمہ: ''(اے رسول!) کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتا دوں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہیں گے o یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں رائیگاں گئی، حالانکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں o یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے روبرو (جوابدہی کے لئے) پیش ہونے کا انکار کیا تو ان کے سب اعمال اکارت گئے ،پس ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے ، (الکھف:105-103)''۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِن كَانَ مِثْقَالَ

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَ كَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ۔

(3)ترجمہ: ''اورہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو رکھیں گے ،تو کسی شخص پر ظلم مطلقاً نہیں ہوگا،اوراگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوا تو ہم اس کو (حساب کے لئے) لے آئیں گے،اورہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں، (الانبیاء: 47)''۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔

(4)ترجمہ: ''تو جس کی نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے،وہ پسندیدہ زندگی میں رہیں گے o اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانا ''ھاویہ'' ہو گا،(القارعہ:6-9)''۔

چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

سمعت عبداللّٰہ بن عمرو ان العاص یقول: قال رسول اللہ ﷺ: ((ان اللہ سیخلص رجلا من امّتی علی رء وس الخلائق یوم القیامۃ فینشر علیه تسعة وتسعین سجلا کل سجل مثل مدالبصر، ثم یقول: اتنکر من ھذا شیئا؟ اظلمك کتبتی الحافظون؟فیقول: لا یارب فیقول: افلك عذر؟فیقول: لا یارب فیقول: بلیٰ ان لك عندنا حسنة فانه لاظلم علیك الیوم، فتخرج بطاقة فیھا اشھد ان لا الٰه الا اللّٰہ واشھد ان محمدا عبده ورسوله فیقول: احضر وزنك، فیقول: یاربّ ماھذه البطاقة مع ھذه السجلات؟ فقال: انك لا تظلم،قال: فتوضع السجلات فی کفّة والبطاقة فی کفّة فطاشت السجلات وثقلت البطاقة فلایثقل مع اسم اللّٰہ شئی))۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت سے ایک شخص کو قیامت کے دن برسرِ عام پیش فرمائے گا، اس کے (اعمال کے) 99 رجسٹر اس کے سامنے پھیلا دیئے جائیں گے، ان میں سے ہر رجسٹر حدِ نظر تک (پھیلا ہوا) ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم ان (اعمال) میں سے کسی بات کا انکار کرتے ہو؟، کیا اعمال لکھنے والے میرے محافظ فرشتوں نے تم پر ظلم کیا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا، اے پروردگار! کوئی ظلم نہیں کیا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہارے پاس کوئی عذر ہے؟، وہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! کوئی عذر نہیں، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: کیوں نہیں، ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی (کی امانت) ہے، کیوں کہ تم پر آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، پھر ایک چٹ (Slip) نکالی جائے گی، اس میں (کلمۂ شہادت کے یہ الفاظ لکھے ہوں گے) اشھد ان لاالٰہ الااللہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: اپنے (اعمال کے) وزن کو دیکھو، وہ عرض کرے گا: اے پروردگار! کہاں اتنے (بڑے سائز کے 99) رجسٹر اور کہاں یہ ایک پرچی (Slip)، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: (ترازو کے) ایک پلڑے میں (وہ سب) رجسٹر رکھے جائیں گے اور ایک پلڑے میں (کلمۂ شہادت کی) پرچی، (سارے کے سارے) رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے اور یہ ایک پرچی بھاری ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ کے نام سے زیادہ وزنی تو کوئی چیز نہیں ہوسکتی، (سنن الترمذی، ج:3، رقم الحدیث:2639)''۔

(2) ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، تمام

آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے، اور ان کے درمیان ہے، اور ان کے نیچے ہے، اگر تم ان کو لے کر آؤ اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور کلمۂ شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھ دو، تو وہ پہلے پلڑے سے بھاری ہو گا، (المعجم الکبیر، ج: 12، ص: 254، رقم الحدیث: 13024، دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

ان آیات واحادیث مبارکہ اور دیگر متعدد روایات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے اچھے اور برے اعمال کا وزن ہوگا، اللہ تعالٰی کے نیک بندوں کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا اور بدکار بندوں کے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہوگا۔

اللہ تعالٰی کا یہ ارشاد آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ: آج (قیامت) کے دن (اعمال کا) وزن (کیا جانا) حق ہے، (الاعراف:9)"۔

اب رہا یہ سوال کہ اعمال کا وزن کیسے ہوگا، وزن تو ان چیزوں کا ہوتا ہے جو مادّی وجود رکھتی ہیں، جسم رکھتی ہیں، اعمال تو اعراض ہیں (عرض اسے کہتے ہیں، جس کا اپنا مستقل بالذات وجود نہ ہو، جس کا وجود کسی دوسرے کے ساتھ قائم ہو)، یہ اپنا جسمانی وجود نہیں رکھتے تو ان کا وزن کس طرح ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں چند گذارشات پیش خدمت ہیں:

(1) جب اللہ جل شانہ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا تو اس پر ہمارا ایمان کامل ہونا چاہئے، اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری فہم ودانش کی سعادت ہے اور اگر اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل کی نارسائی ہے، اللہ تعالٰی کا ارشاد حق اور سچ ہے۔

بہت سی مادّی اشیا ایسی ہیں، جن کے ماپنے کے آلات یا علم انسان کے پاس نہیں تھا

مگر سائنسی علوم کی ترقی کے ساتھ انسان ان کی پیائش یا طاقت کا معیار و مقدار مقرر کرنے پر قادر ہو گیا اور اس نے ان کے لئے پیائش Measurement، وزن (Weighing) یا قوت (Power)، دباو (pressure) یا دھکیلنے کی صلاحیت (Thrust) کا اندازہ کرنے کے لئے آلات اور پیانے وضع کر لئے۔

مثلاً ہوا کے دباؤ (Pressure) ماپنے کے آلے کو (Barometer) کہتے ہیں ، زلزلے سے زمین میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے ،اس کے لئے ریکٹر اسکیل (Rector Scale) ایجاد ہوا ، اس کی پیائش کے آلے اور ایٹم بم کے اندر جو دھماکے کی قوت ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے (Seismo meter) ایجاد ہوا، برقی رو (Current) کی مقدار اور طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے مخصوص اکائی (volt) اور کلوواٹ (Kilowatt) اور میگاواٹ (Megawatt) کے پیانے ایجاد ہوئے ۔ روشنی کی استعداد کا اندازہ لگانے کا آلہ Light meter یا Exposure meter, اسی طرح پانی کے دباؤ کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Telemeter)

آلات اور پیانے ایجاد ہوئے ،اسی طاقت سے ڈیموں اور آبشاروں (Water sheds) سے جو بجلی پیدا کی جاتی ہے ،اسے Hydroelectric Power کہتے ہیں ۔مائع کی کثافت (Density) یا ثقل (Gravity) کا اندازہ لگانے کے لئے Hydrometre ایجاد ہوا ۔ اعصاب یا پٹھوں (Muscle) کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Ergometer) ایجاد ہوا۔

الغرض بہت سے ایسی مادّی اشیاء و موجودات تھیں ، جن کا یا تو انسان کو علم نہیں تھا ، اور اگر علم تھا تو ان کی پیائش ، مقدار ، اور قوت کا اندازہ لگانے کے لئے آلات ، پیانے اور

اوزان نہیں تھے ،انسان کے علم نے ترقی کی اوران اشیاء کے قطعی تخمینے لگانے کی استعداد حاصل کرلی۔

جب انسانی دماغ اتنی ترقی کرسکتا ہے تواس سے انسانی دماغ کے پیدا کرنے والا خالق ومالک کے علم کی لامحدودیت اورمحیطِ کل ہونے کا آپ بخوبی اندازہ لگاسکتے ہیں،وہ معقولات (Abstracts)یعنی محض معنوی اشیاءاورمجردات یعنی غیر مادّی اشیاء (Immaterial) کووزن کرنے یاان کااندازہ لگانے کے لئے معیاریاپیمانہ مقرر فرمادے۔

(2)ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ان اعمال کوکوئی جسمانی صورت عطافرمادےاوران کاوزن ہو،اعمال خیر کوخوبصورت اجسام میں متشکل کردیا جائے اوراعمال شرکوقبیح اجسام کی صورت میں متشکل فرمادےاوران کاوزن کیاجائے۔

(3)بعض احادیث وروایات میں ہے کہ ان صحیفوں کاوزن ہوگا،جن میں اعمال لکھے ہوئے ہوں گے ،یعنی تحریری ریکارڈ کا وزن ہو گا،جسے حدیث مبارک میں ''سِجِلّ'' سےتعبیر فرمایا گیاہے،حالانکہ اس پربھی عقلی خدشہ وارد ہوسکتا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کے گناہوں کے رجسٹر بہت زیادہ ہوں تو وہ بھاری ثابت ہو جائیں،لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ ان کا وزن ضخامت کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ مندرجات (Written Material) کی کیفیت وماھیت کےاعتبار سے ہو۔

ایصالِ ثواب کاکھانااورصدقۂ جاریہ

ہمیں چند سوالات مختلف موضوعات پر عبدالکریم حاجی انور سالویز لمبے،ملاوی، ساؤتھ افریقہ کی جانب سے موصول ہوئے ہم انہیں قارئین کی سہولت کی خاطرترتیب وار بیان کرتے ہیں۔

سوال: 184

ہمارے ٹاؤن (افریقہ،ملاوی) کے عوام سال میں دو یا تین مرتبہ نیاز کا کھانا پکاتے ہیں،اس میں بہت سارے پیسے خرچ ہوتے ہیں،اور کھانے والے لوگ تقریباً پیسے والے ہوتے ہیں،نیاز کا کھانا کھانے کے صحیح حقدار کون ہیں،ہم مالدار لوگ کھا سکتے ہیں یا نہیں؟اور یہ پیسے مرحوم کے ثواب جاریہ کے لئے دوسرے دینی کاموں میں خرچ کرنا کیسا ہے؟بہتر اور افضل طریقہ ارشاد فرمائیں۔

جواب:

''ایصال ثواب'' کے معنی،کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا،خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو،یہ شرعاً جائز ہے بلکہ مستحسن امر ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِاَخِیۡ وَاَدۡخِلۡنَا فِیۡ رَحۡمَتِکَ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ۔

(1)ترجمہ:''حضرت موسیٰ نے التجا کی :اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے،(الاعراف:151)''۔

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ۔

(2)ترجمہ:''(حضرت ابراہیم نے دعا کی)اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری،میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا،(ابراہیم: 41)''۔

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ۔

(3)ترجمہ:''اے ہمارے رب:ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی

مغفرت)فرما، جوہم سے پہلے وفات پاچکے،(الحشر:10)"۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِناً وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔

(4)ترجمہ:"(حضرت نوح نے دعا کی)اے میرے رب! میری اورمیرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوااور(جملہ)ایمان والے مردوں اورعورتوں کی مغفرت فرما،(نوح:28)"۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں :ترجمہ:"حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پا گئیں اوروہ اپنی والدہ کی وفات کے وقت موجودنہیں تھے،انہوں نے عرض کیا:یارسول صلی اللہ علیک وسلم !میری والدہ کامیری عدم موجودگی میں انتقال ہوگیا،(اب)اگرمیں ان کی طرف سے کوئی صدقہ کروں،تو آیا انہیں فائدہ پہنچے گا؟،(رسول اللہ ﷺ نے)فرمایا:ہاں،(حضرت سعد نے)عرض کیا:میں آپ کوگواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والاباغ اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کردیا،(صحیح بخاری،ج:1،ص 186 مطبع اصح المطابع،کراچی)"۔

ایصالِ ثواب کاذریعہ دعاءِ مغفرت بھی ہے،مالی صدقات بھی ہیں اوردیگرعبادات بھی ہیں،مثلاً حج بدل وعمرہ،تلاوت،اذکار،درود پاک وغیرہ،اسی طرح کھانے کا وہ اہتمام ہے،جس کا اَعراس کے مواقع پراہتمام کیاجاتا ہے۔

سوم،چہلم یا اَعراس کے مواقع پراجتماعی قرآن خوانی کااہتمام ہوتا ہے،بعض مقامات پرمحافلِ وعظ ہوتی ہیں اورکھانے کا بھی اہتمام ہوتا ہے،بہ ظاہر کھانے کا یہ اہتمام نفلی صدقہ ہے،تبرُّع ہے،اورنفلی صدقہ کے طور پر جوکھانا تیار کیاجائے،اس کا کھانا اصولی طور پرامراءاورفقراءسب کے لئے جائز ہے۔

بزرگانِ دین کے ایصالِ ثواب کے لئے اَعراس کے مواقع پر جو کھانا تیار رہتا

ہے، اسے ان بزرگوں کی نسبت کی وجہ سے "متبرک" کہا جاتا ہے، یہ بھی نفلی صدقہ ہے اور امراء اور فقراء دونوں اسے کھاسکتے ہیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: "سوم کے چنوں، بتاشوں کا لینا کیسا ہے؟" آپ نے جواب دیا: "اور سوم کے چنے بتاشے بغرض مہمانی نہیں منگائے جاتے بلکہ ثواب پہنچانے کے قصد سے ہوتے ہیں، یہ اس حکم میں داخل نہیں، نہ میرے اس فتوے میں ان کی نسبت کچھ ذکر ہے، یہ الگ مالک نے محتاجوں کے دینے کے لئے منگائے اور یہی اس کی نیت ہے تو غنی کو ان کا لینا بھی ناجائز، اور اگر اس نے حاضرین کے لئے منگائے تو اگر غنی بھی لے لے گا تو گنہگار نہ ہوگا، اور یہاں بحکم عرف ورواج عام حکم یہی ہے کہ وہ خاص مساکین کے لئے نہیں ہوتے تو غنی کا بھی لینا ناجائز نہیں، اگرچہ احتراز زیادہ پسندیدہ ہے، اور اسی پر ہمیشہ سے اس فقیر کا عمل ہے"۔

اسی طرح ان سے پوچھا گیا: جو کھانا بہ نیتِ خاص برائے ایصالِ ثواب خواہ بزرگانِ دین سے ہوں یا عام مسلمان، پکوایا جائے تو اس کھانے کو اغنیا کھاسکتے ہیں؟۔ آپ نے جواب دیا: "اغنیا بھی کھاسکتے ہیں، سوائے اس کھانے کے جو موت میں بھی بطور دعوت کیا جائے، وہ ممنوع و بدعت ہے"۔

اسی طرح امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا:

جو طعام بہ نیتِ ایصالِ ثواب بروح بزرگان تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو اغنیا بھی کھاسکتے ہیں یا نہیں؟، عام اَمواتِ مومنین کے لئے جو کھانا وغیرہ دیا جاتا ہے، اس میں اور اس طعام میں جو انبیاء عظام اور اولیاء کرام کی ارواح کے لئے ہدیہ کیا جاتا ہے، کچھ ذاتی فرق ہے یا نہیں؟، برکت وعدم برکت کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں مصرف ایک

ہوگا، یعنی صرف فقراء کو دینا یا اغنیاء کے لئے بھی کھانا جائز ہوگا۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''طعام تین قسم ہے: ایک وہ کہ وہ عوام ایامِ موت میں بطورِ دعوت کرتے ہیں، یہ ناجائز وممنوع ہے، اغنیا کو اس کا کھانا جائز نہیں۔ دوسرے وہ طعام کہ اپنے اموات کو ایصالِ ثواب کے لئے بہ نیت تصدُّق کیا جاتا ہے، فقراء اس کے لئے اَحَقّ (زیادہ حق دار) ہیں، اغنیا کو نہ کھانا چاہئے۔ تیسرے وہ طعام کہ نذورِ ارواحِ طیبہ حضرات انبیاء واولیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء کیا جاتا ہے اور فقراء واغنیاء سب کو بطورِ تبرُّک دیا جاتا ہے، یہ سب کو بلا تکلف روا ہے اور وہ ضرور باعث برکت ہے، برکت والوں کی طرف جو چیز نسبت کی جاتی ہے، اس میں برکت آجاتی ہے، مسلمان اس کھانے کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ اس میں مُصیب ہیں''۔

اسی طرح آپ نے سوم کے چنوں کے بارے میں فرمایا: ''یہ چنے فقراء ہی کھائیں، غنی کو نہ چاہئے، بچہ یا بڑا، غنی بچوں کو ان کے والدین منع کریں''۔

گیارہویں شریف کے بارے میں سائل کے جواب میں آپ نے لکھا:

''گیارہویں شریف اپنے مرتبۂ فردیت میں مستحب ہے، اور مرتبۂ اِطلاق میں کہ ایصالِ ثواب ہے، سنت، اور سنت سے مراد سنتِ رسول اللہ ﷺ اور یہ سنتِ قولیہ مستحبہ ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج:9، صفحات: 605، 609، 610، 612، 614، 615، 672، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ: اپنی اصل کے اعتبار سے ایصالِ ثواب کی مشروعیت قرآن وسنت سے ثابت ہے، یہ سنت قولیہ مستحبہ ہے، بزرگانِ دین کے اَعراس کے مواقع پر قرآن خوانی، تلاوت، اذکار و درود شریف، مواعظِ حسنہ اور طعام کا انتظام، یہ

سب ایصالِ ثواب کی جائز صورتیں ہیں۔ عام مومنین ومومنات کے سوم، چہلم یا برسی کے موقع پر دیگر ایصالِ ثواب کی جائز صورتوں کے علاوہ طعام کا انتظام بھی اسی میں شامل ہے، اگر اس میں نذر، فدیہ اور کفارات مالی شامل نہ ہوں، تو یہ طعام (خواہ یہ ایصالِ ثواب بزرگانِ دین کے نام پر ہو یا عام مومنین ومومنات کے نام پر) نفلی صدقہ وخیرات ہے، جسے مالدار اور فقراء سب کے لئے کھانا جائز ہے۔ اگر نذر، فدیہ اور کفارۂ مالی کا کھانا ہو تو یہ صرف فقراء ومساکین اور مستحقین زکوٰۃ کے لئے جائز ہے، مالدار لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ بزرگانِ دین کے اعراس مبارکہ یا دیگر مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا ہے، وہ مالدار اور فقراء سب کے لئے جائز ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے تبرُّک بھی کہا جاتا ہے، یعنی اس میں نفلی ایصالِ ثواب کی نیت کے ساتھ ساتھ ان کی نسبت کی فضیلت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

عام مومنین ومومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے سوم کے موقع پر جو چنے تقسیم کئے جاتے ہیں، یا کھانا وغیرہ نفلی صدقہ کے طور پر تیار کیا جاتا ہے، اس کا کھانا امراء کے لئے جائز ہے، لیکن امام احمد رضا قادری نے اسے پسندیدہ امر قرار نہیں دیا، اس لئے اوپر ہم نے ان کے جو فتاویٰ نقل کئے ہیں، ان میں امراء کے لئے بعض مقامات پر جواز کا قول ہے اور بعض مقامات پر ناپسندیدگی کا، لیکن ناجائز ہونے کا قول نہیں کیا۔ لیکن ہمارے ہاں جو یہ رسم پڑگئی ہے کہ سوم، چہلم اور برسی کے موقع پر فوت شدہ مومنین ومومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے جو اجتماعی کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس میں لوگ اپنے احباب اور رشتہ داروں کو جمع کر لیتے ہیں، جو تقریباً سب کے سب غنی ہوتے ہیں اور فقراء کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، تو اس طریقہ کار کی تو بہر صورت حوصلہ شکنی ہونی چاہئے، جب کہ ولیمہ جو کہ خالص خوشی کی تقریب ہے، اس کے بارے

میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن ابی ہریرة قال قال رسول اللہ ﷺ شر الطعام طعام الولیمة یدعیٰ لها الاغنیاء ویترك الفقراء۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ولیمہ کا بدترین کھانا وہ ہے کہ: جس میں (صرف) مالداروں کو دعوت دی جائے اور فقراء اور ناداروں کو چھوڑ دیا جائے، (بخاری، ج: 3، رقم الحدیث: 5177 المکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

ولیمہ کے ایسے کھانے کے بارے میں، جس میں صرف مالدار لوگ شریک ہوں اور فقراء ونادار لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہو، رسول اللہ ﷺ نے وعید فرمائی اور اسے ''شَرُّ الطعام'' (بدترین کھانا) قرار دیا، تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے ایسے کھانے جن میں فقراء کو ترجیح دینی چاہیے یا صرف فقراء ہی کو کھلا دیئے جائیں تو افضل ہے، ان میں فقراء کو بالکل محروم کر دینا میرے نزدیک غیر مستحسن امر ہے اور مقاصدِ شرعیہ کے خلاف ہے۔

ایصالِ ثواب کی مندرجہ بالا صورتوں کے فی نفسہٖ جواز کے باوجود میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایصالِ ثواب میں بھی ''صدقاتِ جاریہ'' کو ترجیح دی جائے، یعنی مصارفِ

ایصالِ ثواب کی ایسی صورتیں اختیار کی جائیں، جن کا فیضان اور اجر وثواب تادیر جاری وساری رہے، اور جس کے ایصالِ ثواب کے لئے یہ برسی یا چہلم کے موقع پر یہ اہتمام کیا جا رہا ہے، اس کے خیر کے کھاتے کھلے رہیں اور اجر وثواب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کے اعمالِ خیر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین صورتوں کے (جن کا اجر وفیضان وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے)، یعنی صدقۂ جاریہ اور علم نافع (جس کا فیضان ان کے تلامذہ کے ذریعے بدستور جاری ہے)، اور نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1376، دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

''صدقاتِ جاریہ'' کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً (ا) مسجد کی تعمیر (ب) دینی مدارس کی تعمیر (ج) علماء وحفاظِ قرآن کی تعلیم وتربیت وکفالت (د) پانی کا کنواں کھود کر وقف کردیا (ہ) خیراتی ہسپتال بنانا، دعوتی وتبلیغی دینی لٹریچر وغیرہ۔ اپنے اموات کے ایصالِ ثواب کے لئے ''صدقاتِ جاریہ'' کو ترجیح دینی چاہئے۔ اور صدقۂ جاریہ کی ایک پسندیدہ صورت ضرورت مند لوگوں کے لئے پانی کا انتظام ہے، حدیث پاک میں ہے:

ترجمہ: ''حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اُمِّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پا گئی ہیں، تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لئے) کنواں کھدوا کر (وقف کردیا)، اور کہا: یہ اُمِّ سعد کا کنواں ہے، (سنن ابی داؤد، ج:1، ص:236)''۔

حدیث پاک سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ بندے کی طرف تصدق کی نسبت ایصالِ ثواب کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ تعبُّد وتقرُّب (یعنی بندگی اور قرابت) کی نیت سے، جیسے فیصل مسجد، شاہ جہاں مسجد وغیرہ، جب کوئی صدقہ بزرگانِ دین کی طرف

منسوب ہوتا ہے، تب بھی یہی مراد ہوتی ہے، جیسے گیارہویں شریف کا بکرا، یا میری قربانی، ان سب میں بندگی
اللہ تعالیٰ کی مقصود ہوتی ہے اور بندوں کی طرف نسبت کا مقصد ایصالِ ثواب ہوتا ہے۔

یومِ میلاد النبی ﷺ کی صحیح تاریخ کا تعین

سوال: 185

اللہ کے آخری نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟ کتبِ سیرت میں 12 ربیع الاول، 9 اور 8 ربیع الاول کی روایات موجود ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟، جبکہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے ربیع الاول مذکور کی تاریخوں میں دوشنبہ کا دن 9 ربیع الاول کو پڑتا ہے، ان وجوہات کی بنا پر تاریخ ولادت 20 اپریل 571ء تھی، (سیرت النبی، جلد اول، ص: 173 زاہد بشیر پرنٹر، لاہور)۔ مولانا الیاس کاندھلوی لکھتے ہیں: آپ ﷺ 8 ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (سیرت النبی، جلد 1 ص: 51)۔ قاضی سلمان منصور پوری رحمۃ اللعالمین میں لکھتے ہیں: آپ کی ولادت 9 ربیع الاول کو ہوئی۔
مصر کے عالم محمود پاشا فلکی نے ریاضی کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ آپ کی ولادت 9، ربیع الاول کو ہوئی۔ مفتی صاحب بعد کی دو کتابوں کے حوالے میرے پاس موجود نہیں، (محمد ذیشان اصغر، گوجرانوالہ)۔

جواب:

دین میں نقل و روایت اصل اور اساس ہے۔ عقلی استدلالات، سائنسی وفنی حسابات سے ہم استفادہ تو کر سکتے ہیں، لیکن اس کی بنیاد پر نقل و روایت کی ساری اساس کو رد نہیں کر سکتے۔ اسی روش کی بنا پر ماضی قریب اور عہدِ حاضر کے متجدّدین نے

، جو اہل مغرب سے ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں اور مستشرقین کے پروپیگنڈے سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں، معجزاتِ انبیاءِ کرام کا انکار کیا، واقعۂ اصحابِ فیل، معجزۂ شق القمر، معجزۂ معراج النبی ﷺ اور سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کی جو روایات امّت میں تعامل وتوارث کے ساتھ مسلّمہ چلی آرہی ہیں، ان کی عقلی تاویلیں شروع کر دیں۔ اسی طرح ختم المرسلین رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کا یومِ ولادت باسعادت پیر بارہ ربیع الاول کو ہونا، صدیوں سے امّت میں مسلّم ہے، اسے "تلقّی بالقبول" حاصل ہے اسی پر تعامل وتوارث چلا آرہا ہے، لہٰذا اس کے لئے از سرِ نو بحث وتمحیص کا سلسلہ شروع کرنا درست نہیں ہے۔ پھر یہ کوئی اعتقادی مسئلہ نہیں ہے کہ کسی نے اس معین دن کا انکار کر دیا تو شرعی قباحت لازم آئے گی یا اس کے برعکس اپنی تحقیق کی بنا پر کوئی رائے قائم کر دی تو اسکے محض اس رائے کے سبب فسادِ عقیدہ لازم آجائے گا۔ آپ ﷺ کے یومِ ولادت کا متبرّک ومقدس ہونا مسلّم ہونا چاہئے، تعیین پر اعتقاد ویقین ضروریاتِ شرعیہ میں سے نہیں ہے۔ جدید سائنسی وفنی علوم کی بنا پر رائے قائم کرنے والے خود بھی آپس میں متفق نہیں ہیں اور یہ حقیقت آپ کے سوال میں بھی عیاں ہے، لہٰذا ان میں سے کسی ایک پر انحصار کر کے ہم نقل وروایت اور تعامل وتوارث پر مبنی متفقہ رائے کو بدل بھی دیں، تو اختلاف کسی نہ کسی صورت میں قائم رہے گا۔ پس اصل مبحث یہ نہیں ہے کہ تاریخ کونسی تھی، اصل مرکزِ عقیدت یومِ میلاد النبی ﷺ کی تقدیس، تعظیم اور حرمت ہے اور اہلِ عقیدت ومحبت کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہمارے عہدِ حاضر کے علماء میں سے جسٹس علامہ پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف ضیاء النبی میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی، اہلِ ذوق اس کی جلد دوم، صفحات 33 تا 39 پر تفصیل سے

ملاحظہ فرمالیں ۔ ہمارے ایک دوسرے دینی اسکالر پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے بھی اپنی تصنیف میلاد النبی میں اس پر بحث کی ہے۔ہم ان دونوں اہلِ علم کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ چند دلائل کا ذکر کر رہے ہیں:

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فخرِ کائنات سرورِ دوعالم ﷺ کا یومِ میلاد دوشنبہ (پیر) کا دن تھا،اس پر بھی تمام علمائے امّت کا اتفاق ہے کہ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ تھا اور متقدمین و متاخرین کا اجماع اسی پر ہے کہ تاریخ ولادت 12 ربیع الاول عام الفیل ہے ۔بقول قاضی سلمان منصور پوری مصنف ''رحمۃ اللعالمین'' یہ 22اپریل 571عیسوی اور ہندی مہینوں کے حساب سے یکم جیٹھ 628 بکرمی بنتی ہے۔معروف سیرت نگار علامہ محمد رضا مصری مصنف ''محمد رسول اللہ ﷺ'' اور محمد صادق ابراہیم عرجون کی تحقیق کے مطابق سنِ عیسوی کے حساب سے 20اگست 570عیسوی بنتی ہے ۔علم الہیت کے ماہر محمود پاشا فلکی مصری اور بعض دیگر متاخرین کی تحقیق 9ربیع الاول کے حق میں بھی ہے،مگر عالمِ اسلام میں قدیم زمانے سے اجماع 12 ربیع الاول پر ہی چلا آرہا ہےاس لئے قولِ مختار کا درجہ اسی کو حاصل ہے۔اس حوالے سے ہم بعض آئمہ کی تحقیق بیان کرتے ہیں:

امام ابن اسحاق متوفی 151ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ مضت من شھر ربیع الاول ۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ بروز 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی،(الوفا ص:88)''۔

مشہور سیرت نگار علامہ ابن ہشام متوفی 213ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرۃ لیلۃ خلت من شھر ربیع الاول عام الفیل۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ پیر کے دن 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، (سیرت النبویہ، جلد 1، ص: 158، مطبوعہ: دار الجیل، بیروت)''۔

معروف مفسّر و مؤرّخ امام ابن جریر طبری متوفی 310 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ مضت من شھر ربیع الاول۔

ترجمہ: ''رسول کریم ﷺ کی ولادتِ مبارکہ بروز پیر 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، (تاریخ الامم والملوک المعروف تاریخ طبری، جلد 2، ص: 125)''۔

علامہ ابن خلدون متوفی 808 ہجری جو علمِ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کے موجد بھی ہیں، لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ خلت من ربیع الاول لاربعین سنۃ من ملك كسرىٰ نوشيروان۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت عام الفیل کو ماہِ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی، نوشیرواں کی حکمرانی کا چالیسواں سال تھا، (التاریخ ابن خلدون، جلد 2، ص: 710، مطبوعہ: بیروت)''۔

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی متوفی 429 ہجری، جو علمِ سیاست اسلامیہ کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' علمِ سیاست کے طلباء کے لئے بہترین ماخذ ہے، اعلام النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں: لانہ ولد بعد خمسین یوما من الفیل وبعد موت ابیہ فی یوم الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول۔

ترجمہ: ''واقعۂ اصحاب الفیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بروز پیر بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (اعلام النبوۃ، ص: 192)"۔

امام الحافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن یحییٰ بن سید الناس الشافعی الاندلسی متوفی 734 ہجری، لکھتے ہیں: ولد سیّدنا ونبیّنا محمد رسول الله ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل قیل بعد الفیل بخمسین یوماً۔

ترجمہ: "ہمارے آقا اور ہمارے نبی محمد ﷺ پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، بعض نے کہا ہے کہ واقعۂ فیل کے پچاس روز بعد حضور کی ولادت ہوئی، (عیون الاثر، جلد 1، ص: 26، مطبوعہ: دارالمعرفہ، بیروت)"۔

دورِ حاضر کے سیرت نگار محمد صادق ابراہیم عرجون، جو جامعہ ازہر مصر کے کلیہ "اصول الدین" کے مدیر رہے ہیں، اپنی تصنیف "محمد رسول اللہ" میں لکھتے ہیں: وقد صح من طرق کثیرة انّ محمدا علیه السلام ولد یوم الاثنین لاثنتی عشرة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل فی زمن کسریٰ نوشیروان ویقول اصحاب التوفیقات التّاریخیة انّ ذالک یوافق الیوم المکمل للعشرین من شهر اغسطس ۵۷۰ء م بعد میلاد المسیح علیه السلام۔

ترجمہ: "بکثرت طُرقِ روایت سے یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ بروز دوشنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول عام الفیل، کسریٰ نوشیرواں کے عہد حکومت میں تولد ہوئے، اور ایسے علماء، جو شمسی اور قمری تاریخوں کی آپس میں تطبیق کرتے ہیں، نے کہا ہے کہ اس دن شمسی تاریخ 20 اگست 570ء بنتی ہے، (محمد رسول اللہ، جلد 1، ص: 102، مطبوعہ: دارالقلم، دمشق)"۔

اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہری "ضیاء النبی ﷺ" میں لکھتے ہیں: ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں یہی تاریخ روایت کی ہے، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں: رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ عن عفّان عن سعید بن میناء عن جابرٍ وابن عباس انّھما قالا ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول وفیہ بُعثَ وفیہ عُرِجَ بہٖ الی السمآء وفیہ ھاجر وفیہ مات وھذا ھو المشھور عند الجمھور واللہ اعلم بالصواب ۔

ترجمہ: "حضرت جابر اور ابن عباس رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ عام الفیل روز دوشنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، اسی روز آپ ﷺ کی بعثت ہوئی، اسی روز آپ کو معراج عطا ہوئی، اسی روز آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی اور آپ ﷺ کے وصال مبارک کا دن بھی یہی ہے، جمہورِ امت کے نزدیک یہی تاریخ (بارہ ربیع الاول) مشہور ہے، واللہ اعلم بالصواب"۔

اس کے پہلے راوی ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں ان کے بارے میں ابو زرعہ رازی متوفی 264 ہجری کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظِ حدیث نہیں دیکھا ۔محدث ابن حبان فرماتے ہیں ابو بکر عظیم حافظِ حدیث تھے۔ دوسرے راوی عفان ہیں ان کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ عفان ایک بلند پایا امام، ثقہ اور صاحبِ ضبط واتقان ہیں ۔تیسرے راوی سعید بن میناء ہیں ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔
یہ صحیح الاسناد روایت دو جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: برصغیر پاک وہند کے بعض سیرت نگاروں نے محمود پاشا

فلکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بارہ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں تھا بلکہ پیر کا دن نو ربیع الاول کو بنتا ہے،لہٰذا نو تاریخ صحیح ہے،لیکن دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ان لوگوں کو محمود پاشا کے اصلی وطن کا بھی حتمی علم نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلمان منصور پوری نے محمود پاشا کو مصر کا باشندہ لکھا ہے، مفتی محمد شفیع صاحب انہیں مکّی لکھتے ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے انہیں قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجّم بتایا ہے۔مجھے بڑی کوشش کے باوجود محمود پاشا فلکی کی کتاب یا رسالہ نہیں مل سکا،البتہ معلوم ہوا کہ پاشا فلکی کا اصل مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا،جس کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے ''نتائج الافہام'' کے نام سے عربی میں کیا، اس کو مولوی سید محی الدین خان جج ہائی کورٹ حیدرآباد نے اردو کا جامہ پہنایا اور 1898ء میں نولکشور پریس نے شائع کیا لیکن اب یہ ترجمہ نہیں ملتا۔محمود پاشا فلکی نے اگر علم فلکیات کی مدد سے کچھ تحقیقات کی بھی ہیں تو صحابۂ کرام ،تابعین اور دیگر قُدَماء کی روایات کو جھٹلانے کے لئے ان پر انحصار کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ سائنسی علوم کی طرح فلکیات کی بھی کوئی بات قطعی نہیں ہوتی۔محمود پاشا سے قبل بھی کچھ لوگوں نے علمِ نجوم کے حسابات سے یومِ ولادت معلوم کرنے کی کوشش کی ، علامہ قسطلانی لکھتے ہیں: اہل زیچ (جنتریوں کا حساب نکالنے والے) کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا،اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی علوم نجوم اور ریاضی کے ذریعے حساب لگا کر تاریخ نکالے گا مختلف ہوگی۔پس ہمیں قدیم سیرت نگاروں مُحدِّثین، مفسّرین ،تابعین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی بات ماننا پڑے گی ، (ضیاء النبی ﷺ جلد دوم ،ص: 33 تا 39 ،مطبوعہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور ۔'')

محافلِ میلاد میں مخلوط اجتماعات

سوال : 186

میلاد شریف وگیارہویں ،مجالسِ وعظ وقرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کی ایسی محافل ، جہاں بے پردہ عورتیں اکثر حاضری دیتی ہیں،تو اس طرح کا نیاز پکانا، بہت سے پیسے خرچ کرنا ،مالداروں کو کھلانا اور بے پردہ عورتوں کا مردوں کے ساتھ جمع ہونے کے بارے میں ازروئے شرع کیا حکم ہے؟۔

جواب:

محافلِ ایصالِ ثواب ہوں، جیسے محافل میلاد شریف ،گیارہویں شریف کی محفل ،مجالس وعظ ،قرآن خوانی کی محافل ،اپنے اموات کی سوم، چہلم یا برسی کی محافل وغیرہ ، یا شادی کی محافل ودیگر سماجی تقریبات ،ان سب میں مرد وزن کا ایسا مخلوط اجتماع (Mixed ghathering) ،جن میں خواتین غیرمحرم مردوں کے ساتھ بے تکلف اور بے حجاب گھل مل جائیں،شریعت کی رو سے یہ جائز نہیں ہے،اور خاص طور پر وہ تقاریب یا اجتماعات جو نیک مقاصد کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں،ان

میں شریعت کی پاسداری کا زیادہ اہتمام ہونا چاہئے۔

کس دور میں کس چیز کا اجر زیادہ ہے،میری سمجھ کے مطابق یہ ہر جگہ اور مقام کے اعتبار سے لوگوں کی مقامی ضروریات پر منحصر ہے،کہیں پانی کی فراہمی اشد ضرورت ہے،تو اس کا اجر زیادہ ہوگا،کہیں مسجد یا دینی مدرسے کے قیام کی زیادہ ضرورت ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا،کہیں لوگ خوراک ولباس کے محتاج ہیں،تو اس کا اجر زیادہ ہوگا،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''وہ دشوار گزار گھاٹی میں کیوں نہ داخل ہوا، اور (اے انسان!) تجھے کیا خبر کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟، (لوگوں کی) گلوخلاصی کرانا، یا (شدید) بھوک کے دن کھانا کھلانا یا کسی ایسے یتیم کو جو (تمہارا) رشتے دار بھی ہے، یا کسی ایسے مسکین کو (جو تنگ دستی کے مارے) خاک میں رل رہا ہے، (البلد: 16-11)''۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کا زنا میں حصہ لکھ دیا ہے، وہ اسے بہر حال پائے گا، آنکھ کا زنا دیکھنا ہے، اور زبان کا زنا (فحش) گفتگو کرنا ہے، اور نفس (گناہ) کی تمنا کرتا ہے اور (مبتلائے) شہوت ہوتا ہے، اور شرم گاہ اس طرح سب کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (یعنی بالآخر ان مبادی واسباب اور محرکات زنا کے مراحل سے گذرنے کے بعد انسان شہوت نفس سے مغلوب ہو کر زنا کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرلیتا ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نفس پر قابو پا کر بچ جاتا ہے)، (صحیح البخاری: 4، رقم الحدیث: 6243، المکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

اس لئے احتیاط اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان زنا کے محرکات (Incentives) واسباب سے ہمیشہ بچ کر رہے تاکہ غلبۂ شہوت سے مغلوب ہو کر اس گناہ میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اور مردوں اور عورتوں کے مخلوط بے پردہ اجتماعات گناہ کے مبادیات ومحرکات ہی میں شمار کیے جائیں گے۔

تبرکات انبیاء کرام کا احترام

سوال: 187

ہمارے شہر میں بارہ ربیع الاول کے دن رسول پاک ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ ایک مسجد میں موئے مبارکہ کی زیارت کا اہتمام کیا جاتا ہے

،جس میں عورتیں بھی بغیر پردہ زیارت کے لئے مسجد آتی ہیں، دوران زیارت نماز کا وقت ہوجاتا ہے،تو نماز بجائے مسجد کے ملحقہ مدرسہ میں ادا کی جاتی ہے، یہ سب باتیں کہاں تک صحیح ہیں؟۔

جواب:

انبیاءکرام کے آثار اور تبرکات کا احترام قرآن وسنت سے ثابت ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔

ترجمہ:''اوران کے نبی نے ان سے کہا: بیشک ان کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا،جس میں تمہارے رب کی طرف سے (تمہارے دلوں کا) سکون ہے،اورآل موسیٰ اورآل ہارون کے باقی ماندہ (تبرکات) ہیں،اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے،بلاشبہ اس میں تمہارے لئے ضرور ایک نشانی ہے،اگرتم مومن ہو،(بقرہ:248)''۔

رہا یہ سوال کہ اس تابوت یا صندوق میں کیا تھا، جسے اللہ کے نبی نے حضرت طالوت کی سلطنت کی نشانی اوررب کی طرف سبب باعث تسکین قراردیا ہے،تو اس کے بارے میں کئی تفسیری اقوال ہیں،ان کے مطابق اس میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے عصا،الواحِ تورات کے ٹکڑے،ان کے کپڑے اوربعض روایات میں نعلین کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اذْهَبُواْ بِقَمِيصِي هَـٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيراً ـ

ترجمہ: ''(یعقوب علیہ السلام نے فرمایا) میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، (یوسف: 93)''۔

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات اور ان سے نسبت رکھنے والی اشیاء برکت و کامرانی کا باعث ہوتی ہیں۔

امام مسلم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

''حضرت اسماء بنت ابی بکر کے غلام عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھیجا اور کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے، انہوں نے ایک طیالسی کسروانی جبہ نکالا جس کی آستینوں اور گریبان پر ریشم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، حضرت اسماء نے کہا:

ھذه کانت عند عائشة رضی اللّٰہ عنھا حتی قبضت فلما قبضت قبضتھا و کان النبی ﷺ یلبسھا فنحن نغسلھا للمرضیٰ ونستشفی بھا ـ

یہ جبہ حضرت عائشہ کی وفات تک ان کے پاس تھا، اور جب ان کی وفات ہوئی تو پھر میں نے اس پر قبضہ کرلیا، نبی اکرم ﷺ اس جبہ کو پہنتے تھے، ہم اس جبہ کو دھو کر اس کا پانی بیماروں کو پلاتے تھے اور اس جبہ سے ان کے لئے شفا طلب کرتے تھے، (صحیح مسلم جلد: 2، ص: 190 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، 1375ھ)''۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ''خبیب بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں خبیب بن عدی کا ہونٹ کٹ کر لٹک گیا رسول اللہ ﷺ نے لعاب دہن لگا کر اس کو جوڑ دیا، (دلائل النبوت ج: 3، ص: 98-97، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ، بیروت)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن (ج:1،ص:929-928-930-،فرید بک اسٹال لاہور) میں تبرکات انبیاء کے موضوع پر باحوالہ مفصل ومدلل بحث کی ہے۔ اس وقت دنیا میں کئی مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے ''موئے مبارک'' کی موجودگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، ان کی زیارت بھی کرائی جاتی ہے، ہم اس مقدس نسبت کی تعظیم اور اکرام واحترام کرتے ہیں، لیکن ان دعووں کی تصویب وتوثیق کے ہمارے پاس کوئی قطعی شواہد نہیں ہیں،

اس لئے قطعیت کے ساتھ نہ ہم نسبت کی نفی کرسکتے ہیں، نہ اثبات، لیکن نسبت کا احترام ہمارا عقیدہ بھی ہے اور عقیدت بھی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بعض روایات کی رو سے انبیاء کرام علیہم السلام کی مجموعی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، لیکن ہر مسلمان کے لئے تعیین شخصی کے ساتھ

ان پچیس انبیاءِ کرام پر ایمان لانا فرضِ عین ہے کہ جن کے اسماءِ مبارکہ قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولقد ارسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقص عليك۔

ترجمہ: ''اور ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان کرفرمادیا اور ان میں سے بعض کا حال آپ پر بیان نہیں فرمایا، (المؤمن: 78)''۔

لہٰذا ان معین ومشخص انبیاءِ کرام کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دیگر انبیاءِ کرام پر اجمالی طور پر ایمان لانا فرض عین ہے، یعنی ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو بھی مختلف ادوار میں نبی یا رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ سب حق پر تھے اور ان میں سے کسی

کی بھی نبوت کا انکار کفر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ـ

ترجمہ: ''رسول (مکرم) ایمان لائے اس (کتاب) پر جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (تمام) مومن بھی (اس کتاب پر ایمان لائے)، سب سے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی (تمام) کتابوں پر اور اس کے (تمام) رسولوں پر، (وہ یہ کہتے ہیں کہ) ہم (ایمان لانے میں) اس کے (تمام) رسولوں کے درمیان کسی ایک کے بارے میں فرق نہیں کرتے، (کہ اس پر ایمان نہ لائیں)، (بقرہ: 285)''۔

لہٰذا موئے مبارک کی زیارت اور اس کا احترام و اکرام باعث سعادت ہے، لیکن اس کے لئے انتظامیہ کی طرف سے مسجد میں جماعت کو موقوف کر دینا یا مسجد سے متصل دوسری عمارت میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ''نماز با جماعت'' واجب ہے، مسجد میں جماعت مشروع ہے، جبکہ موئے مبارک کی زیارت ایک مستحب و مستحسن امر ہے، تو امرِ مستحب کی خاطر واجب کو ترک کرنا یا جماعت کو مسجد سے منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ موئے مبارک کی زیارت کا اہتمام مسجد کے متصل مدرسہ کی عمارت میں کیا جا سکتا ہے۔ اور نماز با جماعت کے وقت زیارت کو موقوف کر لینا چاہئے تا کہ لوگ با جماعت نماز پڑھیں، کیونکہ موئے مبارک کی زیارت کی مُحرِک عقیدت و محبت رسول ہے، اور اس عقیدت و محبت کا تقاضا ہے کہ نماز با جماعت کو ترجیح دی جائے، یا نماز کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں زیارت کا اہتمام کیا جائے، عورتوں کے لئے الگ اہتمام ہو اور ان پر لازم قرار دیا جائے کہ وہ باپردہ

اورحجاب شرعی کے اندر رہتے ہوئے زیارت کے لئے آئیں۔

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں

سوال: 188

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے؟۔

جواب:

عوام کا یہ کہنا کہ: ''ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے''؟۔یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ درست ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔

ترجمہ: ''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو،اور اللہ ہی بے نیاز (ہر احتیاج سے پاک) ہے، سب خوبیوں والا ہے، (فاطر: 15)''۔

اردو میں لفظ ''غریب'' مفلس و نادار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ کہ عربی میں اس کے معنی ہیں اجنبی اور مسافر۔اور مفلس، نادار اور محتاج کے معنی میں لفظ ''فقیر'' اور ''مسکین'' آتے ہیں۔اور اس میں کیا شک ہے کہ ہم سب اللہ کے محتاج ہیں، اور اگر کوئی دنیوی اعتبار سے غنی اور مال دار بھی ہے تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے، وہ چاہے تو نواز دے اور چاہے تو سب کچھ سلب فرما دے، بندے کی کیا مجال۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔

ترجمہ: ''(لوگو! آخر) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، حالانکہ آسمانوں اور زمینوں کا (حقیقی) وارث تو اللہ ہی ہے، (الحدید: 10)''۔

نمازِ تراویح کی امامت کا معیار

سوال: 189

ہمارے یہاں رمضان شریف میں اپنی سنی مسجدوں میں قرآن شریف کی تراویح ہوتی ہے، تراویح پڑھانے والے مدرسے کے طالب علم ہی ہوتے ہیں، جن کو قرآن صحیح یاد نہیں ہوتا اور تجوید بھی نہیں جانتے، سال میں اکثر اوقات نماز کی پابندی بھی نہیں کرتے، اور داڑھی بھی منڈھواتے ہیں، ان میں سے بعض کو تو نماز کے مسائل بھی نہیں آتے، ایسوں کو تراویح میں امام بنانا کیسا ہے؟ اور کیا ان کے پیچھے تراویح ہو جاتی ہے یا نہیں؟، کچھ لوگوں نے انتظامیہ مسجد سے بات کی، جواب میں کہا گیا کہ حافظوں کو پریکٹس کے لئے چانس دیتے ہیں تو ایسا سسٹم چلانے میں گنہگار کون ہے؟ اور یہ سب کام ہمارے یہاں ایک مفتی صاحب کی زیرِ نگرانی ہو رہا ہے، جو حکم شرع ہو بیان فرمائیں۔

جواب:

متشرع ودین دار حافظ وقاری وعالم امام کی موجودگی میں ایسے افراد کو نماز تراویح کا امام بنانا ہرگز درست نہیں ہے، جو کہ:

(ا) نابالغ ہوں (ب) تلاوت قرآن میں ایسی غلطیاں کرتے ہوں جو فساد نماز کا باعث بنتی ہیں (ج) داڑھی منڈھواتے ہیں یا کٹواتے ہیں اور حد شرعی سے کم ہوتی ہے (د) یا رمضان المبارک سے قبل محض قرآن سنانے کے لئے داڑھی رکھ لیتے ہیں اور رمضان کے بعد منڈوا دیتے ہیں یا حد شرعی سے کم کر دیتے ہیں، (کیوں کہ اس میں سنت رسول کا استخفاف ہے

جس کے لئے بڑی وعید ہے) (ہ) یا سال بھر نماز کے تارک رہتے ہیں۔ مفتی

صاحب کو انتظامیہ کمیٹی یا بااثر لوگوں کی رضامندی کی خاطر شرعی حدود وقیود کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔انہیں چاہئے کہ حفاظ کرام کو وہ اتباع شریعت کی تلقین کریں اور جب تک وہ

اتباع شریعت پر کاربند نہیں ہوتے،انہیں امام نہ بنائیں،بلکہ جماعت سے باہر ایک دوسرے کو قرآن کی منزل سنا کر اس کی حفاظت کریں۔

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کی اشاعت

سوال : 190

ہمارے یہاں مدرسے میں سال بھر کے بعد ایک سالانہ رپورٹ چھپواتے ہیں،جس میں کچھ اساتذہ اور طلبا کی تصاویر ہوتی ہیں،ایسی تصویریں جائز ہیں یا ناجائز؟۔

جواب:

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کا شائع کرنا درست نہیں ہے،اس سے اجتناب بہتر ہے،کیونکہ یہ ایسی ضروریات میں سے نہیں ہے،جن پر اس فقہی اصول کا اطلاق ہوتا ہے کہ:"الضرورۃ تبیح المحظورات" یعنی "ضرورتیں ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں"۔البتہ ہم دینی،دعوتی وتبلیغی مقاصد کے لئے (Movies/video)فلم کے جواز کے قائل ہیں،بشرطیکہ ان میں دیگر ممنوعات ومحارم شامل نہ ہوں،مثلاً بے پردہ بے حجاب و بے تکلف مردوں اورعورتوں کے مخلوط اجتماعات وغیرہ،بعض علماء(Vedeo/Movie) کے عدم جواز کے قائل ہیں،عوام جس عالم،فقیہ یا مفتی پر اعتماد کریں،اس کے فتوے پر عمل کریں۔